تاریخ: ڈاکو اور ٹھگ

ڈاکٹر مبارک علی

تخلیقات: ارم آرکیڈ 29- ٹیمپل روڈ لاہور فون 7238014

اہتمام	:	لیاقت علی
ناشر	:	تخلیقات لاہور
کمپوزنگ	:	المدد کمپوزرز' راج گڑھ' لاہور
سن اشاعت	:	اپریل 1994
قیمت	:	120 روپے
پرنٹرز	:	زاہد بشیر پرنٹرز' لاہور

انتساب

شکیل پٹھان کے نام

فہرست

پیش لفظ

میری خواہش تھی کہ ڈاکوؤں اور ٹھگوں پر ایک تفصیلی اور تحقیقی کتاب لکھی جائے' کیونکہ یہ ہماری تاریخ کا ایک اہم موضوع ہے' مگر تحقیق کے سلسلہ میں ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ مواد کا آجاتا ہے۔ مسودات اور نایاب دستاویزات کی بات تو الگ ہے' شائع شدہ مواد جو پچھلے چند سالوں یا دہائیوں میں چھپا ہے' وہ بھی نہیں ملتا ہے۔ سلطانہ ڈاکو کے سلسلہ میں جب مجھے جم کوربیٹ کی کتاب "میرا ہندوستان" درکار ہوئی تو یہ کتاب لاہور کی کسی لائبریری میں نہیں ملی۔ پنجاب پبلک لائبریری کے کیٹالاگ میں ہے' مگر نہ شیلف پر تھی اور نہ ہی کسی کو دی گئی تھی۔ یہی حال لاہور کے عجائب خانہ لائبریری کا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ یہ کتاب کراچی میں میرے دوست کرامت شیر خان نے بہم پہنچائی' وہ بھی اس کا اردو ترجمہ۔ اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

سندھ یونیورسٹی لائبریری سے اکثر کتابوں کی فوٹو کاپی جناب قاسم سومرو اور پروفیسر فرید الدین کی وساطت سے مجھے مل جاتی ہیں۔ سندھ کے ڈاکوؤں کے بارے میں "تحریر و تصویر" کا رسالہ شکیل پٹھان نے حاصل کر کے پہنچایا۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتابوں کی فراہمی کے سلسلہ میں' میں جناب منیر شیخ اور طاہر کامران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جو کوشش کر کے کتاب کو کہیں نہ کہیں سے حاصل کر لیتے ہیں۔

کوشش کی کہ پنجاب کے ڈاکوؤں کے بارے میں کچھ مل جائے' مگر ناکامی ہوئی۔ اگر مزید مواد ملا تو اسے اگلے ایڈیشن میں شامل کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مواد فراہم کرے تو میں ان کا مشکور ہوں گا۔

مبارک علی

لاہور' دسمبر ۱۹۹۳ء

تعارف

اردو میں چور، ٹھگ اور ڈاکو کے لفظوں کے ذریعہ چوری اور لوٹ مار کو تین طرح سے بیان کیا جاتا ہے۔ چور، عام طور سے چھوٹے جرائم کرتا ہے اور معمولی قسم کی چوریاں کرنا اس کا کام ہوتا ہے۔ یہ کام وہ آبادی میں رہتے ہوئے کرتا ہے مگر وہ قانونی گرفت سے بچنے کے لیے اپنی شخصیت کو چھپائے رکھتا ہے اور معاشرہ میں اس پر، جب تک وہ گرفتار نہیں ہو جائے، شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ چور ہے، سوائے اس رابطہ کے کہ جن کو وہ چوری کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ اس طرح سے چوری کے نتیجہ میں صرف چور ہی فائدہ نہیں اٹھاتا ہے بلکہ اس سے وہ تاجر بھی فائدہ اٹھاتے ہیں کہ جو چوری کی چیزوں کو سستے دام خریدتے ہیں۔

ایک زمانہ تک تو چور، پولیس اور انتظامیہ سے دور رہتا تھا اور اپنے بارے میں تمام معلومات کو خفیہ رکھتا تھا، مگر اب اکثر حالات میں پولیس اور چوروں میں باہمی معاہدہ ہوگیا ہے اور یوں وہ پولیس کی حفاظت کو چوری کے مال سے خریدتا ہے۔ چور کو صرف چوری کرنے اور قیمتی مال و اشیا کو لینے میں دلچسپی ہوتی ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ خطرے کی صورت میں صرف دھمکی سے کام لے اور کسی کو قتل نہ کرے، لیکن کبھی کبھی اضطراری حالت میں اس سے قتل بھی سرزد ہو جاتا ہے۔

چور، ٹھگ اور ڈاکو کے مقابلہ میں سماجی طور پر کم تر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے چور، اچکا اور اس قسم کے ذلت کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ چوری کبھی بھی قابل عزت نہیں مانی گئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی محنت کی کمائی کو

بغیر محنت کے اڑا لے جایا جائے اور اس پر عیش کیا جائے' اس لیے چوری چاہے مال کی ہو' یا کسی کی تخلیق کو اپنے نام سے منسوب کرنے کی ہو' یہ معاشرہ میں ہمیشہ برائی سے منسوب ہوتی ہے' یہاں تک کہ کسی کی بات کو چوری چھپے سننا' یا کسی کے خط یا تحریر کو چوری سے پڑھنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ٹھگ' دھوکہ' فریب اور ورغلانے والا ہوتا ہے' جو اپنی باتوں اور ہتھکنڈوں سے لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان سے پیسہ وصول کرتا ہے یا زبردستی چھینتا ہے۔ ہندوستان میں عہد برطانیہ میں ٹھگوں کے باقاعدہ گروہ ہوتے تھے جو مسافروں کو اپنی باتوں سے پھنسا کر' انہیں قتل کر کے ان کے مال پر قبضہ کر لیتے تھے' اس طرح یہ لوگ بھی اپنی شخصیت کو چھپائے رکھتے تھے' اور جب عام آبادیوں میں رہتے تھے تو کسی نہ کسی پیشہ کو اختیار کیے ہوتے تھے تاکہ لوگ ان پر شک و شبہ نہ کریں۔

ٹھگ اور چور' دونوں اپنے جرائم کی وجہ سے معاشرہ میں ذلت سے دیکھے جاتے تھے مگر ڈاکو کی شخصیت ان سے علیحدہ تھی۔ ڈاکو کی ذات ایک دلیر' بہادر اور نڈر کی حیثیت سے ابھر کر آتی ہے' اس لیے ڈاکہ ڈالنا بہادری کی علامت تھی کیونکہ ڈاکو کھلم کھلا قانون کی خلاف ورزی کرتا تھا' اپنی شخصیت کو چھپاتا نہیں تھا بلکہ اس کا پروپیگنڈا کرتا تھا' اس لیے اس کے گرد عزت' عظمت اور شان کا ایک ہالہ ہوتا تھا۔

ڈاکو چونکہ قانون اور قانونی اداروں سے لڑتا تھا' اس لیے عام لوگوں میں اس کی عزت کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت اور حکمران طبقے ہمیشہ سے عام لوگوں کا استحصال کرتے آئے ہیں اور ان کے استحصال کی بنیاد قوت و طاقت پر ہوتی تھی' اس لیے جب ڈاکو اس قوت و طاقت کو چیلنج کرتے ہوئے' قانون کی خلاف ورزی کرتا تھا تو اس سے غریبوں کو مسرت اور خوشی ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے جو طاقتوروں کو' کہ جن سے وہ خوف زدہ اور دہشت زدہ رہتے ہیں' آنکھیں دکھا رہا ہے اور بجائے ان سے ڈرنے کے' انہیں ڈرا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکو صرف امیروں کو لوٹتے تھے' اور اکثر اپنے لوٹ کے مال سے غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ غریبوں کی نظر میں ڈاکو کی بڑی عزت تھی اور ان کے جذبات اس لحاظ سے اس استحصالی نظام کے خلاف نفرت کا اظہار تھے کہ جس

کا وہ شکار تھے۔ انہیں اس سے خوشی ہوتی تھی کہ بڑے بڑے زمیندار ڈاکو سے خوف کھاتے ہیں' اس سے ڈرتے ہیں اور جب ڈاکہ کامیاب ہوتا تھا تو انہیں اس بات سے مسرت ہوتی تھی کہ طاقتور کو بے عزت ہونا پڑا اور اپنی دولت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اگر ڈاکو کسی زمیندار کو قتل کرتا تھا تو اسے بھی ایک لحاظ سے' خاموشی کے ساتھ' انصاف سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص جو قانونی طور پر سزایاب نہیں ہوا اور اپنے جرائم کو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے بڑھاتا رہا' ایک ایسے شخص کو خدا کی جانب سے سزا ملی اور ڈاکو نے اس سزا پر صرف عمل کیا۔

ایک ڈاکو کا وجود خود اس بات کی علامت تھا کہ معاشرے میں حق و انصاف نہیں' مظلوموں کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں' ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں' اس لیے جب کوئی فرد ان حالات سے مجبور ہو جاتا تھا اور اس نظام کی سختی اس پر عیاں ہو جاتی تھی تو اس وقت وہ اس سے بغاوت کر کے اپنا قانون خود بناتا تھا اور اس قانون پر خود ہی عمل درآمد بھی کرتا تھا۔ بہت سے ڈاکوؤں کی نجی زندگی کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ڈاکو بننے کے عمل میں معاشرے کی ناانصافیاں تھیں' جن میں معمولی باتوں سے لے کر بڑی باتیں تک شامل ہوتی تھیں۔ مثلاً اس پر قرضہ کا بوجھ بڑھ گیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ اور اس کے گھر والے کھانے تک کے محتاج ہو گئے' اس کی بیوی یا بیٹی کی عزت لوٹی گئی' اس کو سخت مار پڑی' انتہائی ذلیل و خوار کیا گیا' اس کے گھر یا تھوڑی سی زمین کو اس سے چھین لیا گیا یا گھر والوں میں سے کسی کو قتل کر دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کے واقعات اکثر گاؤں اور دیہاتوں میں پیش آتے تھے کہ جہاں زمیندار انتہائی طاقتور ہوتے تھے اور ان کے خلاف کسی قسم کی بات کرنا یا ان کی حکم عدولی کرنا زندگی سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ اس لیے ان حالات میں اگر کسی کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا تو اکثر اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر برداشت کر لیتے تھے' کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ نہ تو ان میں اتنی طاقت ہے اور نہ قوت کہ وہ زمیندار سے ٹکر لے سکیں اور نہ ہی ان کی اتنی پہنچ ہے کہ وہ اوپر والوں سے انصاف طلب کر سکیں اور یہ اس لیے بھی ناممکن تھا کہ گاؤں میں رہتے ہوئے ان کی حرکات و سکنات

پر زمیندار کی نگاہ ہوتی تھی اور اس کے زیر اثر علاقہ سے نہ تو وہ جا سکتا تھا اور نہ وہاں رہتے ہوئے وہ اس سے مقابلہ کر سکتا تھا۔

اس لیے صرف انفرادی طور پر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے نتیجہ میں بغاوت کرتا تھا اور اس کی یہ بغاوت کئی لحاظ سے انتہائی اہم ہوتی تھی کیونکہ یہ بغاوت صرف زمیندار یا ظالم کے خلاف ہی نہیں ہوتی تھی' بلکہ اس پورے نظام کے خلاف ہوتی تھی۔ اس نظام میں ریاست کے مقرر کردہ قوانین بھی ہوتے تھے تو معاشرہ کی اپنی روایات و اقدار بھی ہوتی تھیں اور جب ڈاکو اس دائرے سے نکلتا تھا تو وہ ریاست اور معاشرہ دونوں کا مجرم ہوتا تھا' اس لیے ڈاکو کے لیے اس کے بعد اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے' اس کے لیے واپسی کا راستہ صرف یہ تھا کہ اپنے جرائم کی سزا بھگتے' اور دوبارہ سے قوانین اور روایات کو تسلیم کرے۔ اکثر ڈاکو جب ایک مرتبہ ان سے بغاوت کر دیتے تھے تو ان کے لیے واپسی کے تمام راستے بند ہو جاتے تھے' اور صرف موت کے ذریعہ ہی وہ اپنی بغاوت کا خاتمہ کرتے تھے۔

اس لحاظ سے ڈاکو باغی تو ہوتا تھا مگر اس کے پاس ایسا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ معاشرے اور ریاست کی اقدار اور قوانین کو تبدیل کرے' نہ ہی اس کے ذہن میں اس قسم کا کوئی منصوبہ ہوتا تھا کہ وہ اقتدار پر قبضہ کرے اور اپنے گروہ کو طاقتور و مضبوط بنا کر مزاحمتی جنگ کرے۔ اس کی جنگ بھی اگر فوج یا پولیس سے ہوتی تھی تو وہ گوریلا جنگ ہوتی تھی۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ کوئی مقابلہ نہ ہو' وہ ان ریاستی اداروں سے دور ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

اس لیے ڈاکوؤں کی یہ بغاوت معاشرہ میں کوئی سیاسی یا سماجی شعور پیدا نہیں کرتی تھی' اور اکثر لوگ ڈاکوؤں کے نقطۂ نظر سے ناواقف رہتے تھے۔

ایک دوسری وجہ کہ جو ڈاکوؤں کو پیدا کرتی تھی' وہ ملک کی سیاسی صورت حال ہوتی تھی۔ جب بھی مرکزی سیاسی طاقت کمزور ہوتی اور اس کے بکھرنے کی وجہ سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تو اس صورت میں ایسی کوئی قانونی ایجنسی باقی نہیں رہتی تھی کہ جو ملک میں تسلط قائم کر سکے اور قانون کی بالادستی کو برقرار رکھ سکے۔ اس لیے

ایک بڑی سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ کے دوران جہاں آزاد اور خود مختار چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آتیں' وہاں چھوٹے زمیندار بھی مالیہ و لگان دینے سے انکار کر دیتے۔ اس صورت میں ہندوستان میں ایسے قبائل جو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے وہ قافلوں اور مسافروں کی لوٹ مار شروع کر دیتے تھے' کیونکہ اس سیاسی انتشار و ابتلا کے دور میں ایسی کوئی قوت باقی نہیں رہتی تھی جو ان کی سرکوبی کر سکے۔

یہ صورت حال آخری عہد مغلیہ میں پیش آئی کہ اس کے زوال کے ساتھ ہی جو سیاسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی' اس نے ڈاکوؤں اور ٹھگوں کے گروہوں کو پیدا کر دیا۔ اسی وجہ سے جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اقتدار پر قبضہ کیا تو اس کے لیے یہ ڈاکو اور ٹھگ سب سے بڑا چیلنج تھے۔ اگر وہ ان کے خلاف کامیاب اقدامات نہ کرتے تو ان کی حکومت کا وقار اور عزت قائم نہ ہوتی اور وہ پورے ملک میں قانون نافذ کرنے میں ناکام ہو جاتے۔ اسی لیے کمپنی نے پنڈاریوں' ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے خلاف موثر اقدام کر کے راستوں اور شاہراہوں کو محفوظ بنایا اور اس طرح انہوں نے عوام میں اپنا وقار قائم کیا۔

ہندوستان چونکہ بڑا وسیع و عریض ملک ہے' لہٰذا اس میں اس قسم کے ڈاکو بھی پیدا ہوتے تھے جو ڈاکہ زنی کو بطور پیشہ اختیار کرتے تھے۔ اس غرض سے وہ اپنے شہر سے دور کسی اور علاقہ میں جا کر وہاں لوٹ مار کرتے' دولت جمع کر کے واپس شہر آ جاتے اور لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ وہ یہ دولت کاروبار کے منافع میں جمع کر کے لا رہے ہیں۔ اس طرح ان کے بارے میں اس وقت تک لوگوں کو پتہ نہیں چلتا تھا جب تک کہ وہ گرفتار ہو کر سزایاب نہ ہو جاتے۔

برصغیر ہندوستان میں اکثر ڈاکو چونکہ غربت اور سماجی ناانصافیوں کی وجہ سے اس پیشہ میں آئے' اس لیے ان میں لوٹ مار کرتے وقت یہ مذہبی جذبات نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنے ہم مذہب کو لوٹ رہے ہیں یا غیر مذاہب والوں کو۔ سماجی ناانصافیوں کی وجہ سے ان میں یہ شعور پیدا ہو جاتا تھا کہ دولت مند و ظالم ایک طرف ہیں اور غریب و مظلوم دوسری طرف' اس لیے ان میں کسی قسم کا مذہبی تعصب اور تشدد نہیں ہوتا تھا۔ ان کے گروہ میں ہندو و مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے اور ان کے سماجی مفادات

مذہبی اختلافات کو ختم کر دیتے تھے۔

ڈاکوؤں کے لیے پیسہ کی اہمیت بھی گھٹ جاتی تھی کیونکہ وہ جس قسم کی زندگی گزارتے تھے' اس میں پیسہ کا استعمال اور اس کی افادیت کچھ نہیں تھی کیونکہ وہ نہ تو اس پیسہ سے جائیداد خرید سکتے تھے' نہ اسے محفوظ جگہ پر جمع کر سکتے تھے' نہ اسے کاروبار میں لگا سکتے تھے اور نہ اس کو آرام و آسائش کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوٹ کے پیسہ کو بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ غریبوں کو دینا' مخبروں کو خریدنا' پولیس کو بطور رشوت اپنے حق میں کرنا' کھانے پینے کی چیزوں کے مارکیٹ سے زیادہ دام دینا اور وقتاً" فوقتاً" طوائفوں پر دل کھول کر خرچ کرنا۔ چونکہ یہ روپیہ کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے' اس لیے اس سے جلد چھٹکارا پانا ضروری سمجھتے تھے۔

اکثر وہ مقامی زمینداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انہیں بھی لوٹ کے مال میں حصہ دار بنا لیتے تھے' کیونکہ پولیس کے مقابلہ میں انہیں حفاظتی جگہوں کی ضرورت ہر وقت رہتی تھی۔ مقامی زمیندار اس لیے بھی ان کی حمایت کرتے تھے کہ انہیں ان سے ڈر بھی رہتا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ پولیس ہمیشہ ان کی حفاظت کے لیے موجود نہیں رہ سکتی۔

ڈاکو کو ہمیشہ پولیس کی جانب سے خطرہ رہتا تھا اور ساتھ ساتھ اسے یہ بھی خطرہ ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی یا مخبر لالچ یا دھمکی میں آ کر اس کے بارے میں پولیس کو خبر نہ کر دیں۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا تھا اور کسی پر بھروسہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہوا یہی ہے کہ اکثر ڈاکوؤں کو مخبروں کے ذریعہ ہی گرفتار کیا گیا۔

ڈاکو کی شخصیت کو بنانے میں اس ماحول کا بھی بڑا تعلق تھا کہ جس میں وہ ڈاکو بننے کے بعد رہتا تھا۔ گھنے جنگلوں میں کہ جہاں جنگلی جانوروں سے اسے مسلسل خطرہ ہوتا تھا۔ گرمی و سردی اور بارش کے موسم میں کہ جہاں اسے پناہ لینے کی کوئی جگہ نہیں ملتی تھی اور بعض اوقات کھانے پینے کی چیزوں کا فقدان کہ جس کی وجہ سے بھوکا رہ کر کئی دن گزارنے پڑتے تھے۔ ان حالات میں گروہ کے لوگ جو اپنے خاندانوں

سے دور غیر یقینی و غیر تحفظ کی حالت میں ہوں' نفسیاتی طور پر اعصابی تناؤ کا شکار رہتے تھے اور آپس میں معمولی معمولی بات پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کو قتل کرنے کی نوبت بھی آ جاتی تھی۔ بعض حالات میں گروہ کی سرداری پر بھی جھگڑے ہوتے تھے' اس لیے ایک ڈاکو کے لیے زندگی غیر یقینی چیز تھی کہ وہ کبھی پولیس کے ہاتھوں مارا جا سکتا تھا یا ساتھیوں کے جھگڑے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر ڈاکو اس زندگی کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے تھے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ڈاکو گرفتار ہوا' اور اسے اذیتیں دی گئیں یا پھانسی کی سزا دی گئی تو یہ اس نے بہادری سے قبول کر لیں اور بہت کم ڈر یا خوف کا اظہار کیا۔

اس لیے چور اور ٹھگ کے مقابلہ میں ڈاکو کی شخصیت بہادر اور دلیر شخص کی ابھر کر آتی ہے۔ ڈاکوؤں اور ٹھگوں میں جو ایک بڑا فرق تھا' وہ یہ تھا کہ ٹھگ جب واردات کرتا تھا تو وہ کوشش کرتا تھا کہ اس کے تمام نشانات مٹا دے' اس لیے وہ مارنے کے بعد لوگوں کی لاشوں کو دفن کر کے قبروں کے نشانات مٹا دیتے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کے بارے میں لوگوں کو پتہ نہ چلے اور ان کا وجود خفیہ رہے' اس لیے انہوں نے اپنی خفیہ زبان ایجاد کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایک طویل عرصہ تک ان کے بارے میں کسی کو پوری معلومات نہ ہوئیں۔

ان کے مقابلے میں ڈاکو اپنے جرائم کو چھپاتے نہیں تھے۔ وہ قتل کر کے لاشوں کو اسی طرح چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ ان کے ہاں خون بہانا جرم نہیں تھا' اس کا اظہار وہ صاف صاف کرتے تھے۔ اکثر ڈاکو اور ان کے گروہ اپنے نشانات بھی چھوڑ جاتے تھے تاکہ پولیس کو ان کی دلیری کے بارے میں معلوم ہو جائے۔

اکثر حالات میں پولیس یا حکومت اپنے تمام ذرائع کو استعمال کر کے بھی ڈاکوؤں کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی' اس لیے ان حالات میں اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان سے معاہدہ کر کے ہتھیار ڈلوا لیں کیونکہ ڈاکو کی موجودگی حکومت کی طاقت کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج ہوا کرتی تھی اور اگر وہ اسے

ختم کرنے میں ناکام ہو جاتی تو اس سے لوگوں میں اس کی عزت اور گھٹ جاتی تھی۔ ایسے حالات میں وہ ان سے معاہدہ کر کے ہتھیار ڈلوا لیتے تھے تاکہ اپنی کھوئی ہوئی عزت کو بحال کر سکیں۔

حکومت برطانیہ نے کچھ قبائل کے لیے مجرم قبائل (کرمنل ٹرائبس) کی اصطلاح شروع کی۔ ان کی اس تعریف کے تحت وہ قبائل آتے تھے کہ جنھوں نے ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ ان قبائل کے لیے ڈاکہ زنی کو بطور پیشہ اختیار کرنا بھی سماجی و معاشی حالات کی وجہ سے تھا کیونکہ ان میں وہ قبیلے تھے' جو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے اور جن کی گزر اوقات جنگلی پھلوں یا شکار پر ہوا کرتی تھی' مگر جب پھلوں کی کمی ہوتی' شکار نہ ملتا اور ان کے لیے غذا کا حصول مشکل ہو جاتا تو اس صورت میں یہ ہمسایہ گاؤں اور ان کے کھیتوں پر حملہ کر کے وہاں سے سامان لوٹ لاتے تھے۔ اسی قسم کے ایک قبیلہ میواتیوں کے بارے میں عہد سلاطین کے مورخ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ

"حوالی دہلی میں میواتی بہت قوت پکڑ گئے اور ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ یہ لوگ رات میں شہر میں گھس آتے تھے اور گھروں کو کھود ڈالتے تھے اور لوگوں کو تنگ کرتے تھے۔ ان کی اس مزاحمت نے لوگوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ ان میواتیوں کی وجہ سے شہر کی سرائیں لوٹ لی جاتی تھیں...... چاروں طرف کے راستے بند ہو گئے تھے اور قافلوں میں سوداگروں کی آمد و رفت ممکن نہ تھی۔ حوالی شہر میں میواتیوں کے غلبے کے باعث قبیلے کی جانب شہر کے دروازے عصر کی نماز کے بعد بند کر دیے جاتے تھے...... اکثر میواتی نماز عصر کے وقت سلطان کے حوض پر آ جاتے اور سقوں اور پانی بھرنے والی کنیزوں کو پریشان کرتے۔ ان کو برہنہ کر دیتے اور ان کے کپڑے لے جاتے"۔

بلبن نے ان کے خلاف جو اقدامات اٹھائے' اس کے بارے میں برنی لکھتا ہے کہ

"بلبن نے میواتیوں کو ختم کرنے کو دوسری سب مہموں پر مقدم رکھا'

چنانچہ ایک سال تک میواتیوں کے استیصال اور جنگلوں کو کٹوانے میں
مصروف رہا...... گوپال گیر میں اس نے ایک قلعہ تعمیر کرایا اور شہر کے
چاروں طرف متعدد مقامات پر تھانے قائم کیے اور افغانوں کے سپرد کر
دیے۔ تھانوں کی زمینیں علیحدہ کر دی گئیں"۔

عہد سلاطین و عہد مغلیہ میں ڈاکوؤں کی موجودگی اس بات کا اظہار تھی کہ وہ علاقے کہ جہاں معاش کے ذرائع میسر نہیں ہیں' وہاں پر ڈاکہ زنی کو بطور پیشہ افراد اور قبائلی گروہوں نے اختیار کر لیا تھا۔ حکومت اس کے خاتمہ کے لیے سیاسی اقدامات اٹھاتی رہی اور انہیں طاقت کے ذریعہ کچلتی رہی۔

ڈاکہ زنی کی وارداتوں اور سیاسی صورت حال کا ایک دوسرے سے بڑا قریبی تعلق ہے' اس لیے جب بھی سیاسی طاقت کمزور ہوتی' اس کے نتیجہ میں قانون کی گرفت ڈھیلی پڑتی تو اس سے فائدہ اٹھا کر ڈاکو اور ان کے گروہ لوٹ مار میں مصروف ہو جاتے تھے۔ یہ صورت حال ہندوستان میں آخری عہد مغلیہ میں پیدا ہوئی کہ جب بادشاہ کے کمزور ہونے کے ساتھ حکومتی ادارے بھی کمزور ہوئے اور اس نے ڈاکوؤں کو پیدا کرنے میں حصہ لیا۔ چنانچہ جب انگریز برسراقتدار آئے تو اس وقت ڈاکوؤں' ٹھگوں اور پنڈاریوں نے چاروں طرف لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ برطانوی حکمرانوں کو پورا پورا احساس تھا کہ جب تک ملک میں امن و امان نہیں ہوگا' اس وقت تک ان کے اقتدار کو عوام میں مقبولیت نہیں ملے گی' اس لیے انہوں نے پہلے ٹھگوں اور پنڈاریوں کے خلاف مہمات شروع کیں اور اس کے ساتھ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے منصوبے بنائے۔ اس مقصد کے لیے سلیمن کے ذمے ڈاکوؤں کے خاتمہ کی مہم سونپی گئی کیونکہ وہ کامیابی کے ساتھ ٹھگوں کا خاتمہ کر چکا تھا۔ سلیمن نے ڈاکوؤں کے بارے میں مہم کے شروع کرنے سے پہلے معلومات اکٹھی کیں اور لکھا کہ

"یہ اکثر مضبوط اور طاقتور حفاظتی دستوں سے مال و دولت چھینتے ہیں۔
یہ شہروں میں داخل ہوتے ہیں' گھروں کی اونچی دیواروں پر چڑھتے ہیں اور
ان میں ہر شخص مضبوط اعصاب والا' طاقتور' بہادر اور بہترین تربیت یافتہ
ہوتا ہے' تاکہ انہیں جو بھی ذمہ داری سونپی جائے' یہ اسے ایک اچھے

سپاہی کی طرح' پوری طرح بجالائیں اور ایک دوسرے کی مصیبت کے وقت بھرپور مدد کریں۔ کیونکہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر مہم کے دوران کوئی ایک بھی پیچھے رہ جائے اور گرفتار ہو جائے تو پھر وہ اذیت کے خوف سے راز فاش کر سکتا ہے اور ان سب کی گرفتاری کا باعث بن سکتا ہے' اس لیے وہ اپنے ساتھ انہیں افراد کو رکھتے تھے کہ جو تربیت یافتہ ہوں اور سفر میں ان کا ساتھ دے سکیں"۔

سلیمن نے ڈاکوؤں کے خاتمے کے سلسلے میں بھی ٹھگی کے تجربہ کو استعمال کیا۔ سب سے پہلے اس نے ان علاقوں کا تعین کیا جہاں ڈاکہ زنی کی وارداتیں ہوتی تھیں' اس کے بعد اس نے مخبروں کے ذریعہ ان کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور پھر فوجی اقدامات کیے' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۴۲ء کے آخر تک ۱۱۷ ڈاکو گرفتار ہوئے' جن میں سے ۱۲ خطرناک ڈاکوؤں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

ڈاکہ زنی کو ختم کرنے کے لیے جہاں سزائیں دی گئیں' وہاں حکومت نے انہیں پرامن زندگی گزارنے اور شہری بنانے کے لیے یہ اقدامات بھی کیے کہ انہیں کاشت کے لیے زمینیں دی گئیں۔ مثلاً ۱۸۴۱ء میں ۳۵ ڈاکوؤں پر مشتمل ایک زرعی کالونی کی بنیاد ڈالی گئی' جہاں ڈاکوؤں کو' جو اب کاشتکار بن گئے تھے' زمین اور مناسب امداد دی گئی۔ ان میں کچھ کاشت کاری میں رہے اور کچھ نے دوسرے پیشے اختیار کر لیے۔ اس طرح سختی اور رعایتوں کے ساتھ حکومت برطانیہ نے ایک حد تک ڈاکہ زنی کو ختم کر دیا مگر مکمل طور سے اس کا خاتمہ پھر بھی نہیں ہوا کیونکہ اس کی سماجی اور معاشی وجوہات معاشرہ میں باقی تھیں۔

اس وقت پاکستان میں اور خاص طور سے سندھ میں ڈاکوؤں کا جو مسئلہ ہے' اسے بھی اس تاریخی تجربے کی روشنی میں حل کرنے کی ضرورت ہے' یعنی ایک طرف جہاں طاقت اور سزا کا استعمال ہو' وہاں دوسری طرف انہیں باعزت و پرامن شہری بننے کے مواقع بھی دیے جائیں۔ مگر جیسا کہ آگے چل کر سندھ کے ڈاکوؤں میں ذکر آئے گا' ان کی پشت پناہی کرنے والے زمینداروں اور حکومتی اداروں کے افسروں کو سزا دینا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ڈاکہ زنی کا خاتمہ نہیں ہو سکے گا۔

حصہ اول

ٹھگ

(۱)

ٹھگ اور ان کی تاریخ

ٹھگی کے پیشہ کو ابتداء ہی سے اس قدر خفیہ رکھا گیا کہ اس کے بارے میں کسی کو ٹھوس معلومات نہیں تھیں کہ اس کی ابتدا کب ہوئی' کس طرح سے ٹھگوں کی برادری منظم ہوئی اور کیونکر وقت کے ساتھ ان میں مختلف رسومات' آداب' یہاں تک کہ ایک علیحدہ زبان پیدا ہوئی؟ اور پھر یہ بھی کہ انگریزوں کی آمد تک انہوں نے اپنی خفیہ برادریوں کو برقرار رکھا۔ ان کے اس استحکام میں سب سے بڑا عنصر ان کی پراسراریت اور ان کے وجود کے ساتھ مذہبی لگاؤ تھا' اور معاشرہ میں اس گروہ کے بارے میں مبہم سے خیالات یہ تھے کہ یہ کالی دیوی یا بھوانی دیوی کے ماننے والے لوگ ہیں اور اگر ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی یا ان کے رازوں سے پردہ اٹھایا گیا تو دیوی اس کی سزا دے گی' اس طرح سے ٹھگوں کے گروہ بھی خود کو دیوی کے سایہ میں محفوظ سمجھتے تھے اور اپنے پیشہ کو قدرتی طور پر برا نہیں گردانتے تھے بلکہ اسے دیوی کے احکامات کی تعمیل قرار دیتے تھے۔ انسانوں کا قتل ان کے لیے قتل نہیں تھا' بلکہ ایک مذہبی اور پیشہ ورانہ فرض تھا جو وہ ادا کرنے پر مجبور تھے۔ اس عقیدے کی وجہ سے ایک ٹھگ کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ ایک طرف معاشرہ میں عام لوگوں کی طرح زندگی گزارے' اور جب وہ ٹھگی میں مصروف ہو تو معاشرے کی اخلاقی قدروں اور انسانی جذبات کو بالکل علیحدہ کر کے رکھ دے۔ اس کے ذہن کو اس طرف مائل کرنے میں وہ تمام عقائد اور توہمات شامل تھے کہ جن کو یہ مانتے تھے اور جس کی سچائی پر ان کا ایمان تھا' مثلاً ٹھگی کی ابتداء کے بارے میں یہ کہانی مشہور تھی

"بہت پرانے زمانہ کی بات ہے کہ اس دنیا میں ایک عفریت کا قبضہ ہوگیا تھا اور وہ ان تمام انسانوں کو، جو پیدا ہوتے تھے، ہڑپ کر جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں دنیا سے آبادی ختم ہونا شروع ہوگئی۔ آخرکار کالی دیوی انسانوں کے بچاؤ کے لیے آگے آئی۔ اس نے عفریت پر حملہ کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، لیکن ہوا یہ کہ اس کے خون کے ہر قطرے سے ایک عفریت پیدا ہوگیا، اگرچہ دیوی انہیں قتل کرتی رہی، مگر ان کے خون کے قطروں سے برابر عفریتوں کی تعداد بڑھتی رہی، یہاں تک کہ ان کی تعداد خوفناک حد تک بڑھ گئی۔ دیوی نے تھک ہار کر، اور مایوس ہو کر یہ سوچا کہ انہیں قتل کرنے کا دوسرا طریقہ ڈھونڈنا چاہیے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی ذاتی کوششوں کو ترک کر دیا اور اپنی بغلوں کے پسینہ سے دو آدمیوں کو پیدا کیا اور ان دونوں کو اس نے رومال دیے تاکہ وہ ان عفریتوں کو رومال سے گلا گھونٹ کر ماریں تاکہ ان کا خون نہ بہے۔ اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور عفریتوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اس کام کو ختم کر کے ان دونوں نے اپنے رومال دیوی کو واپس کرنا چاہے، لیکن دیوی نے واپس لینے سے انکار کر دیا اور ان سے کہا کہ ان رومالوں کو وہ اپنے شاندار کارنامے کی یاد میں اپنے پاس رکھیں، بلکہ ان کو استعمال کر کے منافع بخش ٹھگی کے پیشے کو اختیار کریں کہ جس کے ذریعہ ان کی آنے والی نسلیں پھلیں پھولیں۔ اس طرح سے دیوی نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ انسانوں کو بھی اس طرح سے ماریں کہ جیسے انہوں نے عفریتوں کو قتل کیا ہے"۔

(میڈوز ٹیلر: ایک ٹھگ کے اعترافات۔ لندن ۱۸۳۹ء، دوسرا ایڈیشن

دہلی ۱۹۸۵ء، (تعارف) ص III - IV)

چنانچہ اس قسم کے عقیدوں کے ذریعے ٹھگی کے پیشہ کو ایک قسم کا تقدس حاصل ہوگیا اور انسان کو مارنے اور اس کا مال و اسباب لوٹنے کی وجہ سے جو گناہ کا تصور تھا، وہ مٹ گیا اور انہیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ بلا خوف و خطر اپنے کاروبار کو

جاری رکھیں اور اسے نہ تو غیر اخلاقی سمجھیں اور نہ غیر قانونی۔ یہی بات ٹھگوں کے اعترافات میں ملے گی کہ انہیں اپنے جرائم پر کسی قسم کی پشیمانی نہیں تھی' بلکہ وہ اسے جرم ہی نہیں گردانتے تھے اور اپنے پیشے کو دوسرے پیشوں کی طرح سمجھتے تھے۔

سلیمن' جو ٹھگی کے خاتمہ کا ذمہ دار ہے' اس نے نہ صرف ٹھگوں کے اعترافات سنے' بلکہ کوشش کی کہ اس کی ابتداء کے بارے میں تاریخی حقائق دریافت کرے' اس کے نظریہ کے مطابق:

"اگرچہ ٹھگوں کی ابتداء کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی' لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء ساگارتی سے ہوئی کہ جس نے ایکزرکس کی فوج کو ۸ ہزار گھڑسوار مہیا کیے تھے۔ اس واقعہ کو ہیروڈوٹس' یونانی مورخ نے اپنی تاریخ کے ساتویں حصہ میں بیان کیا ہے۔

یہ لوگ بھیڑ بکریاں چراتے تھے اور "نسلاً" ان کا تعلق ایرانیوں سے تھا اور انہیں کی زبان یہ بولتے تھے۔ ان کا لباس ایرانیوں اور پکتین لوگوں جیسا تھا اور ان کے پاس لوہے یا تانبے کے بنے ہوئے کوئی ہتھیار نہیں ہوتے تھے' سوائے خنجروں کے۔ وہ واحد ہتھیار جس کو یہ استعمال کرتے تھے' ایک چمڑے کی بنی ڈور ہوتی تھی۔ جب وہ دشمن سے مقابلہ کرتے تھے تو وہ اس ڈور کو' جس کے کونے پر ایک پھندا ہوتا تھا' پھینکتے تھے' اور اس کے ذریعہ اگر وہ گھوڑے یا اس کے سوار کو پھانس لیتے تھے تو پھر بغیر کسی مشکل کے اسے آسانی سے مار ڈالتے تھے۔

اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ ساگارتی کے ان گھڑسواروں کی نسلیں آگے چل کر مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ ہندوستان آئیں اور یہاں پر دہلی کے گرد و نواح میں آباد ہو گئیں"۔

(مالا سین: ہندوستان کی ڈاکو ملکہ (پھولن دیوی) دہلی ۱۹۹۱ء' ص ۱۰۱)

سلیمن کی اس بات کو تسلیم کرنے میں ہمارے پاس کوئی تاریخی شواہد نہیں' صرف قیاسات ہیں کیونکہ جب ٹھگوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اس وقت تک یہ بالکل ہندوستانی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں اور ان کے رسم و رواج اور

عقائد ہندوستانی ہیں اور جیسا کہ سلیمن نے بھی اشارہ کیا ہے' ٹھگوں کے بارے میں پہلا اشارہ عہد سلاطین کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے دیا ہے۔ وہ تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ جلال الدین فیروز شاہ کے زمانہ میں

"کچھ ٹھگ شہر میں گرفتار کیے گئے۔ ان ایک ہزار سے زائد ٹھگوں ہی میں سے ایک شخص نے ان کو گرفتار کرایا تھا۔ سلطان جلال الدین نے ان میں سے ایک کو بھی قتل نہیں کیا اور سب کو حکم دیا کہ کشتیوں میں سوار کر کے ان کو بنگال کی طرف لکھنوتی کے علاقے میں لے جا کر چھوڑ دیں تاکہ یہ ٹھگ مجبوراً لکھنوتی کے علاقے ہی میں پڑے رہیں اور پھر اس طرف نہ آسکیں"۔

(ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور' ۱۹۶۹ء' ص ۲۹۴-۲۹۵)

کہا یہ جاتا ہے کہ سلطان نے انہیں اس لیے سزا نہیں دی کہ ان کے بارے میں جو باتیں مشہور تھیں' ان میں اس قدر پراسراریت تھی کہ سلطان انہیں قتل کرتے ہوئے گھبرایا اور یہ مناسب سمجھا کہ انہیں دور دراز کے علاقہ میں جلاوطن کر دیا جائے تاکہ وہ ان کی سرگرمیوں سے محفوظ رہے۔ اس وقت بنگال میں کسی کو جلاوطن کرنے کی سزا ایسی ہی تھی جو بعد میں عہد برطانیہ میں انڈیمان جزائر کی ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ٹھگوں کی یہ نسلیں خوب پھلی پھولیں اور بعد میں نہ صرف بنگال میں ان کے گروہ پیدا ہوئے بلکہ شمالی ہندوستان اور جنوب میں بھی ان کی برادریاں وجود میں آ گئیں۔

بہرحال اس بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے بھوانی دیوی کو کس مرحلہ پر اپنایا' اور پھر کس طرح آہستہ آہستہ مختلف رسومات کی ابتداء ہوئی' لیکن عہد برطانیہ میں جب ان کے بارے میں تحقیقات ہوئی ہیں تو اس وقت تک ان کے گروہ منظم مذہبی جماعتوں اور برادریوں کی شکل میں تھے۔ ان کی اپنی علیحدہ زبان تھی کہ جس کے ذریعہ وہ دوسروں کی موجودگی میں بات چیت کرتے تھے اور ان کے اپنے اشارے اور علامات تھیں کہ جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے واقف ہو جاتے تھے۔

ٹھگوں کے ہاں بھی رسومات کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ رسومات نفسیاتی طور پر افراد کو ایک دوسرے سے ملانے' ان میں تعلق اور لگاؤ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں' اسی لیے ہر مرحلہ پر ان کے ہاں کوئی نہ کوئی رسم ہے کیونکہ اس کی وجہ سے فرد کی گروہ اور جماعت سے وابستگی مضبوط ہوتی تھی اور اس سے علیحدگی ان میں خوف اور ڈر پیدا کرتی تھی۔ یہ انہی رسومات کا اثر تھا کہ ٹھگوں نے ایک طویل عرصہ تک اپنی پراسراریت اور راز کو باقی رکھا اور اپنی جماعتوں میں اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھا۔ اس بات پر حیرانی ضرور ہوتی ہے کہ عہد برطانیہ میں جب ان میں مخبری شروع ہوئی تو پھر یہ اس کو روک نہیں سکے اور سلطانی گواہ بن کر ٹھگوں کے مشہور و معروف سرداروں نے نہ صرف اپنے رازوں کو فاش کیا' بلکہ اپنے ساتھیوں کو پکڑوانے میں حکومت کی مدد کی اور اسی مخبری کی وجہ سے حکومت کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ ان کے پھیلے ہوئے' اور پراسرار گروہوں کو ایک ایک کرکے ختم کردیں۔

ٹھگوں کے گروہوں کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ان میں ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں تھا۔ اس برادری میں جو بھی شامل ہو جاتا تھا' اس کے بعد اس کی مذہبی شناخت ختم ہو جاتی تھی اور ٹھگی کے آداب ان کو آپس میں مدد دیتے تھے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرانسس ٹکرنے اپنی کتاب "پیلے رومال" میں لکھا ہے کہ:

> "ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں صدیوں سے دشمنی چلی آ رہی ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی فتوحات اور ان کے ہندوؤں پر مظالم ہیں' لیکن ٹھگوں کی اس پوری کہانی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں برادری کے تمام لوگ' چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو' وہ اپنی تمام نفرتوں کو مٹا دیتے ہیں اور مسلمان ہندو دیویوں کو اپنا سرپرست تسلیم کرتے ہوئے ان تمام رسومات کو اختیار کر لیتے ہیں' جو ان کے لیے کی جاتی ہیں۔ اسی طرح برادری میں تمام ہندو ممنوعات کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ ان دونوں عقیدوں کو ماننے والے اس قابل نفرت تجارت میں ایک ہو جاتے ہیں"۔

(مالا سین: ص ۱۰۲)

ٹھگوں کے گروہوں کو اس وجہ سے بھی ختم نہیں کیا گیا کہ بڑے بڑے زمیندار اور ریاستوں کے حکمران ان کی حفاظت کرتے تھے اور ان کی لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ مقرر کرتے تھے۔ بعد میں اس کے بھی شواہد ملے کہ برطانوی علاقوں کی پولیس بھی ان کے ساتھ شامل ہوتی تھی اور اکثر مقدمات میں مجسٹریٹ رشوت لے کر انہیں چھوڑ دیتے تھے۔ چونکہ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ اپنے خلاف کوئی شہادت نہیں چھوڑتے تھے اور مارنے کے بعد لاشوں کو دفن کر کے تمام نشانات کو مٹا دیتے تھے' اس لیے قتل کی کوئی شہادت باقی نہیں رہتی تھی۔ رہا لوٹ کا مال تو اس کی فروخت یہ جاننے والے ساہوکاروں اور بنیوں کے ہاتھوں کرتے تھے۔

اس لیے ابتداء میں کچھ ٹھگوں پر قتل کے الزام میں مقدمے چلے تو وہ ان سے بری کر دیے گئے کیونکہ ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھے' مگر ابتدائی انیسویں صدی میں یہ مسئلہ حکومت برطانیہ کے لیے اہمیت اختیار کر گیا کیونکہ اس قسم کی رپورٹیں ملیں کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مسافر غائب ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ یہ مسافر کہاں چلے جاتے ہیں؟ ان کی لاشوں کا کیا ہوتا ہے؟ اور ان کا سامان کدھر جاتا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔

ان غائب ہونے والے مسافروں میں تاجروں کے ساتھ ساتھ وہ برطانوی سپاہی بھی تھے' جو فوج سے چھٹی کے بعد اپنے گھروں کو جاتے تھے' مگر راستہ ہی میں غائب ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال پر میڈوز ٹیلر نے لکھا ہے کہ:

> "وہ چند لوگ جو اس دور میں (۱۸۳۱ء - ۱۸۳۲ء) ہندوستان میں تھے' ٹھگوں کی دریافت سے کہ جو ہندوستان کے ہر حصے میں تھے' حیرت میں پڑ گئے تھے۔ اس دریافت نے ضلعی مجسٹریٹوں کو ایک طرح سے پریشانی میں ڈال دیا' کیونکہ کوئی اس پر یقین نہیں کر سکتا کہ یہ تباہ کن طریقہ جرم ان کے علم کے بغیر جاری رہ سکتا ہے"۔

(میڈوز ٹیلر: V - IV)

اندازہ لگایا گیا کہ ۱۸۳۰ء کی دہائی میں تقریباً ایک ہزار ٹھگ قتل و غارت گری میں مصروف تھے اور یہ سال میں بیس سے تیس ہزار مسافروں کو قتل کرتے تھے۔ اس

صورت حال نے برطانوی حکومت کی توجہ اس مسئلہ کی طرف کی' کیونکہ اس کی وجہ سے راستے محفوظ نہیں رہے تھے' تجارت کو نقصان ہو رہا تھا' لوگوں میں حکومت کی طرف سے بد اعتمادی پیدا ہو رہی تھی' اس لیے برطانوی حکومت کے لیے اپنی ساکھ کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ مسافروں کی جان و مال کی حفاظت اور تجارت کے فروغ کے لیے راستوں کو محفوظ بنائے۔

اس مقصد کے لیے گورنر جنرل بنٹینک نے ولیم سلیمن کو ٹھگی کے خاتمے کے لیے مقرر کیا۔ اگرچہ سلیمن کے پاس مختصر سی فوج اور انتظامیہ کے افسر تھے' لیکن اس نے جس منظم طریقے سے کام کیا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۷ء کے عرصے میں تیس ہزار ٹھگوں پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا ملی۔ ان میں سے اکثر کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور کچھ کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔

سلیمن نے ٹھگوں کی گرفتاری کے بعد ان ہی میں سے سلطانی گواہ بنائے اور ان کے ذریعے نہ صرف ٹھگوں کے مختلف گروہوں کو گرفتار کیا' بلکہ اس نے ان کی رسومات' عقائد اور زبان کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کیں۔ ان ہی کی مدد سے اس نے جنگلوں میں ان جھنڈوں کو دریافت کیا کہ جہاں وہ لوگوں کو مار کر دفن کر دیتے تھے' اس طرح سے ان کے خلاف شہادتیں مہیا کر کے ان کو سزائیں دلوائیں۔ سلیمن نے اپنی پوری کارروائی کا مکمل ریکارڈ رکھا' جو ٹھگوں کے بارے میں قیمتی معلومات مہیا کرتا ہے۔

سلیمن کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ٹھگی کا ہندوستان سے مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا اور اس کا وجود تاریخ میں رہ گیا۔

ٹھگی کے خاتمے سے تاریخ سے جو سبق ملتا ہے' وہ یہ کہ اگر انتظامیہ ایماندار' محنتی اور کام کرنے والی ہو تو اس صورت میں جرائم کو ختم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ سلیمن نے اس مہم کو شروع کرنے سے پہلے پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور اس کا بھی اندازہ لگا لیا کہ بڑے زمینداروں اور ریاست کے حکمرانوں کی مدد کے بغیر ٹھگ جرائم کا ارتکاب نہیں کر سکتے' اس لیے ٹھگوں کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سرپرستوں کو ختم کیا جائے۔ ٹھگوں کی تنظیم کو توڑنے کے لیے اس نے ان میں سے

مجبوں کو پیدا کیا' خصوصیت سے ان کے لیڈروں کو اس پر تیار کیا کہ دوسرے گروہوں کو ختم کرنے میں اس کی مدد کریں۔ اس کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ راستے محفوظ ہوگئے' مسافر اور تاجر بلا خوف و خطر سفر کرنے لگے' جس کی وجہ سے برطانوی حکومت کی ساکھ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔

(۲)

ایک ٹھگ سے ملاقات

لطف اللہ نے جہاں ڈاکوؤں کے ساتھ اپنے تجربات بیان کیے ہیں، اس کے ساتھ ہی اس نے ٹھگوں کے بارے میں بھی کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں راستے انتہائی غیر محفوظ تھے، اس لیے مسافروں کو ان سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ٹھگ کس طرح سے مسافروں کو پھانسنے کی کوشش کرتے تھے۔ جمعہ ٹھگ سے لطف اللہ کی ملاقات ایک سفر کے دوران ہوئی ہے، جس کی تفصیل اس نے کچھ یوں دی ہے۔ (لطف اللہ کا تعارف ڈاکوؤں والے حصہ میں دیکھا جا سکتا ہے)

✤

اسی دوران میں، ایک صحت مند مسلمان، جس کی عمر تقریباً ۴۰ سال ہوگی، میری طرف آیا۔ وہ شکل و صورت سے میری طرح مسافر معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس نے بڑے مہذب طریقے سے مجھے سلام کیا اور پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں؟ اور کہاں جانے کا قصد ہے؟ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے بتایا کہ میں ایک مسافر ہوں، اور کام کی غرض سے گوہد جا رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ کہنے لگا کہ وہ بھی اسی طرف جا رہا ہے، لیکن اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ شاید ہم سورج غروب ہوتے ہوتے وہاں پہنچیں، کیونکہ یہ تقریباً چار میل کا فاصلہ ہے۔

مجھے اس آدمی کی شکل و صورت کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی۔ اس کی خالی خالی احمقانہ سی نظریں اور بلاوجہ دخل دینے کے انداز نے اسے ناپسندیدہ شخص بنا دیا' لیکن اس شخص نے سفر کے دوران جلد ہی مجھ سے دوستی کر لی' اور اپنی باتوں کے ذریعے میرے شک و شبہات ختم کر دیے۔ ہم دو میل کے قریب چلے ہوں گے کہ سورج سر پر آ پہنچا۔ اس وقت تک ہم ایک دریا کے قریب جا پہنچے تھے کہ جس کے کنارے پر ایک مسجد کھڑی تھی' مگر ویرانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں بہت زیادہ تھک چکا ہوں اور اس قابل نہیں ہوں کہ زیادہ چل سکوں' اس لیے میرا ارادہ ہے کہ میں رات اسی مسجد میں گزاروں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو وہ سفر جاری رکھے اور اگلے دن انشاء اللہ میں اس سے گوہد میں ملاقات کر لوں گا۔

اس پر اس نے کہا کہ یہ جگہ ڈاکوؤں اور جنگلی جانوروں کا ٹھکانہ ہے' اس لیے یہاں ٹھہرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنا سفر جاری رکھیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ مجھے ڈاکوؤں کی اس لیے کوئی فکر نہیں کہ میرے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں ہے' رہے جنگلی جانور تو میں مسجد کے دروازے پر آگ جلائے رکھوں گا تاکہ وہ داخل نہ ہو سکیں۔

میرے ساتھی نے میری ان باتوں کو بڑے غور سے سنا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں میرے پورے جسم کی تلاشی لی اور پھر کہنے لگا "جیسی آپ کی مرضی"۔ اس کے بعد میں نے وضو اور غسل کرنے کی خاطر کپڑے اتارے اور جمعہ سے (یہ اس کا نام تھا) کہا کہ ذرا وہ میری روٹی کا خیال رکھے کہ اسے کوئی کتا نہ لے جائے۔ اس دوران میں' میں دریا سے نہا کر آتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد' میرا خیال ہے کہ اس نے میرے سامان کی تلاشی لی ہوگی' اور میرا اندازہ تھا کہ جب اسے کوئی قیمتی چیز نہیں ملی تو وہ مایوس سا ہو گیا۔ جبکہ میں نہانے میں مصروف تھا' وہ خاموشی سے بیٹھا میرا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے کوئی زیور وغیرہ تو نہیں پہن رکھا۔ یہ دیکھ کر بھی اسے مایوسی ہوئی۔ نہانے کے بعد میں نے مغرب کی نماز پڑھی' جبکہ جمعہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی تھی' جس سے مجھے تھوڑی بہت تشویش ہو جاتی تھی۔

جب رات ہوئی تو ہم مسجد میں چلے گئے۔ میں نے اور جمعہ نے مل کر لکڑیاں اکٹھی کیں اور مسجد کے دروازے پر آگ جلا دی تاکہ جنگلی جانور نہ آسکیں۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر اپنے حصہ کی روٹی نکالی اور شام کا کھانا کھایا۔ جمعہ نے اپنے حصے کی روٹی میں سے مجھے کچھ دینا چاہا مگر میں نے اسے لینے سے انکار کر دیا' اور اس سے کہا کہ اگر اسے بھوک لگی ہو تو وہ میری روٹی میں سے کچھ لے لے۔

اگرچہ میں بہت زیادہ تھک گیا تھا اور نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں' لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری جان بچالی کیونکہ جمعہ نے مجھ سے گفتگو شروع کر دی اور کہنے لگا کہ اس نے میرے بارے میں اندازہ لگا لیا ہے کہ میں کرایہ کے فوجی کی طرح ہوں کہ جو ملازمت کی تلاش میں آوارہ پھر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی حالت بھی میری طرح کی ہی ہے کہ جس کا کوئی دوست اور جاننے والا نہیں۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ اگر میں قرآن شریف کے نام پر قسم کھاؤں کہ میں اس کا راز کبھی بھی فاش نہیں کروں گا تو وہ مجھے اپنا شاگرد بنانے پر تیار ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کا پیشہ اتنا شاندار ہے کہ وہ لمحوں میں آدمی کو مالدار بنا دیتا ہے۔

میں جمعہ کی گفتگو سے بڑا متاثر ہوا اور میں نے بغیر سوچے سمجھے' فوراً قسم کھا لی' اگرچہ اس کا بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا۔ اس کے بعد جمعہ کہنے لگا کہ ملک بھر میں اس کے ۷ شاگرد ہیں جو اس کے وفادار ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب وہ راز بتاؤ کہ کیا ہے؟ اس نے ایک بار پھر مجھ سے قسم لی کہ میں راز کو اپنے ہی تک رکھوں گا اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ پھر کہنے لگا کہ دراصل میں ٹھگ ہوں اور مسافروں کو قتل کر کے' ان کے مال کو ہتھیا لیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنا تھیلا ہاتھ میں لیا اور اس میں سے سونے کی اشرفیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں' جس نے تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھوں کو چکا چوند اور میرے ذہن کو ماؤف کر دیا۔ یہ سب اشرفیاں ۱۱۳ تھیں۔ میں نے جب اس کے اعتراف کو سنا تو میں اندر سے لرز کر رہ گیا اور میرے دل میں جمعہ کے لیے انتہائی سخت نفرت کے جذبات پیدا ہوئے' لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں اور اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح آسانی سے لوگوں کو قتل کر دیتا

ہے۔

جواب میں وہ کہنے لگا کہ "وہ مجھے تھوڑے ہی عرصے میں قتل کرنے میں ماہر کر دے گا' مگر یہ خیال رہے کہ میں اس کا نام کسی شہر یا گاؤں میں کسی شخص سے بھی نہ لوں"۔ اس نے کہا کہ "اس کا نام بڑا مشہور ہے' اس لیے اس کو راز ہی رکھنا۔ اس بات کا خیال رکھو کہ کل تم بھی اسی قدر امیر ہو سکتے ہو جتنا کہ آج میں ہوں' لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ تمہیں مال کا چوتھائی حصہ مجھے اور چوتھائی ایک خوبصورت عورت کو دینا ہو گا' جس سے ہم کل گوہد میں ملنے والے ہیں"۔

اس کی اس گفتگو کے بعد میں نے خود کو ایک بڑے خطرے میں پایا۔ اسی لیے میں نے تھکن کے باوجود خود کو بیدار رکھا اور نیند کو بھگانے کے لیے یہ کیا کہ بیڑی سلگانے کے بہانے آگ کے پاس گیا اور جان بوجھ کر اپنی انگلی جلا لی تاکہ میں بیدار رہ سکوں۔ اس دوران میں جمعہ میری وفاداری اور اطاعت گزاری سے مطمئن ہو چکا تھا اور مسلسل مجھے اپنی شیطانی ہدایات دینے میں معروف تھا' اور کہہ رہا تھا کہ کسی کو جان سے مار ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں ہے' لیکن مشکل کام یہ ہے کہ کسی کو پھانس کر اور بہلا پھسلا کر اس جگہ تک لایا جائے کہ جہاں پر اس کا کام تمام کرنا ہے۔

"اس سلسلہ میں مختلف طریقوں پر عمل کرتے ہیں" اس نے کہا۔ "مسافروں میں اعتماد پیدا کرنے کی غرض سے کبھی ہم فقیروں کے روپ میں ان کے پاس جاتے ہیں' کبھی ان کے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اور کبھی دلال کا کہ جو عورتیں مہیا کرے۔ جس عورت کا میں نے تم سے ذکر کیا ہے' وہ اس آخری مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ وہ مسافر کی توجہ فوراً اپنی طرف کر لیتی ہے اور پھر اپنے ناز و نخروں سے اس پر قابو پا کر اسے راستہ سے علیحدہ لے جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بہانہ کرتی ہے کہ وہ تھک گئی ہے اور ستانا چاہتی ہے' اس لیے وہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر ماچس جلا کر بیڑی یا چلم پینے لگتی ہے۔ اسی دوران ہم سے کوئی اس کے پاس پہنچ جاتا ہے' جو مسافر کو بڑا ناگوار گزرتا ہے مگر عورت یہ کہہ کر اس کی تشفی کرا دیتی ہے کہ یہ میرا شوہر یا بھائی ہے اور یہ آگ لے کر فوراً ہی چلا جائے گا۔ اس کے بعد ہم مل کر بیٹھیں گے اور بات چیت کریں گے"۔

باتوں کے دوران' وہ عورت' یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یہ حادثاتی طور پر ہوا ہے' اپنے جسم کے کسی حصہ کو اس طرح سے بتاتی ہے کہ مسافر کی ساری توجہ اس طرف ہو جاتی ہے اور اس موقع پر ہم میں سے کوئی رومال کو اس کی گردن میں ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تلاشی لی جاتی ہے اور اسے فوراً ہی دفنا دیا جاتا ہے۔ ہم لوگ علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں کہاں اور کب ملنا ہے۔

اس سے یہ باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے' میری آنکھیں جم کر رہ گئیں اور میری رگوں میں خون زور زور سے گردش کرنے لگا' لیکن میں نے اپنی اندرونی حالت کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور بڑی بے اعتنائی کے ساتھ میں نے اس سے ایک سوال اور کیا "کیا تم کسی کو مارتے وقت ذرا بھی رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے ہو"۔

"نہیں" اس نے جواب دیا "ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جیسے ایک قصائی گائے یا بکری کو ذبح کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتا۔ ابتداء میں ہر شخص کے دل میں رحم دلی کے جذبات ہوتے ہیں' لیکن جب برابر یہ کام کیا جائے تو پھر ہر چیز آسان ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ہمیں لوگوں کی خود غرضی' بے رحمی اور ظلم و ستم کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مثلاً اگر ہم بھوک سے مر رہے ہوں تو یہ ہمیں ایک روپیہ بھی دینے پر تیار نہیں ہوں گے اور نہ ہی یہ اس وقت ہم پر رحم کریں گے کہ جب ہم کو سزائے موت دی جا چکی ہوگی' اس لیے ہمیں بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے۔ اپنے پیشہ کو اختیار کرنے کے ابتدائی دور میں' میں نے ایک مرتبہ اس سے سخت نفرت کی"۔

"ہوا یوں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک مولوی کا کوٹہ سے اودے پور کے راستہ میں پیچھا کیا۔ سفر کے پہلے دن مجھے اس کا کوئی موقع نہیں ملا کہ میں اس کا کام تمام کر سکتا۔ شام کو وہ اپنے کچھ دوستوں کے ہاں چلا گیا کہ جہاں میں نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے دن علی الصبح ہم دونوں نے سفر شروع کیا' کبھی وہ مجھ سے آگے ہو جاتا تھا اور کبھی میں۔ کچھ دور چل کر وہ ناشتہ کرنے کے لیے ایک جگہ ٹھہرا اور جب اس نے

میری حالت زار دیکھی تو مجھے اپنی روٹی میں سے ایک ٹکڑا کھانے کو دیا۔ میں نے اسے دکھانے کے لیے روٹی کے ٹکڑے کو بڑے شوق سے لیا مگر کھایا اس لیے نہیں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس کا نمک کھاؤں اسے قتل بھی کروں، کیونکہ یہ نمک حرامی ہوتی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اودے پور جا رہا ہوں تاکہ وہاں ملازمت تلاش کر سکوں"۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ "خدا تمہاری کوشش کو کامیاب کرے"۔

ناشتہ کے بعد وہ چلا تو میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے کہ جہاں پانی مل سکتا ہو تاکہ وہ وضو کر لے ورنہ وہ تیمم سے کام چلا لے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک چشمہ ہے، اس نے مجھے راستہ بتانے کو کہا۔ میں نے جواب میں کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ چشمہ پر پہنچ کر اس نے وضو کیا اور جب وہ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور رکوع کی حالت میں تھا تو اس وقت میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب میں نے اس کی تلاشی لی تو میری مایوسی کی انتہا نہیں رہی کہ مجھے اس کے پاس سے صرف ایک پیسہ ملا، اس کے علاوہ تسبیح اور چند روٹی کے ٹکڑے تھے۔ میں نے اس کو وہیں پر دفنایا اور واپس اس گاؤں آیا جہاں میں نے اپنی بوڑھی ماں سے ملنے کا وعدہ کیا تھا"۔

میں نے اسے یہ پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ پیشہ چھوڑ دوں کیونکہ اس طرح بے گناہ لوگوں کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بہتر ہے کہ میں بھوکوں مر جاؤں۔

اسے میری یہ باتیں پسند نہیں آئیں۔ میرے ہاتھ سے وہ ایک پیسہ لے کر بازار گئی اور وہاں سے آدھ سیر جھینگوں کو لے کر واپس آئی اور میرے سامنے وہ بنڈل رکھ کر مجھ سے کہنے لگی "کیا تم ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو گن سکتے ہو"۔

میں نے کہا "ہاں، مگر انہیں گننے کے لیے کافی وقت چاہیے اور پھر اس کا فائدہ کیا؟" اس پر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بیوقوف لڑکے، دیکھو ایک پیسے کے لیے کتنی جانیں ضائع ہوئی ہیں اور تم احمق، بزدل اور کمزور دل والے ایک مولوی کے قتل سے پریشان ہو، جس کا کہ ایک پیر پہلے ہی سے قبر میں تھا"۔

اس نے پھر زور دے کر کہا "اگر ایک شیر اپنے شکار پر رحم کرے' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے بھوک سے مرجانا چاہیے"۔

"اس عورت کی اس نصیحت نے میرے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کر دیا" جمعہ نے کہا "اور اس کے بعد سے میں نے پھر کبھی اپنے پیشہ سے نفرت نہیں کی"۔

انہی باتوں میں آدھی رات گزر گئی۔ جمعہ مجھ سے کہنے لگا کہ "تمہیں نیند آ رہی ہوگی لہٰذا تم تین چار گھنٹے کے لیے سو جاؤ' اس وقت تک میں چوکیداری کروں گا' پھر تمہیں اٹھا کر میں سو جاؤں گا"۔

میں نے جواب میں کہا "بھائی' اتفاقاً" میری انگلی جل گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے اس قدر تکلیف ہے کہ میں سو نہیں سکتا' لہٰذا پہلے تم سو جاؤ' میں چوکیداری کرتا ہوں۔ جب مجھے نیند آئے گی تو تمہیں اٹھا دوں گا"۔

اس پر وہ ہنسا' میری پیشکش قبول کرتے ہوئے فوراً سو گیا اور اس قدر زور زور سے خراٹے لینے لگا کہ جیسے کوئی جانور غرا رہا ہو۔ میں اس وقت کی اپنی اذیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اس کی باتیں سن کر میرے دل پر بیتی۔ میری انگلی کی جو تکلیف تھی' اس سے زیادہ میرے دماغ کو صدمہ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جب میں نہانے گیا تو میرے ننگے جسم کو دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور اس لیے میری جان بچ گئی' ورنہ یہ کبھی کا مجھے گلا گھونٹ کر مار ڈالتا۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ میں اپنی تلوار سے اس خبیث کا گلا کاٹ کر اسے جہنم رسید کر دوں کہ جہاں عذاب دینے والے فرشتے اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے' لیکن میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ اس صورت میں' میں قتل کے جرم میں پکڑا جا سکتا تھا کہ جس نے روپیہ کے لالچ میں اسے مار ڈالا۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ خدا خدا کر کے رات ختم ہونے پر آئی اور میں نے صبح صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ سنی۔ میں خاموشی سے اٹھا' مسجد سے باہر آیا اور وضو کر کے نماز پڑھنے کے بجائے میں نے گوہد کی طرف تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا' اور تقریباً بیس منٹ میں دو میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ میں کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں جمعہ تو میرا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ میں جس وقت شہر پہنچا ہوں تو دروازہ کھلنے ہی والا تھا۔ دروازے کے چوکیدار اور سپاہیوں نے

جب مجھے بھاگتے آتے دیکھا تو مجھ سے اس طرح سے آنے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔

میں پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں صرف یہ کہہ سکا کہ "جمعہ ٹھگ"۔ اگرچہ میں نے اس سے آگے کچھ نہیں کہا مگر اس کا نام سن کر ہی سپاہی چوکنے ہوگئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس پر میں نے انہیں جگہ کا پتہ بتایا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ چل کر وہ جگہ بتاؤں۔ اس پر میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ انہوں نے مزید پوچھ گچھ کرنے کے بجائے اس جگہ کا راستہ لیا کہ جہاں جمعہ سو رہا تھا۔

اس دوران میں مجھے ریاست کے وزیر نے بلا بھیجا' اور مجھ سے پوچھ گچھ کی اور جب میری تفتیش ختم ہوگئی تو میں نے دیکھا کہ جمعہ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کو مارا پیٹا گیا اور یہاں تک کہ اس کے پورے جسم کو تلوار سے چھید ڈالا گیا۔ اس کے بعد حاضرین نے اس کے چہرے پر تھوکا۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے جو رقم برآمد ہوئی' وہ فوراً ضبط کرلی گئی۔ پھر اسے فوراً ہی ایک بڑی توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اس طرح اس کا ناپاک وجود اس دنیا سے ختم ہوگیا۔

(لطف اللہ کی آپ بیتی' ص ۸۷-۸۸)

(۴)

اورلچ اور ٹھگ

لیوپولڈ اورلچ ایک جرمن سیاح تھا، جو ۱۸۴۲ء میں ہندوستان آیا اور دو جلدوں میں اپنا سفرنامہ شائع کرایا۔ اس نے جہاں ہندوستان کے بارے میں دلچسپ معلومات دی ہیں، وہاں ٹھگوں کے بارے میں بھی اس کی اطلاعات مفید ہیں۔ یہ اقتباس اس کی کتاب سے ہے۔

✥

ٹھگوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہوتے ہیں، اکثر ان میں برہمن بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی عورتیں اپنے شوہروں اور بیٹوں کو ٹھگی کے لیے تیار کرتی اور اکساتی ہیں۔ دکن میں ایک عورت ان کی سردار ہے اور اس کے گروہ میں ۱۵ ٹھگ ہیں۔

ٹھگوں کے کہنے کے مطابق اودھ کے علاقے میں ۹/۱۰ مسلمان ٹھگ ہیں، دو آبہ میں ۴/۵ ہندو ہیں، نربدا کے جنوب میں ۳/۴ مسلمان ہیں، راجپوتانہ میں ۱/۴ مسلمان ہیں، بندھیل کھنڈ، بنگال، بہار اور اڑیسہ میں آدھے مسلمان اور آدھے ہندو ہیں۔

ٹھگوں کی اپنی علیحدہ سے زبان ہے اور ان کے اپنے ہی اشارے اور علامتیں ہوتی ہیں، جو کہ یہ خود ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً جمالدھی ٹھگ، جو کہ اودھ کی ریاست اور گنگا کے مشرق میں ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی پراسرار، چالاک اور شاطر مشہور ہیں۔ یہ اپنی بیویوں تک کو اپنے راز نہیں بتاتے اور اپنے لڑکوں کو اس وقت تک تربیت نہیں دیتے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں۔ ٹھگوں کی دوسری قسم

شمالی ہندوستان کی ملتانی ٹھگ ہے' وہ بنجاروں کی طرح معہ اپنی عورتوں اور بچوں کے سفر کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیلوں کی جوڑیاں اور غلہ و سامان تجارت سے لدی گاڑیاں ہوتی ہیں جو کہ یہ اپنے شکاریوں کو متوجہ کرنے کے لیے رکھتے ہیں۔ لوگوں کا گلا گھونٹنے کے لیے یہ رومال کے بجائے بیلوں کی رسی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ملتانی اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے ہیں اور اگر زندہ رکھتے ہیں تو ان کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کرتے۔ ان کا کسی اور ٹھگ فرقہ سے کوئی تعلق و ربط نہیں ہے' اگرچہ ان کی زبان اور اشارے ایک سے ہیں۔

چنگیزی یا نائک' ملتانیوں کی ہی ایک شاخ ہے۔ یہ ان کے رسم و رواج پر عمل کرتے ہیں مگر ان کے مقابلہ میں کم تر سمجھے جاتے ہیں۔

سوسی ٹھگوں کی ایک نئی جماعت ہے جو کہ ہندوؤں کی سب سے نچلی ذات پر مشتمل ہے۔ یہ جے پور' کشن گڑھ' بوندی' جودھپور' ٹونک' اور مالوہ و راجستھان کے اور کئی دوسرے علاقوں میں رہتے ہیں۔ دوسرے ٹھگ انہیں اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ یہ پورے ملک میں تاجروں' ساہوکاروں اور سپاہیوں کے بھیس میں سفر کرتے ہیں۔ جب وہ تاجروں کی طرح سفر کرتے ہیں تو ان کا سردار شاندار لباس پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے یا گاڑی میں یا پالکی میں بیٹھا ہوتا ہے' جسے اس کے لوگ ملازموں کی طرح گھیرے ہوئے اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہوتے ہیں تاکہ اس سے لوگوں کو متاثر کر سکیں۔

ٹھگوں کی ایک قسم پھانسی گر کہلاتی ہے۔ یہ اس بہانہ سے طویل سفر کرتے ہیں کہ ان کا کام چوروں کو پکڑنا ہے۔ ان کا سردار گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ یہ ۱۲ سال سے کم عمر کے بچوں کو ساتھ نلے کر چلتے ہیں تاکہ ان پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ بیل ہوتے ہیں کہ جن پر یہ لوٹ کا مال لادتے ہیں۔ یہ چالیس یا پچاس کی جماعت کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور خود کو دس یا بارہ کی ٹکڑیوں میں بانٹ لیتے ہیں۔ پولیگار یا گاؤں کے چودھری ان کی مدد کرتے ہیں کیونکہ یہ لوٹ کے مال میں سے ان کو بھی حصہ دیتے ہیں۔ بچوں کو یہ اس لیے بھی ساتھ رکھتے ہیں تاکہ ان کی تربیت ہو سکے۔ پھانسی گر ٹھگوں کی سب سے زیادہ ظالم جماعت ہوتی ہے' وہ کسی شخص

کو ایک روپیہ کے لیے بھی قتل کر سکتے ہیں' بلکہ وہ فقیروں تک کو نہیں چھوڑتے۔ ان کے ہاتھوں کئی سو مسافر مارے جا چکے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کی حرکتوں سے خاص قسم کے اشارے کرتے ہیں' اور ان کی جو زبان ہے' وہ دوسرے ٹھگ بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ پھانسی گر میسور کے علاقے میں رہتے ہیں' اس کے علاوہ کرناٹک اور چتوڑ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھی لڑکوں اور لڑکیوں کو قتل نہیں کرتے۔ اگر انہیں پکڑ لیتے ہیں تو لڑکوں کو اپنے پیشہ میں شامل کر لیتے ہیں اور لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔

پھانسی گر سال میں دو طویل سفر کرتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں انتہائی بے ضرر لگتے ہیں اور آسانی سے مسافروں کو اپنے دام میں پھانس لیتے ہیں۔ گلا گھونٹنے کے لیے یہ رسی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کالی دیوی یا مرنی (جو کرناٹک کے علاقے میں چیچک کی دیوی ہے) کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دعوت کا اہتمام کرتے ہیں اور دیوی سے اچھے شگون لیتے ہیں اور دیوی سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان کی مہم کامیاب ہوگی۔ اس کا جواب بھیڑ کی حرکتوں سے لیتے ہیں۔ اگر جواب نفی کی صورت میں آئے تو یہ اپنی مہم کو ملتوی کر دیتے ہیں اور دس یا بارہ دن کے بعد دوبارہ سے اس رسم کو کرتے ہیں۔

ٹھگوں کا ایک فرقہ دریائی ٹھگ ہے جو کہ بردوان کے ضلع میں رہتے ہیں۔ ان کی تعداد دو سو سے تین سو تک ہے اور ان کے پاس بیس کے قریب کشتیاں ہیں۔ یہ نومبر سے فروری تک گنگا میں سفر کرتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ بنارس اور الٰہ آباد زیارت کے لیے جا رہے ہیں۔ ہر کشتی میں ۱۴ کے قریب لوگ ہوتے ہیں اور یہ مسافروں کو اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ بعد میں یہ ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتے ہیں اور ان کو دریا میں پھینک دیتے ہیں۔ دریائی ٹھگ عورتوں کو نہیں مارتے۔ لودھا' موتی اور جمالدھی ٹھگ' جو بہار اور بنگال میں رہتے ہیں' ان سے ان کے رابطے ہیں۔

جب ٹھگوں کے ایک سردار سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا لوگوں کو قتل کرتے وقت ان کا ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتا ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ "کیا کسی کو

اپنے پیشہ ورانہ کام کرتے وقت یا تجارتی کاروبار کرتے وقت کوئی افسوس یا ندامت ہوتی ہے؟ اور کیا ہمارے سارے اعمال اور کام خدا کی جانب سے مقرر نہیں ہوتے ہیں؟ کیا یہ خدا کا ہاتھ نہیں کہ جو انہیں قتل کرتا ہے؟ اور ہم تو محض اس کے آلہ کار ہیں......"

یہ ان کے دستور میں ہے کہ یہ برہمن' غریب آدمی' طوائف یا میراثی کو قتل نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح جو مسافر سونا پہنے ہوئے ہو' یا وہ شخص جو معذور ہو' اسی طرح عورتوں کو بھی نہیں مارتے ہیں (مگر اکثر یہ روپیہ کے لالچ میں اس کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں) ان کے اکثر شکاری وہ فوجی ہوتے ہیں جو کہ چھٹیوں میں واپس گھر جا رہے ہوتے ہیں...... وہ یورپی لوگوں پر کبھی حملہ نہیں کرتے ہیں کیونکہ ایک تو وہ بہت کم پیسے لے کر چلتے ہیں' دوسرے ان کے پاس بھرا ہوا پستول ہوتا ہے' اور پھر یہ کہ ان کے گم ہونے پر کمپنی فوراً اس کا نوٹس لیتی ہے اور ان کی تلاش شروع کر دیتی ہے۔

ہندوستان کی ریاستیں اپنی رعایا کے تحفظ کے لیے ٹھگوں کے خلاف کوئی عملی اقدامات نہیں اٹھاتیں' بلکہ اکثر بڑے بڑے زمیندار ان کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اس کے عوض ان کے لوٹ کے مال میں حصہ دار بن جاتے ہیں...... جب ٹھگوں کے خلاف برطانوی حکومت نے مہم چلائی تو اس نتیجہ میں دو ہزار ٹھگ گرفتار ہوئے' جن میں سے ۱۲ سو سے تفتیش کی گئی اور ۷۹۴ قتل مکمل طور پر اس تفتیش کے نتیجہ میں ثابت ہوگئے۔ ان میں ۳۸۲ کو پھانسی دی گئی' ۹۰۹ کو جلاوطن کر دیا گیا اور ۷۷ کو عمر قید کی سزا ہوئی......

ٹھگوں میں یہ دستور ہے کہ اگر کبھی کوئی ٹھگ ظاہر ہو جائے تو پھر اس کے بعد سے وہ ٹھگ نہیں رہتا۔

(اورلچ' جلد دوم' ص ۱۴۵ – ۱۴۳)

۞

(۴)

سیتا رام اور ٹھگ

سیتا رام ایک شخص نے' جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں ملازم رہا تھا' اپنی یادداشتیں "سپاہی سے صوبیدار تک" کے عنوان سے لکھی ہیں۔ اس نے بھی اپنے پہلے سفر کے دوران' کہ جب وہ اپنے ماموں کے ساتھ کمپنی کی ملازمت کے لیے جا رہا تھا' ٹھگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جن سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ اس کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ٹھگ جب کسی جماعت کو لوٹنے کا منصوبہ بناتے تھے تو اس صورت میں وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ سلیمن کے واقعہ اور سیتا رام کے بیان سے ٹھگوں کے طریقہ کار کے بارے میں معلومات ملتی ہیں کہ وہ بار بار بہروپ بدل کر مسافروں سے رابطہ کرتے تھے اور موقع پا کر انہیں مار ڈالتے تھے۔

سیتا رام نے ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر کیا ہے' جو اس کے ساتھ پیش آیا۔

✥

ہمارے سفر کے تین یا چار دن بعد ہمیں راستہ میں خانہ بدوش گانے بجانے والوں کی ایک جماعت ملی' جنہوں نے ہم سے درخواست کی کہ وہ ہمارے ساتھ حفاظت کی خاطر سفر میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان میں دو کے پاس طبلے تھے' چار کے

پاس ستار تھے اور دو کے پاس کھڑتالیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک قریبی گاؤں میں کسی شادی میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔

کچھ دنوں تک حالات معمول کے مطابق رہے' اور گانے بجانے والے راستے میں اپنے شغل سے ہمیں محظوظ کرتے رہے۔ لیکن چوتھے دن رات کو میرے چچا کی اتفاقاً" آنکھ کھل گئی تو انہوں نے دیکھا کہ موسیقاروں کی جماعت ایک جگہ جمع ہو کر کسی انجانی زبان میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ وہ ان کی حرکات کی وجہ سے چوکنے ہو گئے اور انہوں نے فوراً اپنے سپاہی ساتھیوں کو جگا کر بتایا کہ انہیں پورا یقین ہے کہ یہ خانہ بدوش موسیقار درحقیقت ٹھگ ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہم سے ایک کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ جب دوسرے سو رہے ہوں تو وہ چوکیداری کرے۔

دوسرے دن صبح میرے ماموں نے موسیقاروں سے کہا کہ چونکہ انہیں بغیر آرام کیے لمبی مسافت طے کرنی ہے' اس لیے ان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھ سکیں۔ اگرچہ موسیقاروں نے گڑگڑا کر ہم سے یہ درخواست کی کہ انہیں علیحدہ نہ کریں کیونکہ اس صورت میں انہیں لٹنے کا خطرہ ہے' مگر میرے ماموں نے اس کی پرواہ نہ کی اور دوسرے دن ہم علی الصبح سفر پر روانہ ہو گئے اور موسیقاروں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ کوئی آٹھ میل چلنے کے بعد ہم ایک چھوٹے راستہ پر ہو گئے اور سوچا یہ کہ تیس میل چلنے کے بعد ہم دوبارہ سے شاہراہ پر آ جائیں گے۔

اس کے بعد چار دن تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا' لیکن چوتھی رات کو جب ہم نے ستانے کے لیے ایک جگہ قیام کیا تو کوئی گیارہ آدمیوں کی ایک جماعت ہم سے آ کر ملی کہ جن کے پاس حقہ بنانے کے بانس تھے۔ انہوں نے بھی موسیقاروں کی طرح ہم سے درخواست کی کہ حفاظت کی غرض سے ہم انہیں سفر میں شریک کر لیں۔ دوسرے دن صبح کو میں نے جب آدمیوں کو دیکھا تو مجھے خیال ہوا کہ ان میں سے ایک وہی ہے جو موسیقاروں کی جماعت میں تھا۔ میں نے فوراً اس کا ذکر اپنے ماموں سے کیا۔ انہوں نے فوراً ان سے بات چیت شروع کر دی' لیکن ہمیں احساس ہوا کہ ان کی زبان موسیقاروں سے مختلف تھی۔ ان کے کپڑے بھی بہت گندے تھے اور دیکھنے میں وہ قلی یا سامان اٹھانے والے نظر آتے تھے' لیکن اس کے بعد سے

میرے ماموں نے یہ کیا کہ کسی ایک سپاہی کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ چوکیداری کرے اور ان پر برابر نظر رکھے۔

دوسری رات کو میں بالکل نہیں سو سکا' کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ ٹھگ ہیں' لیکن میں اپنی کوشش کے باوجود تھکے ہونے کی وجہ سے سو گیا۔ تھوڑی دیر میں میری آنکھ کھل گئی اور میں نے ایسی آواز سنی جیسی کہ صبح مرغ اذان دے رہا ہو۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور دیکھا کہ ہمارے شریک سفر سونے والوں کے اردگرد ہیں۔ میں یہ دیکھ کر زور سے چیخا۔ اس پر میرا ماموں فوراً تلوار کھینچ کر کھڑا ہوگیا اور ان لوگوں کی طرف بھاگا۔ اگرچہ یہ سب لمحہ بھر میں ہوا' مگر اس دوران میں وہ دیو نارائن کے بھائی کا ریشمی رومال سے گلا گھونٹ چکے تھے اور اسی کوشش میں تلک دری بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس کی زندگی میرے ماموں کی وجہ سے بچی' جنہوں نے ٹھگ کے دو ٹکڑے کر دیے۔ یہ دیکھ کر دوسرے ٹھگ وہاں سے فرار ہوگئے اور بانسوں کے گٹھے وہیں چھوڑ گئے' لیکن اس تھوڑے سے وقفہ میں ٹھگوں نے میرے ماموں کے سونے کے بٹن' جن کی قیمت ۲۵۰ روپے ہوگی اور تلک دری کی بندوق چرا لی تھی۔ دراصل قصور تلک کا تھا جو چوکیداری کرتے کرتے سو گیا تھا۔

اس کے بعد ہم فوراً قریبی گاؤں میں گئے اور وہاں کے لوگوں کو سوتے سے اٹھایا' مگر ان میں سے کوئی اس پر تیار نہیں ہوا کہ ہمارے ساتھ ان قاتلوں کا پیچھا کرے' لہذا ہم نے بقایا رات گاؤں کے باہر گزاری۔ ہمارے ساتھ دیو نارائن کے بھائی کی لاش بھی تھی۔ دوسرے دن ہم نے اپنے قیام کی جگہ پر بانسوں کو اسی طرح سے پایا' جنہیں میرے ماموں نے ایک تمباکو فروش کے ہاتھوں ۴۶ روپے میں فروخت کر دیا۔

(ص ۱۰-۱۲)

❂

(۵)

امیر علی ٹھگ

کیپٹن میڈوز ٹیلر نے "ایک ٹھگ کے اعترافات" نامی ناول لکھا۔ یہ ناول اس کے ان تجربات پر مبنی تھا جو اس نے ہندوستان میں ٹھگوں کو ختم کرنے کی مہم میں حاصل کیے تھے۔ اس نے اس کے ناول کے بارے میں لکھا ہے کہ

"۱۸۳۷ء میں جب کہ میں ایلچ پور' برار میں اپنی رجمنٹ میں تھا' تو میں بخار کی وجہ سے نہ صرف کمزور ہوگیا تھا' بلکہ مایوسی کا بھی شکار تھا۔ اس موقع پر میں نے "اعترافات" لکھی تاکہ میرا وقت گزر سکے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ میں ٹھگوں کے مقدموں کی تیاری میں کچھ عرصہ کے لیے مصروف رہا تھا۔ اس دوران میں کئی سو ٹھگوں نے قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے واقعات مجھے سنائے تھے۔ اس لیے میرے پاس ان کے بارے میں بڑا مواد تھا جو میں نے نوٹس کی شکل میں لیا تھا"۔

اس ناول کا خاص کردار امیر علی ہے' جس کی میڈوز نے خود تفتیش کی تھی اور جس نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے ۷۱۹ کے قریب لوگوں کو قتل کیا ہے۔ ٹھگوں کے بارے میں تمام معلومات کو اس نے امیر علی کی زبانی بیان کیا ہے' اس کا یہ ناول ۱۸۳۹ء میں پہلی مرتبہ چھپا اور چھپتے ہی مقبول ہوگیا۔

اردو میں اس کے کئی ترجمے ہوئے' ان میں سے ایک احمد

الدین مارہروی کا ہے' جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں اس کا ترجمہ کیا۔ ان
کے کہنے کے مطابق اس وقت اس کتاب کے بیالیس ایڈیشن چھپ
چکے تھے۔ یہ اقتباسات اسی ترجمے سے ہیں۔

✤

——— (۱) ———

"دسہرہ میں کیا خصوصیت ہے کہ ہندو' مسلمان سب اس کو مناتے ہیں؟"
"ارے تمہیں اس کا پتہ نہیں کہ ہمارا پیشہ خدا ساز ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر
اہل ہنود سے ہے۔ انہوں نے ہی ہمیں اس کی تعلیم دی ہے"۔
میں نے فوراً اعتراض کیا۔ "تب تو اور بھی تعجب کی بات ہے کہ آپ مسلمان
اور سید ہو کر ہندوؤں کے دیوتاؤں کو مانتے ہیں"۔
"نہیں' یہ بات نہیں۔ ٹھگی چونکہ ہندوؤں کا پیشہ ہے اور اس کے چند اصول
مقرر ہیں' اس لیے ہم مسلمان بھی جب اس پیشہ کو اختیار کرتے ہیں تو ان اصولوں کی
پابندی ہمارے اوپر بھی لازمی ہو جاتی ہے۔ اس سے ہمارے مذہب پر کوئی حرف نہیں
آتا' البتہ ہماری آمدنی میں ان کی پابندی سے برکت اور فراوانی ہو جاتی ہے"۔
"میرا سوال یہ تھا کہ مسلمان' ہندوؤں کے تہواروں کو کیوں مانتے ہیں؟"
"سب تہواروں کو نہیں' صرف دسہرہ کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پیشہ کے
لیے دسہرہ کا زمانہ نہایت موزوں ہے اور اسی واسطے ہندوؤں نے اسے اہمیت دے رکھی
ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ میں تمہیں ٹھگی کے وجود کا سبب بتاؤں۔ اہل ہنود
کا عقیدہ ہے کہ ابتداء میں خلاق عالم نے دو قسم کی قدرتیں پیدا کیں' ایک تعمیری اور
دوسری تخریبی' لیکن دوسری طاقت پہلی کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس لیے معبود مطلق
نے تباہ کرنے والی طاقت کو ہر ممکن ذریعہ اختیار کرنے کی اجازت فرما دی۔ اسی زمانہ
میں اس کی بیوی بھوانی یا کالی دیوی نے ایک عورت بنا کر اسے موت کا پورا اختیار
دے دیا۔ اس کے چیلے ٹھگ کہلاتے ہیں اور دیوی نے اپنے ہاتھ سے اس عورت کو
قتل کر کے انسانی جان لینے کا نیا گر سکھایا۔ پھر ان سب کو دنیا میں بھیج کر کہا کہ لوٹ

مار شروع کر دو اور دنیاوی فائدے کے لیے مال غنیمت کو اپنے کام میں لاؤ۔ رہ گئیں مقتولوں کی لاشیں' ان میں تمہاری پشت پناہی کرتی رہوں گی اور تم میرے لیے اپنا کام جاری رکھو گے۔ اس واقعہ کو زمانہ گزر گیا لیکن دیوی نے اپنے پرستاروں کو ہمیشہ قانون کے پنجہ سے محفوظ رکھا اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔

لیکن رفتہ رفتہ ان کی عقیدت کو گھن لگنے لگا۔ ایک گروہ نے دیوی کی قدرت میں شک کیا اور کہا کہ بھوانی لاشوں کو کس طرح ٹھکانے لگا سکتی ہے۔ دوسرے نے کہا چلو کیوں نہ آزمائش کر لیں۔ ایک شخص کو قتل کر کے جھاڑیوں میں چھپ جاؤ اور دیکھو کہ دیوی اس کا کیا کرتی ہے' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ ایک آدمی کو ہلاک کر کے قریب ہی جھاڑیوں میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ مگر دیوی کی نظر سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔ اس نے سب کچھ دیکھ لیا اور بڑے عتاب سے کہا کہ نامرادو' تم نے میرے متعلق شک کیا' اب اس کی سزا یہ ہے کہ آج سے میں تمہیں قانونی شکنجہ سے نجات دلانا ترک کرتی ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں لاشوں کا کچھ نہیں کر سکتی' تو آج سے میں واقعی کچھ نہ کروں گی' لیکن ان کا کفن دفن بھی تمہارے ہی ذمہ ہوگا۔ میں تمہاری پشت پناہی اور مدد ضرور کرتی رہوں گی لیکن صرف چند اشاروں سے جنہیں تم شگون سمجھتے ہو۔

یہ کہہ کر دیوی تو غائب ہو گئی لیکن ان لوگوں کو اپنی حماقت کی سزا ملتی رہی۔ یہ ضرور ہے کہ دیوی ہمارا خیال رکھتی ہے لیکن بعض اوقات ہمارے مقتولوں کی لاشیں مل جاتی ہیں اور ٹھگوں پر شبہ بھی کیا جاتا ہے لیکن اس کی وجہ زیادہ تر دیوی کی ناراضگی یا اس کی نشانیوں سے بے اعتنائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم باوجود مسلمان ہونے کے اس کو ناخوش کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے مذہب کی پابندی کرتے' روزہ رکھتے اور پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں' لیکن ساتھ ہی دیوی کو بھی مانتے ہیں۔ اگر اس میں کچھ قباحت ہوتی تو ہم خدا کے معتوب ہو جاتے اور ہمارا کوئی کام صحیح نہ ہو سکتا' لیکن تم دیکھتے ہو کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب ہندو ہوں یا مسلمان' آزاد اور خوش ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا بھی ہمارے اس عمل سے ناراض نہیں۔

اس منطق سے میرا مکمل طور پر اطمینان ہوگیا اور میں نے کہا کہ اس بیوقوف ملا کے سمجھانے پر میں ہندو' مسلمان کے میل جول کو برا سمجھا کرتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں فضول و بے معنی ہیں"۔

"اب مجھے کچھ اور سمجھانے کی ضرورت نہیں' تم ان لوگوں سے ملو اور دیکھو کہ وہ سب کس قدر شریف اور دوستی کے لائق ہیں۔

دسہرہ کے روز مجھے اس گروہ میں شامل کرنے کی رسم شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مجھے غسل کرا کے نئے کپڑے پہنائے گئے اور والد صاحب' جو میرے گرو بنے تھے' مجھے ایک کمرہ میں لے گئے جہاں تمام سردار فرش پر بیٹھے تھے۔ پھر انہوں نے سب لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ مجھے اپنے گروہ میں شامل کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ اس کا سب ہی نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد مجھے میدان میں لایا گیا اور والد صاحب نے آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں کہا "اے ہماری آقا بھوانی' اس نو آموز کو اپنی پناہ میں لے لے اور کوئی ایسی نشانی دکھا جس سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ تو نے اسے بخوشی قبول کر لیا ہے۔

ہم لوگ دیر تک انتظار کرتے رہے۔ آخر ایک الو قریب کے درخت سے ہوکا اور سب لوگ چلا اٹھے۔ جے بھوانی' بھوانی کی فتح' میرے والد صاحب نے کہا "بیٹا تم بڑے خوش نصیب ہو' بھلا ایسی نشانی کس کو میسر آتی ہے۔ مجھے تو ہرگز اس کی امید نہ تھی"۔

اب مجھے پھر اسی کمرہ میں لایا گیا اور ایک رومال' جس پر تیر کی تصویر بنی تھی اور جو اس پیشہ کا مقدس مارکہ تھا' میرے داہنے ہاتھ میں دیا گیا' جسے میں نے حسب الحکم سینہ تک اٹھایا اور وفادار رہنے کی قسم کھائی۔ پھر اس طرح کا عہد و پیمان قرآن شریف ہاتھ میں لے کر کیا۔ پہلی قسم کا تعلق پیشہ سے تھا اور دوسری کا مذہب سے۔ اس کے بعد مجھے گڑ کھلایا گیا اور سب نے والد صاحب کو مبارکباد دی۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹا آج سے تم اس گروہ میں شامل ہوئے ہو جو دنیا کا قدیم ترین مذہبی فرقہ ہے۔ تم نے وفادار' بہادر اور رازدار رہنے کی قسم کھائی ہے۔ آج سے تم بنی نوع انسان کے دشمن ہو اور ہر شخص کو بلا پس و پیش ہلاک کر سکتے ہو' البتہ ہمارے

نزدیک مندرجہ ذیل پیشہ وروں کا مارنا ناجائز ہے اور دیوی ان کا خون ہرگز معاف نہیں کرتی۔ تم بھی کبھی کسی دھوبی' بھاٹ' سکھ' نانک شاہی' مداری' فقیر' طوائف' بھڑوے' بھنگی' تیلی' لوہار' بڑھئی' کوڑھی یا جذامی کے قتل سے ہاتھ نہ رنگنا' ان کے علاوہ تم دیوی کی نشانی پا کر بڑے سے بڑے شخص کو فنا کے گھاٹ اتار سکتے ہو۔ اچھا تو اب تم آج سے ٹھگ بن گئے"۔

جی' درست ہے۔ اب میں صرف اس انتظار میں ہوں کہ مجھے کام کا موقع کب ملتا ہے"۔

صاحب' اس طرح میں ایک ٹھگ بن گیا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا سردار' کیونکہ اگر معمولی طور پر داخل ہوتا تو ایک عرصہ تک میری محض ثانوی حیثیت ہوتی' لیکن چونکہ میری بہادری کا افسانہ کافی مشہور ہوگیا تھا اور دیوی نے بھی مجھے خاص شگون سے نوازا تھا اور ان سب سے بڑھ کر جمعدار اسمٰعیل کا فرزند ہونے کے باعث مجھ کو ایک خاص شرف اور خصوصیت حاصل تھی۔ اس لیے ہر شخص سمجھتا تھا کہ اس کے مرنے یا کام سے دستکش ہونے کی صورت میں' میں ہی اس کا جانشین ہوں گا۔

جس غرض کے واسطے ہم لوگ شیوپور جمع ہوئے تھے' اس کا تعلق میرے والد صاحب کے مجوزہ پروگرام سے تھا۔ ان کی رائے تھی کہ ٹھگوں کی تین جماعتیں دکن پر تاخت و تاراج کرنے کی غرض سے روانہ ہوں۔ ایک کے سربراہ وہ خود ہوں' دوسرے کا حسین اور تیسری ایک اور دفعدار کے ماتحت ہو۔ سب لوگ ناگپور تک ساتھ چلیں' وہاں سے والد صاحب حیدر آباد کی طرف' دوسری جماعت اورنگ آباد کی جانب اور تیسری پونا کی طرف نکل جائے اور برسات شروع ہونے سے قبل سب لوگ شیوپور واپس آ جائیں۔

اس تجویز کو سب نے بالاتفاق منظور کر لیا۔ دکن پر چونکہ ایک عرصہ سے حملہ نہ ہوا تھا' اس لیے کافی مال غنیمت حاصل ہونے کی امید تھی۔ کچھ روز تیاری میں صرف ہوئے۔ آخر ہماری تین جماعتیں' جو علی الترتیب ساٹھ' پینتالیس اور تیس آدمیوں پر مشتمل تھیں' دکن کی طرف روانہ ہو گئیں۔ باقی ٹھگوں کو بنارس' اودھ اور ساگر وغیرہ کی لوٹ کا کام سپرد کیا گیا۔

ہر سفر شروع کرنے سے پہلے دیوی کا شگون حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے' جو یقیناً اس کی اجازت اور انکار سے منسوب ہوتا ہے اور چونکہ میری نظروں میں اس کی رسم بالکل ایک نئی چیز ہے' اس لیے آپ کی خاطر اسے تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔

ہم سب لوگ گاؤں کے باہر ایک درخت کے نیچے جمع ہوئے اور ایک رومال بدری ناتھ کے ہاتھ میں' جو نشانیوں کا بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا' تھما دیا گیا۔ والد صاحب ایک لوٹا لے کر' جس میں پانی لبالب بھرا تھا' پیچھے پیچھے چلے۔ پھر انہوں نے اسے دانتوں مں دبا لیا۔ اگر یہ لوٹا خدانخواستہ گر جاتا تو علاوہ اس کے کہ ہم ناکام ہو جاتے' ان کی موت بھی یقینی تھی' مگر شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ درخت کے قریب پہنچ کر انہوں نے جنوب کی طرف رخ کیا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر کہا "بھوانی! اے ملکہ اگر یہ تجویز تیری مرضی کے مطابق ہو تو ہمیں کوئی نشانی عطا کر اور ہماری مدد فرما"۔

پھر ہر شخص نے فرداً فرداً یہی الفاظ دہرائے اور شگون کا بے صبری سے انتظار کرتے رہے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر کوئی چڑیا تک نہ بولی۔ آخر بائیں جانب سے گیدڑ کی آواز آئی اور ساتھ ہی تمبو (دائیں طرف کا اشارہ) سے بھی ایک گیدڑ بولا۔ بس پھر کیا تھا' ہر شخص "جے بھوانی' جے بھوانی" چلانے لگا کیونکہ ان کے نزدیک دونوں طرف سے ایک ساتھ اشارے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اب سب کو اپنی اس مہم کی شاندار کامیابی کا یقین ہوگیا۔

اس کے بعد والد صاحب نے سات گھنٹہ وہاں بیٹھ کر کل انتظام مکمل کیا اور پھر گنیش پور کی طرف روانہ ہوگئے۔ شام کے وقت بدری ناتھ نے پیلو اور تمبو دونوں طرف سے پھر شگون لیا۔ اگلے دن صبح بھی احتیاطاً" ایسا ہی کیا گیا' لیکن ہر دفعہ علامات یکساں رہیں اور سب کو یقین ہوگیا کہ اس سفر میں عنقریب خوب مال ملے گا۔

(ص ۲۳ - ۲۵)

—— (۲) ——

امراوتی شمالی اور جنوبی ہندوستان کے درمیان بڑی تجارتی منڈی ہے اور شہر کے تجار نہایت مالدار اور ساتھ ہی ہٹے کٹے ہیں۔ میں نے جو رونق یہاں پر دیکھی' وہ

بنارس میں بھی نظر نہ آئی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر تین منزل پر بنگلور ہے۔ والد صاحب کی رائے تھی کہ وہاں ساہوکار کو ٹھکانے لگایا جائے۔ حسین کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ اس علاقہ میں چند پہاڑیاں اور گھاٹیاں ہیں' جہاں مردوں کو بڑی آسانی سے دفن کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے گروہ میں سے تین اشخاص اس خطہ ملک کے چپہ چپہ سے واقف تھے اور ان کے مشورے سے ایک خاص جگہ کو بھیل کے واسطے منتخب کر کے لغائیوں کو ہدایت کر دی گئی۔ سب انتظام میرے شکار کے لیے کیا جا رہا تھا اور وہ وقت قریب آتا جا رہا تھا کہ میں بھی اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کی طرح رومال کا آزادانہ استعمال کر سکوں۔

مگر میرا دل کمزور تھا۔ ایک طرف تو مجھے ساہوکار کو ٹھکانے لگانے کی آرزو تھی اور دوسری طرف جب اس پر نظر پڑتی تھی تو بدن میں سنسنی پیدا ہو جاتی تھی' لیکن پھر میں اس عارضی کمزوری پر غالب آگیا۔ مجھے دنیا میں نام پیدا کرنا تھا اور اگر آج بھی بزدلی دکھائی تو آئندہ کے واسطے تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔

تیسرے دن ہم بنگلور پہنچ گئے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ میر حیات قلندر کی درگاہ شریف زائرین کے لیے ایک بڑا مقدس مقام ہے' چنانچہ ہماری جماعت کچھ تو عقیدت کی بنا پر اور کچھ اس خیال سے کہ ہم پر شبہ نہ ہو' وہاں پہنچے لیکن ذرا آپ میری حیرت کا اندازہ کیجئے' جب مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کے چند مجاور بھی ٹھگ ہیں' جن کو ہم نے پوشیدہ نشانیوں سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا' مگر والد صاحب کی ہدایت کے بموجب کسی نے ان کو اپنے سفر کی نوعیت سے مطلع نہ کیا ورنہ وہ بھی ساہوکار کے مال میں حصہ رسدی طلب کرنے لگتے' حالانکہ اس سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

سیٹھ جی حسب معمول شہر کے اندر قیام پذیر تھے اور ہم ان کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ ان کا پیام پہنچا کہ ایک غیر معمولی کام کی وجہ سے انہیں چند گھنٹہ مزید قیام کرنا پڑے گا اور بڑی لجاجت سے التجا کی تھی کہ آج رات کا سفر ملتوی کر دیا جائے اور صبح سویرے روانہ ہوں تاکہ شام تک بسنم پہنچ جائیں' جو وہاں سے ایک منزل تھا۔ اس جگہ ساہوکار کو اپنے چند دوستوں سے ملنا اور چند تجارتی امور کا

تصفیہ کرنا تھا۔

اس وقت تک ہر شخص کو علم ہوگیا تھا کہ ساہوکار کی قضا میرے ہاتھ سے آئی ہے اور تمام ٹھگ فرداً فرداً مجھے مبارکباد دے کر ثابت قدم اور جری رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا' میری اولوالعزمی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ والد صاحب بھی یہ دیکھ کر بے حد مسرور تھے' جس کا اظہار ان کے چہرے سے بخوبی ہو رہا تھا' گو زبان سے اس کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

بظاہر ساہوکار کی مہم بہت اہم معلوم ہوتی تھی' وہ اور حسین ہر شخص کو اس کے فرائض سے جداگانہ طور پر آگاہ کر رہے تھے۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ مگر مجھے نصیحت کرنا اور ہدایات دینا صرف روپ سنگھ کے ذمے تھا۔ وہ پوچھتا تھا "بابا! کیا تمہارا دل مضبوط' ارادہ راسخ اور خون جوش میں ہے؟" اور میں جواب دیتا "گرو جی! آپ فکر نہ کریں' میں ان سب باتوں کو خود ہی محسوس کر رہا ہوں"۔

وہ کہتے "بیشک میں نے ہزاروں نوجوانوں کو پہلے شکار کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اتنی بے جگری اور عزم کسی میں نظر نہیں آیا' کیوں نہ ہو' تمہارے اوپر منتر بھی تو سب سے زیادہ پڑھے گئے ہیں"۔ لیجئے یہ منتروں کی بھی ایک ہی رہی' لیکن میں نے کہا کہ "میں بلا منتروں کے بھی بہادر ہوں"۔

"بیٹا توبہ کرو توبہ' بھوانی پٹکا ہے' اس کی گستاخی سے درگزر کرنا"۔ پھر مجھ سے کہنے لگا "تم ان منتروں کے اثر سے ابھی ناواقف ہو۔ مجھ سے زیادہ بہادر راجپوت ٹھگوں کے گروہ میں آج تک نہیں گزرا۔ میں نے سینکڑوں درندوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں' لیکن جب پہلی مرتبہ میرے ہاتھ میں رومال دیا گیا تو میرا جسم کانپنے لگا اور میں بدقت اس کام پر آمادہ ہوسکا۔ ہاں! ابھی ایک رسم باقی ہے' جاؤ والد' حسین اور بدری ناتھ کو بلا لاؤ"۔

جب سب جمع ہوگئے تو روپ سنگھ ہم کو قریب کے کھیت میں لے گیا اور ایک طرف رخ کر کے باواز بلند چلایا "او کالی' مہا کالی' اگر تیری مرضی ہے کہ ساہوکار اس لڑکے کے ہاتھ سے مرے تو ہم کو تھبو کی نشانی عطا کر"۔

ان الفاظ کے ساتھ تمام لوگوں کے منہ پر مہر خاموشی لگ گئی اور نشانی کا بے

صبری سے انتظار کرنے لگے۔ اب اس کو اتفاق کہہ لیجئے یا کسی شیطان کی حیلہ گری کہ اسی وقت ایک گدھا بڑی زور سے رینکا۔ والد صاحب خوش ہو کر بول پڑے "جے بھوانی' آج تک اتنی جلدی نشانی نہیں ملی۔ دیوی نے اسے اپنا چیلا بنا لیا۔ (روپ سنگھ سے) اب صرف رومال میں گرہ لگانی باقی رہ گئی اور یہ آپ کا کام ہے"۔

"یہ بھی وقت پر ہو جائے گا"۔ چنانچہ جائے اقامت پر پہنچ کر اس نے میرا رومال لیا اور اس گرہ کو کھول کر' جو مشق کے دوران لگائی گئی تھی' دوسری گانٹھ لگا دی۔ اس مرتبہ پھندا دوسری طرح لگایا گیا تھا اور اس میں چاندی کا ایک سکہ بھی رکھ دیا گیا تاکہ شکار آسانی سے دم توڑ دے۔ پھر وہ مجھے دیتے ہوئے کہنے لگا "لو اس مقدس حربہ کو احتیاط سے رکھو' بھوانی تمہیں پوری کامیابی عطا کرے"۔

وہ دن اسی طرح گزرا۔ رات کو ہم لوگ اس خیال سے کہ صبح سویرے ہی سفر کرنا ہے' خوب اچھی طرح سوئے۔ حتیٰ کہ مجھے تو ساہوکار کی آمد کا حال بھی معلوم نہ ہوا۔ بہرحال ہم وقت پر روانہ ہوگئے۔ رات ابھی دو گھنٹہ باقی تھی۔ سڑک صاف اور سنسان تھی۔ مال غنیمت کی امیدوں نے ہمارے خیالات میں جولانی پیدا کر دی تھی اور سب خوش و خرم تھے۔ والد صاحب نے چند لغائیوں کو پہلے ہی روانہ کر دیا تھا کہ وہ مناسب موقع پر ساہوکار کی آخری آرام گاہ (قبر) تیار کر رکھیں۔ چنانچہ دو کوس پہلے ہمیں ان میں سے ایک شخص کام سے واپس ہوتے ہوئے مل گیا۔ والد صاحب نے اس سے ٹھگی کی پوشیدہ زبان میں دریافت کیا 'بھلا منجے؟" (کیا گڑھا تیار ہوگیا؟)

"منجے تیار' سامنے والی پہاڑی میں ایک چشمہ ہے' اسی کے دامن میں بھیل ہے۔ جمعدار صاحب' آپ یقیناً اس جگہ کو پسند کریں گے"۔

"یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"آدھا کوس تو ضرور ہوگی' کچھ دور آگے راستہ پتھریلا ہوگیا ہے اور چشمہ کے کنارے تک ایسا ہی چلا گیا ہے۔ وہاں ایک تنگ درہ بھی ہے۔ اس سے بڑھ کر پوشیدہ جگہ میسر آنا تقریباً ناممکن ہے"۔ یہ کہہ کر وہ شخص تو جماعت میں مل گیا اور والد صاحب نے سب لوگوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ ساہوکار کے ہمراہیوں کو ٹھکانے لگانے کے واسطے جو آدمی مقرر کیے گئے تھے' وہ اپنے اپنے شکاروں کے پیچھے ہو

لیے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے آلہ قتل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ میرا خیال تھا کہ اشارہ کا فقرہ جلد ہی کہا جائے گا' لیکن وہ جگہ ابھی کافی دور تھی۔ آگے چل کر جھاڑیوں کے نزدیک جنگل زیادہ گھنا ہوگیا تھا اور چونکہ ابھی تک اچھی طرح روشنی نہ ہوئی تھی' اس لیے اور بھی بھیانک و تاریک معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس سے زیادہ مناسب اور موزوں جگہ اس کام کے واسطے نہیں مل سکتی' اگرچہ یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ لغائیوں نے اس سے بھی زیادہ بہتر جگہ تجویز کی تھی۔

ایک شخص آیا اور والد صاحب سے کچھ کہہ کر واپس چلا گیا۔ اس سے میری سرگرمی کو ایک اور تازیانہ لگا' لیکن دوسرے ہی لمحے ہم اس مقام پر پہنچ گئے جو اس کام کے واسطے منتخب کیا گیا تھا۔ یہاں دریا کے دونوں طرف اونچے اونچے ٹیلے تھے اور سطح آب اوپر سے بڑی گہری معلوم ہوتی تھی۔ ان کے اوپر ہر طرف گنجان درخت تھے اور شاخیں ایک دوسرے سے اس طرح ہمکنار تھیں کہ ایک کو دوسری سے تمیز کرنا ناممکن تھا۔ یہاں اگر سینکڑوں رہزن بھی پوشیدہ ہو جائیں تو کسی کو پتہ نہ لگ سکے اور پھر اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ان کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوگا۔

میں اپنے انہی خیالات میں منہمک تھا کہ والد صاحب کے باواز بلند "ہوشیار" کہنے پر چونک پڑا۔ یہ پہلا اشارہ تھا۔ ساہوکار ابھی تک اپنی گاڑی پر سوار تھا' لیکن اب چونکہ راستہ دشوار گزار ہوگیا تھا' اس لیے اس کو راہ کا نشیب و فراز سمجھا کر پیدل چلنے کے واسطے کہا گیا۔ سب سے پہلے گاڑی کو نیچے اتارا گیا اور خود ساہوکار بھی اترنے کی تیاری کر رہا تھا کہ مقررہ اشارہ صادر ہوگیا۔

"جے کالی" کی آواز کے ساتھ ہی میرا رومال اجل رسیدہ ساہوکار کی گردن میں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ میں مافوق فطرت آ گئی ہے۔ میں نے اس کے تڑپنے پھڑکنے کی مطلق پرواہ نہ کی اور رومال کو ایک جھٹکا دے کر مروڑنا شروع کر دیا۔ دو منٹ کے بعد بیچارہ وہیں ڈھیر ہوگیا' لیکن میں رومال کو پھر بھی کھینچے ہی گیا۔ میرے پاؤں اس کے سینے پر تھے اور ہاتھ گردن پر۔ میرا جسم حدت سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ فربہ اندام شخص کب اس دنیا

سے رخصت ہوگیا۔ اس وقت اگر اس جیسے سو ساہوکار بھی ہوتے تو میں انہیں جہنم واصل کر دیتا۔ میرے ان خیالات کا سلسلہ والد صاحب کے اس فقرہ نے ختم کر دیا "شاباش بیٹے' ایں کار از آید و مرداں کنند' اب چل کر اپنے مقتول کی قبر بھی دیکھ لو"۔

میں ایک بے جان قالب کی طرح ان کے ساتھ ہو لیا اور دریا کے کنارے دور جا کر ایک لغائی سے دریافت کیا کہ وہ جگہ کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ آگے جھاڑیوں میں ہے' لیکن آپ کو وہاں تک گھٹنوں کے بل چلنا ہوگا۔

"اونہہ پرواہ نہیں" آگے چلے تو دیکھا کہ درختوں' جھاڑیوں اور بیلوں نے مل کر ایک قسم کا دروازہ سا بنا دیا ہے' جس میں بمشکل دو آدمی گزر سکتے ہیں' لیکن آگے چل کر یہ راستہ اور بھی تنگ و تاریک ہوگیا تھا۔ اب بغیر اس کے کہ جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر کھسکیں' چارۂ کار نہ تھا۔ اسی جگہ وہ قبر تھی جس میں ساہوکار اور اس کے ساتھی ہمیشہ کی نیند سونے والے تھے۔ دو چار لغائی اس کے گرد بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے اور مٹی چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ والد صاحب ان کے سردار سے مخاطب ہو کر بولے "شاباش' تم نے جگہ تو ایسی تلاش کی ہے کہ صحرا کے گیدڑ بھی اس کو تلاش نہیں کر سکتے۔ جب حصہ رسدی تقسیم ہوگا تو تمہیں اس کا بھی حصہ دیا جائے گا۔ اچھا اب جلدی کرو' صبح ہونے ہی والی ہے"۔

اسی وقت ساہوکار اور اس کے ہمراہیوں کی لاشیں بھی آ گئیں اور ان کو اس گڑھے میں ڈال کر پہلے پتھر' پھر خس و خاشاک اور اوپر سے مٹی ڈال کر پاٹ دیا گیا' جس کے بعد سطح برابر کرنے کے لیے اوپر سے ریت بھی چھڑک دی گئی۔

پیر خاں نے اس کام سے فراغت پا کر کہا "دیکھو صاحبزادے' ہم اپنے کشتوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں"۔

میں نے اس کے جواب میں کہا "اگر اب یہ کام میرے سپرد کیا جائے تو میں بھی اسے اسی خوبصورتی سے انجام دے سکتا ہوں"۔

(ص ۳۴ - ۳۶)

ــــــــ (۳) ــــــــ

امیر علی کے چلے جانے کے بعد میں اپنے دل میں غور کرنے لگا کہ یہ واقعات انسانی زندگی کی کتاب کا کتنا عجیب و غریب باب ہے۔ یہ شخص جو سینکڑوں مرتبہ قتل عمد کا مرتکب ہوچکا ہے' اپنے جرائم کو کس خوشی اور اطمینان سے بیان کر رہا ہے۔ نہ کسی قسم کا اظہار افسوس ہے نہ ندامت' بلکہ ان پر فخر کرتا ہے۔ پوری داستان میں صرف دو مرتبہ اس نے اپنے پیشے کی مذمت کی ہے' ورنہ ہر جگہ انداز تفاخر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقتاً ان سب کو اپنا کارنامہ سمجھتا ہے۔

زمانہ آدم علیہ السلام سے آج تک زیر آسمان ہر ملک میں قتل کی لاکھوں وارداتیں ہوچکی ہیں' کوئی روپیہ کی محبت میں' کوئی تنفر' حسد' محبت' انتقام' رفاقت یا خوف کی وجہ سے اس جرم کا مرتکب ہوا' لیکن ابتداء سے اب تک قاتل کی زندگی بیشتر رنج و آلام میں گزری۔ اس کا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہا اور انجام کار یا تو اس نے اپنے آپ کو قاتلوں کے سپرد کر دیا یا خودکشی کرلی ورنہ اس غم میں گھل گھل کر ہلاک ہوگیا۔ ہم نے کتابوں میں بھی یہی پڑھا اور تجربہ میں بھی یہی آیا۔ لیکن ٹھگوں کا طبقہ عجیب و غریب ہے۔ نہ ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا ہے' نہ نفس لوامہ ہی کچھ بولتا ہے۔ اگر انہیں قید کر دیا جائے تو نہایت آزادی سے کھاتے پیتے ہیں' ساتھیوں کو اپنے کارناموں کی داستان سناتے اور اس بات پر تیار رہتے ہیں کہ ادھر جیل سے چھوٹیں اور ادھر پھر اپنے کام میں لگ جائیں۔ ان کے متعلق سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں قدم بقدم چلتے ہیں اور ایک ہی قسم کے توہمات میں مبتلا ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں تو کسی دیوی کی پرستش کرنا اور اسے ماننا چنداں تعجب خیز نہیں' مگر مسلمانوں کا اس قسم کا لائحہ عمل اختیار کرنا ایک چیستان کی حیثیت رکھتا ہے' خصوصاً جبکہ وہ صوم و صلوۃ کے پابند ہوں۔ ان کے قرآن میں تو قتل عمد کے متعلق سخت تعزیری احکام موجود ہیں۔

امیر علی اور اس کا باپ دونوں پابند شرع مسلمان ہیں۔ دونوں روزہ نماز کے پابند ہیں مگر دونوں ہی نہایت سفاک قاتل اور بے رحم انسان ہیں۔ قیدخانہ کا محافظ کہتا ہے کہ امیر علی ایک بھلا آدمی ہے۔ اس کی صورت اور اطوار سے شرافت ہویدا ہے۔ وہ

اپنے مذہب کا بے انتہا پابند ہے۔ محرم میں مرثیہ پڑھتا اور ماتم کرتا ہے' نماز کبھی قضا نہیں ہوتی' اسی طرح رمضان میں مسلسل روزے رکھتا ہے اور عقبیٰ کا طلبگار ہے' لیکن اگر واقعتاً دیکھا جائے تو وہ ایک قاتل ہے' جس کے سامنے دنیا کے تمام قاتل ہیچ ہیں۔

ناظرین یہ بھی کہتے ہوں گے کہ امیر علی کے متعلق ہمیں اتنا کچھ سننے کے بعد بھی کوئی علم نہ ہوسکا اور ہم اپنے ذہن میں اس کی شخصیت کا کوئی صحیح نقشہ قائم نہیں کر سکے۔ یہ واقعی ایک بڑی فروگذاشت ہے اور شکر ہے کہ مجھے جلد ہی اس کا احساس ہوگیا۔ چنانچہ میں ذیل میں اس کا مختصر حلیہ بیان کرتا ہوں۔

وہ ایک درمیانہ قامت شخص ہے ور اس کا قد انگریزی پیانہ سے ۵ فٹ ۷ انچ ہے۔ تن و توش کے لحاظ سے اکہرا جسم رکھتا ہے۔ عمر تقریباً چالیس یا زیادہ سے زیادہ پینتالیس سال ہوگی مگر داڑھی یا مونچھ کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا' حالانکہ وہ کافی عرصہ جیل میں رہ چکا ہے (گویا قید نظربندی کی حیثیت رکھتی ہے) اس کا بدن حد درجہ لوچدار' مضبوط اور قوی ہے۔ ہاتھ زیادہ لمبے طاقتور ہیں۔ اپنے لباس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ باوجود اس کے کہ کافی عرصہ جیل خانہ میں گزار چکا ہے' لیکن ان پر کبھی کوئی داغ دھبہ نظر نہیں آتا۔ اس ملک کے لوگوں میں وہ ایک حسین شخص متصور ہوتا ہے اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عظیمہ اس پر بجا طور پر عاشق ہوئی۔ اس کے دانت نہایت صاف' چمکدار اور نوکیلے ہیں اور مونچھیں تو اتنی شاندار ہیں کہ ان پر ہمارے اکثر فوجی حسد کرتے ہیں' لیکن ان میں سب سے زیادہ قابل رشک اس کا چوڑا چکلا سینہ ہے جو پتلی کمر پر بہت زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی وہ ایک شریف النفس اور بلند پایہ مسلمان نظر آتا ہے۔ میں اکثر عمائدین سے ملتا رہتا ہوں اور اپنے اس تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ امیر علی سے زیادہ خوش اخلاق ہرگز نہیں۔ اردو نہایت شستہ بولتا ہے۔ وہ جگہ جگہ فارسی کے مصرعے اور اشعار چپاں کرتا ہے۔ اپنے طرز بیان پر اس کو ناز ہے جو غیرواجبی نہیں کہا جا سکتا۔

ناظرین اگر آپ ان تمام باتوں کو ایک ذات واحد میں مجتمع کر دیں تو امیر علی کی

اصل تصویر آپ کے سامنے آ جائے گی اور پھر اس کو دیکھ کر آپ بمشکل یقین کر سکیں گے کہ یہ ایک پیشہ ور قاتل ہے' جو اپنے اس مختصر دور حیات میں سات سو سے زیادہ انسانوں کو قتل کر چکا ہے۔

جس وقت میں یہ سطور لکھ رہا تھا' حسن اتفاق سے امیر علی بھی آ گیا۔ میں نے اس کو مندرجہ بالا بیان پڑھ کر اور اردو ترجمہ کر کے سنایا تو اپنا حلیہ سن کر بے حد خوش ہوا' لیکن پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "صاحب آپ میرے دل کو آلودہ سمجھتے ہیں؟"

"یقیناً"۔

"لیکن یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ کیا میں دوسرے انسانوں کی طرح اپنے بیوی بچوں سے محبت نہیں رکھتا۔ کیا مجھے عظیمہ کی موت کا صدمہ نہیں ہے۔ میرے پہلو میں بھی اور لوگوں کی طرح محبت بھرا دل ہے جو عزیزوں' دوستوں اور ہم مشربوں کی خوشی پر خوش اور صدمات پر رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ میرا برتاؤ ہر ایک سے شریفانہ ہے۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جو میری عزت پر حملہ کرتا ہو؟ کیا میں نے کبھی کسی دوست یا دشمن سے دغا کی ہے۔ خلاف مذہب کبھی کوئی کام کیا تھا یا کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے"۔

"لیکن امیر علی ان سات سو وارداتوں کے متعلق کیا کہتے ہو جن کا خود تم کو اعتراف ہے اور جن میں سے بعض کو میں اب تک تحریر کر چکا ہوں"۔

"(ہنس کر) یہ دوسرا ہی معاملہ ہے۔ اسے مشیت ایزدی کہتے ہیں۔ ان لوگوں کی موت اگر میرے ہاتھ سے نہ لکھی ہوتی تو ایک نہیں ہزاروں رومال ان کی گردن میں ڈالے جاتے۔ میرے دست و بازو میں دس ہاتھیوں کی طاقت ہوتی مگر ان کا بال تک بیکا نہ ہو سکتا۔ یہ تو سب خدائی کرشمے ہیں۔ جس کی موت جس طرح لکھ دی گئی' اسی طرح آئی ہے۔ لیکن آپ لوگ دوسری ہی طرح سوچتے ہیں' اس لیے میرا کچھ کہنا اس بارے میں بے سود ہے"۔

"اچھا تو اب اپنی بقیہ داستان بھی سنا ڈالو' تاکہ اس کو بھی تحریر میں لے آؤں"۔

(ص ۷۷ - ۷۹)

——— (۴) ———

صاحب! میں بیان کر چکا ہوں کہ بدری ناتھ اور دوسرے ٹھگوں نے پورب کا سفر کیا اور واپس نہ آ سکے۔ میں ان کے آمادہ کرنے پر بھی ساتھ نہ گیا۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جس شخص کی موت آتی ہے وہ اس کی طرف خود دوڑ کر جاتا ہے۔
اب بدری ناتھ اور سرفراز خاں کی جگہ خالی ہوئی تو میر خاں اور موتی رام کو ترقی مل گئی۔ مجھے گھر سے نکلے دو سال ہو چکے تھے' اس لیے یہ طے ہوا کہ ہماری جماعت دکن کی طرف جائے اور دکن کے مفصلات تک بیخ ڈھونڈتی رہے۔ ہمارا اندوختہ بھی چونکہ قریب الاختتام تھا' اس لیے والد صاحب نے بھی اجازت دے دی' لیکن وہ خود اس سفر پر جانے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔

ہماری جماعت پچاس نوجوان ٹھگوں پر مشتمل تھی اور میں ان کا سردار تھا۔ دسہرہ سے چند روز قبل ہم نشانی لینے کے لیے گاؤں کے باہر ایک پیڑ کے نیچے جمع ہوئے۔ اس مجلس میں والد صاحب اور حسین علی بھی موجود تھے اور انہوں نے ہی نشانیاں لیں۔ میں اب بھی ان کا قائل نہ تھا لیکن چونکہ اور سب توہم پرست تھے' اس لیے چنداں تعرض بھی نہ کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ دیوی نے اجازت دے دی اور والد صاحب نے مجھے سربراہ مقرر کر کے ہر ٹھگ سے فرداً فرداً میری اطاعت اور فرمانبرداری کا حلف لیا اور سب نے مقدس قبر پر قسم کھائی۔

اس کے بعد میں نے سفر کا مقصد بیان کیا اور ایسی لچھے دار تقریر کی کہ ہر شخص کو بے شمار مال غنیمت ملنے کی امید بندھ گئی۔

عظیمہ سے رخصت ہونے اور سفر کو جانے کے لیے میں نے تجارت کا بہانہ بنایا۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس نے اول تو مجھے روکنے کی بے انتہا کوشش کی اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو خود مع بچہ کے روانگی پر تیار ہو گئی لیکن اس میں بھی کامیاب نہ ہوئی۔ راہ کے مصائب و خطرات' چھوٹے بچہ کا ساتھ معقول دلائل تھے' جس کے آگے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ آخر مجھے رخصت کرتے ہی بن پڑی اور رو دھو کر چپ ہو گئی۔

اب پھر نشانی لی گئی اور اس مرتبہ بدری ناتھ کا پارٹ موتی رام نے ادا کیا' جس کو باقاعدہ نشانی بردار بنا دیا گیا تھا۔ کچھ دور تک والد صاحب اور حسین ہمارے ساتھ گئے اور راستے بھر اپنے تجربات سناتے اور نصیحت کرتے رہے۔ انہوں نے عورتوں کے متعلق سخت تہدیدی حکم دیا کہ ان پر ہرگز ہاتھ نہ ڈالا جائے کیونکہ اول تو وہ کمزور بھی ہوتی ہیں اور دوسرے یہ کہ بھوانی خود بھی عورت ہے اور وہ اپنے ہم جنس کا قتل پسند نہیں کرتی۔

میں نے کہا کہ میں خود کسی عورت پر ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ جن لوگوں نے عورتوں پر ہاتھ ڈالا وہ دیوی کے معتوب ہوگئے۔ چنانچہ سرفراز خان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

"لیکن اس کا کچھ زیادہ خیال نہ کرنا کیونکہ اگر ایسی مجبوری آ پڑے تو اس کا بنج بھی حلال ہو جاتا ہے' اس لیے کہ دیوی اپنے پرستاروں کو عورتوں سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ حسین نے مجبوراً کئی عورتوں کو ہلاک کیا ہے مگر بھوانی اس سے مطلق ناراض نہیں ہوئی کیونکہ اسے ہماری مجبوری کا علم تھا"۔

گاؤں سے نکل کر ہم اپنی راہ پر ہو لیے اور والد صاحب اور حسین واپس آ گئے۔

ٹھگوں کا دستور تھا کہ مکان سے نکلنے کے بعد جب تک انہیں کوئی شکار نہ مل جاتا' نہ بال بنواتے' نہ ہی پان کھاتے۔ اس لیے ہم بنج کی تلاش میں بڑی کاوش کر رہے تھے۔ ہمیں دو تین شکار ملے بھی مگر چونکہ ان میں عورتیں شامل تھیں' اور ان کے قتل سے میں نے توبہ کی تھی' اس لیے ان سے تعرض نہ کیا گیا۔ البتہ پانچویں روز ہم کو ایک عمدہ اسامی ہاتھ آ گئی۔

اس دن ہم صبح ایک چوراہے پر پہنچے اور یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے کہ دور سے ایک مسافروں کی جماعت' جو نو افراد پر مشتمل ہے' ہماری طرف آ رہی ہے اور خوش قسمتی سے ادھر ہی کو مڑ رہی ہے جدھر ہم کو جانا تھا۔ جب ہم ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ جبل پور کو یہی راستہ جاتا ہے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں تو ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ ہم نے

ان کو یہی بتایا کہ سپاہی ہیں اور چھٹی ختم ہونے پر ناگپور واپس جا رہے ہیں۔ اپنے متعلق انہوں نے بتایا کہ ہم تاجر ہیں اور کپڑا خریدنے بنارس جا رہے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ ان کے پاس یقیناً کافی روپیہ ہوگا اور چونکہ ابھی تک کسی نے ان کو ہمارے ساتھ نہیں دیکھا' لہٰذا ان کی ہلاکت پر ہمیں کوئی مجرم نہ گردانے گا۔ لیکن ان کو فوراً ٹھکانے لگانا ضروری تھا' چنانچہ میں نے میر خان سے اس کا ذکر کیا اور اس نے کانوں کان یہ خبر سب تک پہنچا دی' جس کے بعد ہر ٹھگ نے اپنی اپنی جگہ لے لی۔

سڑک ہماری دیکھی بھالی تھی۔ صاحب ہمارے پیشہ کے واسطے لازمی ہے کہ ہم راستہ کے چپہ چپہ سے واقف ہوں۔ ہم چونکہ پیشتر اسی راہ سے گئے تھے' اس لیے اس کے ہر گوشہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس کا بھی علم تھا کہ آگے چل کر ایک دریا ہے' جس کے کنارے بکثرت جھاڑیاں ہیں' اس لیے وہاں بھیل کھودنا بھی آسان تھا۔

اس جگہ پہنچ کر ہم نے ایک گھنٹہ قیام کیا۔ گھوڑوں کو پانی پلایا اور خود بھی ناشتہ کیا۔ لیکن ٹھگ بدستور اپنی ڈیوٹی پر تعینات رہے۔ انہوں نے اپنے رومال نکال لیے تھے اور میں اشارہ دینے ہی والا تھا کہ دور سے ایک جماعت نظر آئی جو چودہ افراد پر مشتمل تھی' لیکن وہ نکلی چلی گئی۔ ہمارے ساتھی بھی ان کے ہمراہ جانا چاہتے تھے مگر میں نے دانستہ دیر کر دی' حتیٰ کہ وہ لوگ بہت دور نکل گئے۔ اب چونکہ کوئی خطرہ نہ تھا' اس لیے میں نے "تمباکو لاؤ" کا معنی خیز جملہ کہہ دیا اور فوراً ہی میرا رومال اپنے شکار کی گردن میں جا اٹکا۔ میرا خیال تھا کہ تین سال سے مشق چھوٹی ہوئی ہے' ممکن ہے کوئی دشواری ہو۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ چشم زدن میں سب کام ہوگیا۔ ہم لوگ روپیہ کی تلاش میں ان کی جیبیں اور کمر ٹٹول رہے تھے کہ دو مسافر خدا معلوم کہاں سے آ پہنچے۔ ہمارا یہ شغل دیکھ کر ان کی رگوں میں خون جم گیا اور وہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ میں نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے ان سے کہا کہ تم نے ہمارا راز پا لیا ہے' اب بجز دو صورتوں کے تیسری ممکن نہیں۔ یا تو تم بھی ہماری طرح ٹھگ بن کر ہمارے گروہ میں شامل ہو جاؤ ورنہ پھر ہم تمہیں بھی ان مردوں میں شامل کر دیں گے۔

ایک بولا "ہرگز نہیں، تلک سنگھ اور ٹھگ بنے، توبہ کرو۔ مرنا برحق ہے، اس پر بخوشی آمادہ ہوں، لیکن بہادری سے لڑ کر مرنا چاہتا ہوں۔ جو شخص سب سے زیادہ تلوار کا دھنی ہو، میرے مقابلہ میں آ جائے"۔

"چلو میں ہی تم سے مقابلہ کر لوں گا"۔

"ارے تم کل کے لونڈے اور تلک سنگھ سے مقابلہ، کیوں موت کو دعوت دیتے ہو"۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ برابر کی جنگ ہے، تم مداخلت نہ کرنا۔ رہ گیا دوسرا شخص، اس کو جس طرح چاہو ہلاک کرو، چنانچہ آنکھ جھپکتے میں ڈھیر کر دیا گیا۔

صاحب میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں اسلحہ کے استعمال میں کسی سے کم نہیں اور سبزی خان جیسے شخص نے بھی میری تلوار کی تعریف کی تھی۔ مجھے اپنے مدمقابل پر صرف اتنی فضیلت حاصل تھی کہ اس کے پاس ڈھال نہ تھی مگر اس کی طاقت، جسمانی ساخت اور سب سے بڑھ کر تجربہ میری تمام افضلیت پر بھاری تھا۔ اجنبی نے پہلا وار کیا اور برابر کیے گیا۔ میں نے ان سب کو ڈھال پر لیا اور داغی کھیل کھیلتا رہا۔ یہ دیکھ کر وہ بولا "ارے کافر، تجھے تلوار چلانی آتی ہے یا خواہ مخواہ لڑنے کا ڈھونگ رچا رہا ہے؟"

"کافر کے بچے! یوں سمجھ کہ ان الفاظ نے تیری قسمت پر مہر کر دی"۔ یہ کہہ کر میں نے اچانک اس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ اور چونکہ وہ پچھلے تجربہ کی بنا پر اس کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے میری تلوار اس کے سینہ سے گزرتی ہوئی پار ہو گئی اور وہ تلک سنگھ خاک پر ڈھیر ہو گیا۔

میر خاں یہ صورت حال دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور کہنے لگا "میر صاحب، آپ بھٹوٹ بھی اچھے ہیں اور سپاہی بھی۔ ہم نے اپنی عمر میں کسی ٹھگ کو اس طرح میدان میں لڑتے اور ایک راجپوت کو قتل کرتے آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ ان معرکوں میں ہمیں اتنا روپیہ مل گیا کہ بعض تو کہنے لگے کہ اب آگے جانے کی ضرورت نہیں، لیکن چونکہ کثرت رائے اس کے خلاف تھی اور میں خود بھی اتنی قلیل رقم پر قناعت نہ کر

سکتا تھا' اس لیے یہی طے پایا کہ آگے بڑھنا چاہیے۔ چنانچہ ہم بغیر کسی مزید مہم کے ساگر جا پہنچے۔

ساگر ایک مشہور تجارتی مقام اور ایک مالدار شہر ہے۔ یہاں ہم نے حسب معمول بستی سے باہر قیام کیا اور اپنے آدمیوں کو اندر بھیج کر مسافروں کی خبریں منگوائیں۔ اس شہر میں پیر خاں ایک بھٹیارے سے واقف تھا اور چونکہ ہم ہمیشہ اس کی جیب گرم کر دیا کرتے تھے' اس لے وہ بھی ہمیں آنے جانے والوں کی خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔ پیر خاں نے اس سے معلوم کیا کہ ایک مشہور ساہوکار عنقریب دکن کی طرف جانے والا ہے' لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہماری جماعت کو ایک آدھ منزل آگے جا کر انتظار کرنا چاہیے تاکہ اسے کچھ شبہ نہ ہو جائے۔

میں نے اس رائے کو پسند کیا اور تین آدمیوں کو اطلاع دینے کے لیے چھوڑ کر باقی لوگ آگے بڑھ گئے۔

(ص ۷۹ - ۸۱)

(۵)

تین روز تک ہم خاموشی سے سفر کرتے رہے اور جگہ جگہ شگون لیتے رہے۔ سب فالیں مبارک نکلیں۔ چوتھے روز ساہوکار خود ہم تک پہنچ گیا۔ بھکاری اس کے ساتھ تھا۔ سڑک پر اس طرح ملاقات ہوئی گویا ہم بھی مسافر ہیں اور ایک ہی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے بڑا اچھا لباس پہن رکھا تھا۔ گھوڑا بھی شاندار تھا اور بادی النظر میں سپاہیوں کا جمعدار معلوم ہوتا تھا۔ ساہوکار نے مجھ سے منزل کا پتہ نشان معلوم کیا۔ مقصد سفر کی بات کی اور وہی سب کچھ بیان کیا جس کی مصلحت وقتی تھی۔ چنانچہ وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔ وہ بھی ایک بذلہ سنج' ہنس مکھ آدمی تھا اور راستہ میں خوب خوب لطیفے اور چٹکلے ہوتے رہے۔ صاحب آپ کو علم نہیں کہ ہم ہندوستانی سفر میں کتنی جلدی گھل مل جاتے ہیں۔ راستہ کی تکان اور تکلف سب بات چیت میں فراموش ہو جاتی ہے۔ پہلی ہی منزل میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں کا ساتھ ہے اور ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ شام کو جب ہم ایک گاؤں میں پہنچے تو دونوں

نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ وہ تو بستی کے اندر چلا گیا اور ہم نے باہر ہی ڈیرے ڈال دیے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا، دیر کی ضرورت نہیں، کل جمعہ کا مبارک دن ہے، کام ہو ہی جانا چاہیے—— لغائی رات ہی سے روانہ کر دیے گئے تاکہ مناسب جگہ تجویز کرلیں اور قبر تیار ملے۔ علی الصبح ہی ساہوکار کا آدمی یہ کہنے آیا کہ تیار ہو جایئے، جتنی جلدی روانہ ہو جائیں اچھا ہے۔ یہ بھی کہا کہ ساہوکار جی ٹھگوں سے بہت ڈرتے ہیں اور ابتداء ہی سے بڑے مشکوک تھے، لیکن جب سے آپ لوگوں کا ساتھ ہوا ہے، بڑے خوش اور مطمئن ہیں اور جمعدار صاحب آپ کی تو بے حد تعریف کرتے ہیں۔

جس وقت ہم لوگ روانہ ہو رہے تھے تو ایسا شگون نظر آیا کہ سب کے دل خوش ہوگئے اور انہوں نے "جے بھوانی، جے امیر علی" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ پھر جب ہم منزل کی طرف روانہ ہوئے تو ساہوکار کہنے لگا "رام رام، آپ سے مل کر دل کو بے حد اطمینان و سکون ہوگیا۔ یہ تو بھگوان کی کرپا ہے کہ اس نے خود ہی آپ کو ہماری حفاظت کے لیے بھیج دیا"۔ اس وقت تک ہم سب لوگوں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی اور بھیل کا انتظار کر رہے تھے۔ صاحب ایسے وقت میں ہمارے اوپر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ شکار کے متعلق فکر ہوتی ہے نہ رحم کے جذبات، جو کچھ ہم کرنے والے ہیں، اس پر خفت نہ ندامت، صرف ایک خیال ہوتا ہے کہ کام خوش اسلوبی سے پورا ہو جائے اور گزرنے والے مسافروں کی طرف سے کوئی خلل اندازی نہ ہو۔ میں گو اب تک سخت دل ہوچکا تھا، لیکن پھر بھی میرا دل بے اطمینانی کے باعث دھڑک رہا تھا۔ ساہوکار برابر مذاق کیے جا رہا تھا مگر میرے جوابات بہت مبہم سے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ میری توجہ تو اب کسی اور معاملہ پر مرکوز تھی۔ اس نے میری اس حالت کو سمجھنے کی کوشش کی، جس پر میں بھی ہوشیار ہوگیا اور اس کی باتوں کا مناسب جواب دینے لگا، لیکن پھر بھی وہ کہہ ہی اٹھا "میر صاحب، آج آپ نے سوتے سے اٹھ کر کس منحوس کا چہرہ دیکھا ہے کہ یوں خاموش ہیں"۔

"ابھی چہرہ وہرہ تو کسی کا نہیں دیکھا' بات یہ ہے کہ گھر یاد آ رہا ہے"۔

"واہ میر صاحب' آپ نے پتہ کی بات کہی۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ اگر روزی کا سوال نہ ہوتا تو کبھی سفر نہ کرتا۔ ایک مہینہ سے اسی چکر میں مبتلا ہوں' جب کبھی جوتشی جی سے پوچھا' اس نے سفر کو نحس ہی بتایا لیکن آخر کب تک ــــــ روانہ ہونا ہی پڑا۔ اب خدا مجھے اور آپ کو چوروں' ڈاکوؤں اور ٹھگوں سے محفوظ رکھے اور ہم بخیریت گھر واپس پہنچ جائیں"۔

میں نے بڑے زور سے "آمین" کہا اور سوچ کر بولا "ہم سپاہیوں کو تو جان ہتھیلی پر رکھ کر پھرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ آپ نے کیا کہا کہ راستے میں ٹھگ ہوتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

"میر صاحب ان کے متعلق صحیح بات تو کسی کو بھی معلوم نہیں' مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ ناواقف مسافروں کو پھانس لیتے ہیں اور پھر ہلاک کر دیتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ان کے ساتھ حسین عورتیں ہوتی ہیں' جو لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں اور انہیں لوٹ لیتی ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ان کے پاس کچھ ایسے ٹونے ٹوٹکے ہوتے ہیں کہ انسان ان کا گرویدہ ہو کر اپنا سب کچھ خود ہی ان پر نثار کر دیتا ہے اور پھر وہ ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے اور خود بھی ٹھگ بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا اگرچہ پتہ نہیں چلتا لیکن ہیں ضرور' کیونکہ بہت سے مسافر راستے ہی میں نامعلوم طریقہ سے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر کسی کو علم نہیں ہوتا کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا"۔

میں نے سینہ ٹھونک کر کہا "کسی کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ مجھے تو بدمعاشوں کا قیمہ کر دینے ہی میں لطف آتا ہے۔ میرا قزاقوں سے ایک دو مرتبہ سابقہ پڑ چکا ہے مگر وہ سب میری تلوار کے گھاٹ جا اترے"۔

اتنے میں لغائی واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں نے خود ہی کہا "ارے تو یہاں کہاں سے آ گیا"۔

وہ کہنے لگا "میر صاحب' ہمیں اشنان کرنا تھا اس لیے پہلے ہی سے دریا پر آ گئے۔ میرے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا' اس لیے یہاں باقی سب نہانے چلے گئے"۔

صاحب آپ کو ان الفاظ سے کچھ بھی معلوم نہ ہوسکے گا' لیکن اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ دریا نزدیک ہی تھا' اسی کو مقام موعود منتخب کیا گیا تھا۔ قریب ہی خاردار جھاڑیوں کا ایک پرفضا کنج تھا' وہیں ہمیں ڈیرے ڈالنے اور کام کو اختتام تک پہنچانا تھا' چنانچہ کنارے پہنچ کر ہم سب اتر پڑے۔ میں بھی منہ دھونے' مسواک کرنے اور دانت مانجھنے کے لیے سیٹھ کو ایک اچھی سی جگہ لے گیا اور فوراً ہی جھرنی دے دی اور سب کے سب شاخ مردہ کی طرح زمین پر آ رہے۔ سیٹھ تو فوراً ہی ٹھنڈا ہوگیا' دوسرے کچھ دیر تڑپتے رہے لیکن اس دوران میں دو مسافر دور سے آتے نظر آئے۔ ہم نے لاشوں پر اس طرح چادریں ڈال دیں جیسے سو رہے ہوں۔ میں نے میر خاں سے کہا کہ انہیں نکل جانے دو مگر وہ ایک ہی کھاگر تھا' کہنے لگا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہمارے متعلق شبہ نہ ہوگا۔ میر صاحب مردے کو لوگ دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ دراصل یہ بھی ہمارے توبخ ہیں اور دیوی نے انہیں ہماری گود میں ڈال دیا ہے اور وہ دیکھئے ہمارے دو آدمی فوراً ہی ان تک پہنچ گئے ہیں"۔

میں بھی مرضی مولا از ہمہ اولیٰ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ میر خان ان کے پاس جا کر پوچھنے لگا "اگلا پڑاؤ کتنی دور ہے۔ آپ لوگ وہاں سے کب روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ہم تو سب سویرے چل پڑے تھے اور چودہ میل نکل آئے ہیں' لیکن دھوپ تیز ہو رہی ہے اور ابھی ہمیں کافی راستہ طے کرنا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ پیر خان نے انہیں روکا اور دوسرے مسافروں کے متعلق دریافت کرنے لگا جو ان کے پیچھے آ رہے تھے۔

میں نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "تمہیں چاہیے کہ بیٹھ کر ان کا انتظار کرو ورنہ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا"۔ اس پر وہ کچھ چونکا اور کہنے لگا "تم ڈاکو معلوم ہوتے ہو۔ اچھا جو کچھ ہمارے پاس ہے' سب لے لو اور ہماری جان چھوڑو"۔

میر خان کہنے لگا "تمہارا خیال غلط ہے' ہم ڈاکو نہیں ہیں' ذرا اطمینان سے بیٹھ جاؤ"۔

دوسرا شخص کچھ ہوشیار تھا' بول پڑا "ہو نہ ہو' یہ لوگ ٹھگ ہیں"۔

میں نے بھی جرات سے کہا "سچ کہتے ہو' ہم ٹھگ ہی ہیں۔ دیکھو سامنے پانچ

لاشیں پڑی ہیں اور ابھی ان میں دو کا اور اضافہ ہونے والا ہے۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں اور ان سے مفر نہیں"۔

صاحب، مجھے ان ناکردہ گناہ لوگوں کے حال پر بہت رحم آیا۔ کہاں آکر خواہ مخواہ پھنس گئے۔ میں تو وہاں سے کھسک گیا' لیکن بعد میں سوچتا رہا کہ اگر میرے ساتھیوں کو میری اس کمزوری کا علم ہو جاتا تو مجھے سرداری سے فوراً علیحدہ کر دیتے"۔

میر خان ان کے پاس چلا گیا اور نہایت سختی سے کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ پھر کہا کہ اپنی اپنی گردنیں آگے بڑھاؤ اور جس طرح قصائی کسی گائے کو چھری کے ایک وار سے ذبح کر ڈالتا ہے' اس طرح اس نے ان کو ہاتھ کی ایک معمولی سی جنبش سے ختم کر دیا۔ میں ابھی اس تماشا کو دیکھ ہی رہا تھا کہ بدقسمتی سے دو مسافر اور آپہنچے۔ ان میں ایک جوان تھا اور دوسرا بوڑھا۔ پہلے کو میں نے اپنے واسطے منتخب کیا اور جیسے ہی وہ میرے پاس سے گزرا' میں نے رومال اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔ یہی حال دوسرے کا ہوا۔ ساری لاشیں ایک ساتھ ہی ٹھکانے لگا دی گئیں اور ہم پھر لباس پارسائی پہن کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کو ایک جگہ بیٹھ کر اطمینان سے سامان کی تلاشی لی گئی تو ساہوکار کے قبضے سے چار ہزار تین سو روپے برآمد ہوئے جو ایک معقول رقم تھی۔ اس کے علاوہ قیمتی شالیں اور ریشمی تھان اور نہ معلوم کیا کیا تھا' جو سب مساوی طور پر تقسیم کر لیا گیا۔ باقی چار مسافروں کے قبضہ سے سو' سوا سو روپیہ ملا اور اس کے بھی حصے بخرے ہو گئے۔

(ص ۸۵ - ۸۷)

(۶)

ایک ٹھگ کے اعترافات

فینی پارکس ایک انگریز عورت تھی، جس نے ہندوستان میں قیام کے دوران اپنے مشاہدات کو Wandering of a Pilgrim in Search of the Picturesque کے عنوان سے لکھا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۰ء میں انگلستان سے چھپا تھا، اور دوسری بار اسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے کراچی سے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ اپنے قیام کے دوران فینی پارکس کو ٹھگوں کے بارے میں بھی علم ہوا۔ اس نے "ایک ٹھگ کے اعترافات" کو اپنی کتاب میں شائع کیا ہے، اس سے ٹھگوں کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔

✣

میرا باپ بھڑائچ اور ہمسایہ گاؤں کے اندر بطور کاشتکار کام کرتا تھا۔ میں نے بھی اس پیشہ کو اختیار کر لیا، لیکن جب میں تیس سال کا ہوا تو میں نے ٹھگوں کے ایک گروہ میں شمولیت اختیار کر لی اور ان کے ساتھ میرا تعلق اس وقت سے اب تک تھا، یعنی سب ملا کر تقریباً تیس سال۔

اس عرصہ میں، میں ان کے ساتھ ہر مہم پر تو نہیں گیا، اور کبھی دو، تین یا چھ سال تک میں اپنی زمین پر زراعت میں مصروف رہا۔ میں نے ان کے ساتھ چھ لوٹ مار کی مہمات میں شرکت کی، چار سردار کی نگرانی میں، جس کا نام اودے سنگھ تھا، اور

جو کہ اب مر چکا ہے اور دو مکھن جمعدار کے ساتھ کہ جو میرا موجودہ سردار ہے' اور میرے ساتھ جیل میں ہے۔

ایک مرتبہ جب کہ کچھ مہمات سے فارغ ہو کر میں کاشتکاری میں مصروف تھا کہ اسی دوران مجھ پر شبہ ہوا کہ میرا ٹھگی کے پیشہ سے تعلق ہے' لیکن چونکہ میں زراعت اور کھیتی باڑی بھی کرتا رہتا تھا' اس لیے میرے خلاف کافی ثبوت پیش نہیں کیے جا سکے اور مجھے چھوڑ دیا گیا۔

بعد میں میرے حالات اس قدر خراب ہوئے کہ مجھے پیسہ کے لیے مکھن جمعدار کے پاس سلانے جانا پڑا۔ میری پریشانی کے باوجود مکھن جمعدار نے مجھے پیسے دینے سے انکار کر دیا اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنے بیوی بچوں کو اس کے پاس سلانے لے آؤں اور خود اس کے ساتھ ٹھگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤں۔ میں اپنی حالت کی خرابی کی وجہ سے اس کی شرائط ماننے پر تیار ہوا' اور اس طرح میں اس کے ساتھ آخری دو مہمات میں شریک ہوا۔

جس وقت کہ میں اودے سنگھ کی ملازمت میں تھا' پورے ملک میں انتشار اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی' اس لیے ہماری مہمات دور کے علاقوں میں نہیں ہوتی تھیں' ان سے ہمیں بہت زیادہ منافع بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ ملکی صورت حال کے تحت وہ لوگ' جن کے پاس دولت تھی یا تو وہ سفر ہی نہیں کرتے تھے اور اگر باہر نکلتے تھے تو مسلح حفاظتی دستوں کے ساتھ' اور پھر ہمیں خود پنڈاریوں اور دوسرے مسلح ڈاکوؤں کے جتھوں سے بھی ڈر لگتا تھا۔

مکھن کے گروہ میں شامل ہونے کے تین مہینے بعد' ہم چالیس آدمیوں کی جماعت بندھیل کھنڈ سے مارچ ۱۸۲۶ء میں دکن کی جانب روانہ ہوئی۔ ہم لوگ راستے میں ٹھہرتے ہوئے چیپانیر گھاٹ پر نربدا دریا کو عبور کرتے ہوئے چھوٹے جمعدار سے ملے' جس کے ہمراہ بھی اتنی ہی تعداد تھی جتنی کہ ہماری۔

اس کے بعد ہم مالیگاؤں کی جانب روانہ ہوئے اور راستہ میں ہولی کا تہوار منایا...... مالیگاؤں پہنچ کر جب ہم ایک یا دو کوس گئے ہوں گے' ہماری ملاقات مکھن کے ایک رشتہ دار سے ہوئی جس کا تعلق امراؤ اور رتی رام کے جتھوں سے تھا۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہ دونوں سردار پونا کے قریب کچھ انگریا تاجروں کا تعاقب کر رہے ہیں' جن کے بارے میں انہیں خبر ملی ہے کہ ان کے پاس بہت پیسہ ہے۔ اس پر یہ کہا گیا کہ مکھن کو کچھ ساتھیوں کے ساتھ ان سے ملنا چاہیے تاکہ وہ بھی مال میں سے اپنا حصہ مانگ سکے۔ ابتداء میں تو مکھن نے سوچا کہ وہ خود جائے' مگر بعد میں اس خیال سے کہ اس کے اور اودے سنگھ کے اچھے تعلقات نہیں ہیں' اس نے ۲۵ آدمیوں کو چھوٹے جمعدار کے ساتھ بھیج دیا۔ اس کے ایک دن بعد ہمیں خبر ملی کہ کام پورا ہوگیا ہے اور یہ سب لوگ بہرام پور کی طرف روانہ ہوگئے ہیں' جہاں کہ ہمیں ان سے ملنا ہے۔

یہاں آکر ہمیں پتہ چلا کہ انگریا تاجروں پر حملہ کیا گیا اور انہیں کوکر کے مقام پر قتل کر دیا گیا اور ان کی پوٹلیوں میں ۲۲ ہزار کی مالیت کا سونا' چاندی اور اشرفیاں ملیں۔ ان میں سے ۶ ہزار روپیہ ہمارے گروہ کے حصہ میں آئے۔

میرا ٹھگوں کے ساتھ جن مہمات میں بھی جانا ہوا' اس میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کو مارنے سے پہلے اس کے مال پر قبضہ کیا ہو۔ ہر کیس میں پہلے اس کا گلا گھونٹ کر مارا گیا' اس کے بعد اس کے پیسوں پر قبضہ کیا گیا۔ گلا گھونٹنے کے لیے رومال یا کپڑے کے کسی ٹکڑے پر گانٹھ باندھ کر اسے استعمال کیا جاتا تھا یا محض اسے گلے میں ڈال کر گلا دبایا جاتا تھا۔ بہت کم ہاتھ سے گلا گھونٹتے تھے کیونکہ اس میں اس کے بچ جانے کے امکانات ہوتے تھے۔

طریقہ یہ تھا کہ جیسے ہی پہلے سے مقرر کردہ اشارہ کیا جاتا' ایسے ہی لوگ شکار پر جھپٹتے اور اسے رومال یا ہاتھوں سے گلا دبا کر مار ڈالتے۔ ٹھگوں کا یہ اصول تھا کہ مارتے ہوئے خون کسی صورت میں بھی نہیں گرنا چاہیے' کیونکہ اس صورت میں خون قتل کی گواہی دے گا' اور ان دھبوں کو دیکھ کر مسافروں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا ہوگا اور اس کے نتیجہ میں گرفتار ہونے اور سزا پانے سے خطرات زیادہ ہوں گے۔ اس لیے ان کو مارنے کے بعد فوراً ہی گڑھا کھود کر دفنا دیا جاتا تھا۔

اگر دفن کرنے کی جگہ شاہراہ کے قریب ہوتی تھی یا کھلے میدان میں تو دفن کے بعد مٹی برابر کر کے وہاں آگ جلا دی جاتی تھی تاکہ مٹی کے تازہ ہونے کے نشانات

مٹ جائیں۔ اس قسم کے قتل باقاعدہ منصوبے کے تحت ہوتے تھے کہ جس میں ان لوگوں کو پھسلا کر یا دھوکہ دے کر کیمپ میں لایا جاتا تھا اور جس وقت وہ چہل قدمی کر رہے ہوتے' کھانا کھاتے ہوئے یا خوش گپیوں میں مصروف ہوتے' اس وقت آرام سے ایک اشارہ سے ان کا خاتمہ کر دیا جاتا۔

یہ قتل عام طور سے ان گاؤں کے نزدیک ہوتے کہ جہاں ہم اپنا کیمپ لگائے ہوئے ہوتے' اور ہمیشہ دن کی روشنی میں کہ جس وقت لوگ اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے۔ قتل کے وقت ڈرم اور ڈھول بجائے جاتے اور زور زور سے گانا گایا جاتا تاکہ قتل ہونے والوں کی آوازیں اس میں دب جائیں۔ اشارہ دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ یہ ایسا ہو کہ شکار کو شبہ نہ ہو مثلاً صرف یہ کہا جاتا "تمباکو لاؤ"۔

اسی طرح میں نے رسی کے ساتھ کسی ٹھگ کو گلا گھونٹتے نہیں دیکھا۔ اگر اسے کبھی استعمال بھی کیا ہو تو اب کم از کم اسے ترک کیا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی ٹھگ کو اس کے ساتھ دیکھ لیا گیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا تو اس کی شناخت آسانی سے ہو جائے گی۔

بندھیل کھنڈ میں جہاں کہ امراؤ اور مکھن رہتے تھے' وہاں ان کے تعلقات انتظامیہ سے تھے۔ اس طرح ٹھگوں کے دوسرے جمعدار اپنے علاقے میں حکومت کے اہل کاروں سے دوستی رکھتے تھے اور اس کے بدلہ میں انہیں تحفے تحائف دیتے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب یہ لوگ اپنی مہمات سے واپس آتے تو اپنے علاقوں میں پرامن طریقے سے رہتے۔

اسی طرح سے انگریزوں کی حمایت اور ان کی مدد بھی ضروری خیال کی جاتی تھی اور اسے دھوکہ اور حیلہ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی مدد ایسے لوگوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھی کہ جن کے تعلقات انگریزوں سے ہوتے تھے۔ یہ لوگ مختلف بہانوں اور جھوٹے طریقوں سے ہمارے لوگوں کو بچانے کے لیے ان سے رابطہ کرتے تھے۔ امراؤ کا ایک رشتہ دار' جس کا نام موتی تھا' ایک اور شخص جو لالا حاجائن کہلاتا تھا' انہوں نے کئی معاملات میں ہماری مدد کی۔ موتی خود ایک ٹھگ رہ چکا تھا' مگر عرصہ ہوا کہ اس نے ہمارے ساتھ لوٹ مار کی مہمات پر جانا چھوڑ دیا۔ اس کا انگریزوں سے

اس وقت تعلق ہوا جب اس نے ٹھگوں کے ایک گروہ کی مخبری کی' جس کے نتیجہ میں وہ لوگ گرفتار ہوئے اور آج کل یہ جبل پور میں قید ہیں۔ اس طرح سے موتی نے انگریزوں کے دل میں اعتماد پیدا کر لیا اور انہوں نے اس خیال سے اس سے رابطے رکھے کہ یہ ٹھگوں اور لٹیروں کو ختم کرانے میں ان کی مدد کرے گا۔ ان تعلقات کی وجہ سے اس کا ہم لوگوں پر بڑا اثر ہوگیا اور ہمیں وہ مجبور کرتا تھا کہ ہم اس کی خدمات کے صلہ میں اسے زیادہ سے زیادہ روپیہ دیں۔ وہ خاص طور سے امراؤ' رتی رام اور ہیرا مندین کے گروہوں کی حفاظت کے لیے کام کرتا ہے۔

لالا حاجائن' اپنے ان تعلقات کی وجہ سے کہ جو اس نے کانپور کی عدالت میں اہلکاروں سے قائم رکھ رکھے ہیں' مکھن کو کئی مشکلات سے نکال کر اس کی مدد کر چکا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مکھن کی لوٹ کا حصہ بہرام پور کے راجہ کے آدمیوں نے لوٹ لیا۔ اس پر اس نے لالا حاجائن سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے فوراً کانپور عدالت کے ایک اہلکار مدی منشی سے اس کا ذکر کیا۔ اس پر اس نے فوراً راجہ کو خط لکھا کہ اس کے علاقہ میں چار مسافروں کے مال و اسباب کو لوٹ لیا گیا ہے' لہٰذا اسے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ یہ مال فوراً ان کے حقداروں کو واپس کر دے۔

اس کے خط کے وصول ہوتے ہی راجہ نے مکھن کے آدمیوں کو رہا کر دیا اور لوٹی ہوئی رقم واپس کر کے ان سے اس کی رسید لے لی۔ بعد میں لالا حاجائن نے سوچا کہ اگر انگریزوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ لوگ ٹھگ تھے تو اس سے اس کی شہرت متاثر ہوگی' اس لیے اس نے بعد میں انہیں گرفتار کرا دیا' پھر ان لوگوں کا کیا ہوا' اس کے بارے میں مجھے علم نہیں۔

لالا حاجائن' جو اس کے معاملات کو بخیر و خوبی طے کراتا ہے' مکھن کے تعلقات کانپور' اٹاوہ' ھمیر پور' اوریا اور معین پور کی عدالتوں اور کچہریوں میں وہاں کے اہلکاروں سے ہیں' اس کے علاوہ اس کی دوستی ھمیر پور کے وکیل گنیش لال سے بھی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جب ہمارے جتھے ادھر ادھر جاتے ہیں تو اس سے لوگوں میں شک و شبہ پیدا ہوتا ہے' لیکن ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ مختلف باتیں بنا کر لوگوں کے

شبہات کو دور کر دیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگ ہتھیار لے کر چلتے ہیں۔ ۱۵، ۲۰ آدمیوں میں سے ہمارے پاس تین یا چار تلواریں ہوتی ہیں۔ جب ہم ٹھگ، اگرچہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی کیوں نہ ہوں، ملتے ہیں تو ہم طور طریق سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ ہم میں سے ہے۔ مزید یقین کے لیے ہم میں سے کوئی کہتا ہے "علی خاں" اور دوسری جماعت بھی اس کو دہراتی ہے جو ثابت کرتا ہے کہ وہ بھی ٹھگ ہیں، لیکن ہم ایک دوسرے سے اس کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے۔

مال کی تقسیم میں جمعدار کو ساڑھے سات فیصد حصہ ملتا ہے، اس کے علاوہ لوگوں میں جو مال برابر یا مساوی تقسیم ہوتا ہے، اس میں بھی وہ اپنا حصہ لگاتا ہے۔ مال کی تقسیم سے پہلے ہماری دیوی بھوانی کی نذر کے لیے ایک حصہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ جب ہوتا ہے کہ جب مال میں نقد روپیہ اور سونا چاندی ہو، اگر مال میں ہیرے، جواہرات اور قیمتی موتی ہوتے ہیں تو جمعدار اپنے ہاتھ میں چیرا دے کر اس کا خون اس پر چھڑکتا ہے، یہ دیوی کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اگر مال میں سے بھوانی کا حصہ علیحدہ کیا جائے اور اس کی خدمت میں نذر پیش نہ کی جائے یا اس میں غفلت برتی جائے یا بھول جایا جائے تو ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہم پر آفت آتی ہے۔

ہمارے ہاں گلا گھونٹنے کا کام صرف ایک کے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ تقرر باقاعدہ ایک رسم کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ شخص جسمانی لحاظ سے تندرست ہے یا نہیں، اس میں جذبات پر قابو پانے اور رومال کو کام میں لانے کی مہارت ہے یا نہیں، ان باتوں کے بعد اس کا تقرر عمل میں آتا ہے۔

تقرر کے بعد وہ اپنے گرو کے ساتھ میدان میں جاتا ہے اور وہاں کسی نیک شگون کا انتظار کرتا ہے، جیسے چڑیوں کا چہچہانا یا ان کا اڑنا وغیرہ، اس کے بعد رومال میں گٹھان باندھی جاتی ہے، اور شگون کے بعد یہ امیدوار کے حوالہ کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ واپس آتے ہیں اور رسم کا خاتمہ مٹھائی کی تقسیم کے بعد ہوتا ہے۔

عام طور سے یہ خدمت پرانے لوگوں کے سپرد کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں پرانے

ٹھگوں کی عزت ہوتی ہے' اور وہ ٹھگ جو ضعیفی کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے' ان کے شاگرد' کہ جنہوں نے ان سے رومال استعمال کرنا سیکھا ہوتا ہے' وہ مالی طور پر ان کی مدد کرتے ہیں۔

ٹھگوں کی زبان اور ان کی اصطلاحات سارے گروہ سمجھتے ہیں اور یہ ایک ہوتی ہیں۔

(فینی پارکس نے اپنے مشاہدات میں لکھا ہے کہ ٹھگ کبھی بھی یورپی لوگوں پر حملہ نہیں کرتے)

(صفحہ ۱۲۱ - ۱۳۱)

فینی پارکس نے تفصیل سے ایک خط کو نقل کیا ہے کہ جو گورنمنٹ گزٹ میں ۱۱ ٹھگوں کی پھانسی کے بارے میں چھپا تھا۔

جناب عالی!

میں ان ۱۱ ٹھگوں کی پھانسی کے وقت موجود تھا کہ جو بھیلسہ کے قریب گرفتار کیے گئے تھے۔ ان پر ۳۵ مسافروں کے قتل کا الزام تھا (جن کی لاشیں بھوپال اور ساگر کے راستہ میں مختلف جگہوں سے دریافت کرلی گئی تھیں کہ جہاں انہیں سڑک کے کنارے دفن کیا گیا تھا) اس جرم کی سزا کے طور پر گورنر جنرل کے ایجنٹ مسٹر اسمتھ نے انہیں پھانسی کی سزا دی تھی۔

جیسے ہی سورج طلوع ہوا' ان ۱۱ آدمیوں کو جیل سے باہر لایا گیا۔ یہ لوگ پھولوں کے ہار پہنے ہوئے تھے اور بڑے سکون و اطمینان سے پھانسی کے تختہ تک آئے۔ ان کے چہروں سے کسی بھی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

جب ان کو پھانسی کے سامنے ایک ایک کر کے کھڑا کر دیا گیا' تو ان کے چہرے پر بشاشت آگئی اور سب نے مل کر ہاتھ بلند کیے اور یہ نعرے لگائے۔ "بندھا چل کی جے' بھوانی کی جے" اگرچہ ان میں چار مسلمان' ایک برہمن' اور دوسرے راجپوت و مختلف ہندو ذاتوں سے تھے' مگر سب کا نعرہ ایک ہی تھا۔ اس کے بعد وہ پھانسی کے تختہ پر گئے اور اپنے ہاتھوں سے پھانسی کے پھندے گلے میں ڈال کر ایک بار پھر بھوانی کا نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے پھانسی کے پھندوں کو گلے میں ڈال کر درست کیا اور ان میں

سے جو نوجوان تھے' وہ تماشائیوں کو دیکھ کر ان پر ہنسنے لگے۔

ان میں سے ایک جو مسلمان تھا' وہ پھانسی کے دیر ہونے پر اس قدر بے چین ہوا کہ وہ پھندے کو تنگ کر کے لٹک گیا اور اس طرح سے جان دے دی جیسے کوئی چٹان سے کود کر سمندر میں تیرنا چاہتا ہو۔ یہ وہ شخص تھا کہ جس نے عمر پتن کے مقام پر چھ مسافروں کا گلا گھونٹ کر مارا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی اور ان کے ساتھ مل کر بھوپال میں تیس مسافروں کو مارا' آخرکار اسے بھیلسہ کے مقام پر گرفتار کیا گیا۔

جب مجسٹریٹ نے ان سے آخری خواہش کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے ایک کے بدلہ میں ۵ مجرموں کو جیل سے چھوڑ دیا جائے اور ان کے پاس جو تھوڑے بہت پیسے ہیں ان کو خیرات کر دیا جائے۔

پھانسی کے موقع پر ٹھگوں کا بھوانی کا نعرہ لگانے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا ہے کیونکہ ٹھگ سوائے بھوانی کے اور کسی دیوی یا دیوتا سے مدد طلب نہیں کرتے' چاہے ان کا مذہب کوئی ہو اور وہ کسی بھی مذہبی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس کی پوجا چار ناموں کے ساتھ کی جاتی ہے: دیوی' کالی' درگاہ اور بھوانی۔ اس کا مندر' جو کہ مرزا پور سے چند میل دور مغرب میں واقع ہے' وہاں تمام ہندوستان سے آئے ہوئے قاتل اور لٹیرے جمع رہتے ہیں اور اس مال میں سے دیوی کو نذر پیش کرتے ہیں کہ جو انہوں نے مسافروں کا گلا گھونٹ کر حاصل کی ہوتی ہے۔

نذر دینے کے لیے یہ لوگ موسم برسات کے بعد آتے ہیں اور اس دوران میں کہ جبکہ وہ اپنے گھر اور مندر آنے کے ارادہ سے سفر کرتے ہیں' اس وقت یہ کسی صورت میں کوئی جرم نہیں کرتے اور نہ کسی کو لوٹتے ہیں۔ لیکن جب یہ واپس ہوتے ہیں تو پھر انہیں لوٹ مار اور قتل سے کوئی نہیں روک سکتا۔

مندر کے پجاری ٹھگوں کو دولت اور نجات حاصل کرنے کا یقین دلاتے ہیں' مگر اس کی شرط یہ ہوتی ہے کہ دیوی کو زیادہ سے زیادہ حصہ دیا جائے۔ ان کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر وہ لوٹ مار کے دوران مارے جائیں گے تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اگر وہ گرفتار ہوتے ہیں اور پھانسی پاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے

دیوی کو ناخوش کر دیا ہے' اور ان کی روحیں اس وقت تک فضا میں پریشان پھرتی رہیں گی جب تک کہ دیوی ان سے خوش نہیں ہو جاتی۔

ٹھگوں کے جتھے کے مختلف لوگ مہم سے پہلے اپنے سردار کے گاؤں میں جمع ہوتے ہیں اور یہاں یہ دن اور آپریشن کے وقت کا تعین کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کھدال کو پاک کرنے کی رسم ادا کرتے ہیں کیونکہ کھدال اس لیے ضروری اور اہم ہوتی ہے کہ اس سے یہ اپنے شکار کی قبریں کھودتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کھدال کو مہم سے پہلے پاک کر لیا جائے تو پھر کوئی آفت نہیں آتی' اس لیے یہ اس کے علاوہ اور کسی دوسرے اوزار اور آلہ سے مٹی کو نہیں چھیڑتے۔

دوسری رسومات میں سے ایک یہ ہوتی ہے کہ یہ بکری کو قربان کر کے کھوپڑے کے ساتھ' بھوانی کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ایک کمچر بناتے ہیں کہ جس میں خوشبودار لکڑی' اسپرٹ' شکر' آٹا اور گھی ہوتا ہے۔ اسے یہ ایک بڑی دیگچی میں خوب ابالتے ہیں۔ اس کے بعد کھدال کو دھو کر' اس پر گائے کا گوبر مل کر' ایک صاف جگہ رکھ دیتے ہیں اور پھر منتر پڑھتے ہوئے اس پر یہ کمچر انڈیلتے ہیں۔ اس کے بعد کھدال کو صاف کر کے اسے کپڑے میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اس رسم کے بعد یہ گاؤں سے باہر نکلتے ہیں اور کچھ دور چل کر خاموشی سے کھڑے ہو کر شگون لیتے ہیں۔ یہ شگون وہ تیتر کے بولنے کی آواز سے لیتے ہیں' اگر یہ آواز سیدھے ہاتھ کی جانب سے آتی ہے تو وہ یہ کھدال کسی ایک ہاتھ میں دے کر اسے یہ ذمہ داری سونپ دیتا ہے۔ اگر یہ آواز بائیں ہاتھ کی طرف سے آئے' یا کوئی آواز ہی نہ آئے تو یہ واپس آ جاتے ہیں اور دوسرے دن کسی اور جگہ جا کر یہ شگون لیتے ہیں' یہاں تک کہ آواز سیدھے ہاتھ کی جانب سے آئے۔

اگر حادثاتی طور پر کھدال گر جائے تو یہ بدشگونی تصور کی جاتی ہے اور وہ فوراً اس جگہ کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں چلے جاتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آتا تو وہ شخص جو کھدال کے لیے منتخب ہوا ہے' وہ پورے سیزن کے لیے اس ذمہ داری کو سنبھالتا ہے۔ یہ شخص کھدال کو اپنے دامن میں چھپا کر رکھتا ہے مگر سوتے وقت وہ اسے کسی اور جگہ چھپا دیتا ہے اور کسی کو اس جگہ کا پتہ نہیں بتاتا۔

ٹھگوں کے جتھہ کے تمام افراد کدال پر حلف اٹھاتے ہیں جو کہ گائے کے گوبر سے پلاسٹر کی ہوئی صاف کپڑے میں لپٹی ہوئی زمین پر رکھی ہوتی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی بھی کدال پر حلف لینے کے بعد خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے اس کی سخت سزا ملتی ہے۔ اگر انہیں کسی شخص پر مخبری کا شبہ ہوتا ہے تو اس سے بھی وہ اس کدال پر حلف لیتے ہیں۔

ٹھگوں میں شگون لینے کا بڑا رواج ہے۔ اگر وہ ہرن کو سڑک کی دائیں جانب دیکھ لیں تو اسے اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی بھیڑیا سڑک کو ان کے سامنے پار کرے تو اس صورت میں وہ اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی گیدڑ کو دن میں اور تیتر کو رات میں بولتا ہوا سن لیں تو وہ اس علاقہ کو فوراً چھوڑ دیتے ہیں۔

کدال رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ بغیر ہینڈل کے ہوتی ہے۔ یہ اس وقت لگایا جاتا ہے جب کھدائی کی ضرورت ہوتی ہے' اس کے بعد اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے محض کدال کے پھل کو رکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

دوسری اہم رسم رومال کو استعمال کرنے کی ہوتی ہے۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ رومال کو اس وقت تک استعمال کرے جب تک کہ اس کا گرو اس کی اجازت نہ دے۔ جب کوئی ٹھگ اس کے استعمال کی تربیت پوری کر لیتا ہے اور اپنی ہمت' بہادری' حوصلہ اور مضبوط اعصاب کے ہونے کا ثبوت دے دیتا ہے تو گرو ایک محفل میں اس کے سپرد رومال کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ دیوی اس کی مہمات میں اس کا ساتھ دے اور اسے کامیاب کرے۔

اس رسم میں کامیابی ٹھگوں کے لیے ایسی ہی ہے جیسے کسی کو نائٹ کا خطاب ملے' کیونکہ یہ اس کی خواہشات کو پورا کرنے اور اپنے ساتھیوں میں عزت و احترام بڑھانے میں مدد دیتی ہے اور اس سے اس کی جرات و بہادری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ کسی کو مارتا ہے تو اس کا حصہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔

اس رسم میں امیدوار کے ۴۰ روپیہ کے قریب خرچ ہوتے ہیں۔ یہ رسم کوئی پرانا ٹھگ ادا کرتا ہے جو اس پیشہ سے ریٹائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس میں مسلمان یا ہندو

ہونے کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس ٹھگ کو اس کے شاگرد وقتاً" فوقتاً" تحفے تحائف اور نذرانے دیتے رہتے ہیں۔ اکثر مشکل معاملات میں اس سے مشورہ کیا جاتا ہے اور اس کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ اکثراس رسم کو بیس سال کی عمر میں پورا کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو بچپن سے ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور گلا گھونٹتے وقت ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان میں وہ ٹھگ کہ جو عمر کا بڑا حصہ گزرنے کے بعد شامل ہوتے ہیں' ان کے لیے رومال کا استعمال مشکل ہوتا ہے اور یہ لوگ چوکیدار' گور کن اور لاشوں کو دفن کرنے کا کام کرتے ہیں۔

لوگوں کو مارنے اور قتل کرنے میں جس وجہ سے انہیں آسانی ہوتی ہے' وہ یہ عقیدہ ہے کہ وہ جن لوگوں کو قتل کرتے ہیں' وہ سیدھے جنت میں جاتے ہیں کیونکہ ان کا قتل دراصل دیوی کے لیے قربانی ہوتی ہے۔

میں یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ چونکہ گائے کو درگا دیوی یا بھوانی کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے' اس لیے مسلمان جیسے ٹھگ بنتا ہے وہ گائے کا گوشت ترک کر دیتا ہے۔ وہ اگرچہ قرآن کی تلاوت کرتا ہے مگر کبھی بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدد کے لیے نہیں پکارتا۔

آپ کا خادم

"ایچ"

(صفحہ ۵۱ - ۵۸)

بھوانی کا مندر

فینی پارکس بھوانی کے مندر کو دیکھنے کی غرض سے گئی' کیونکہ اس نے ٹھگوں کی زبانی سنا تھا کہ وہ بھوانی کی پوجا کرتے ہیں اور اپنی لوٹ میں سے ایک حصہ اس کے لیے علیحدہ رکھتے ہیں۔ فینی پارکس نے بھوانی کا ایک سکیچ بھی بنایا جو اس نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔

✤

میرا پہلا واسطہ جس شخص سے ہوا' وہ حجام تھا اور مندر میں رسومات کی ادائیگی کرتا تھا۔ اس نے مجھے اپنی خدمات کی پیشکش کی کہ مجھے مندر کی اچھی طرح سیر کرا دے گا۔ جب ہم مندر کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ پیپل کے درخت پر تین جھنڈے لہرا رہے تھے اور ساتھ ہی گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں' جس سے پتہ چلتا تھا کہ برہمن دیوی کی پوجا میں مصروف ہیں۔ مندر پتھر سے بنا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں' جن تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔

جب ہم مندر کے دروازے پر پہنچے تو برہمن نے درخواست کی کہ میں اپنے جوتے اتار دوں۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے جوتے دروازے پر چھوڑے اور کوئی تیں گز چل کر ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ جگہ اتنی تنگ ہے کہ اگر یہاں پر چھ آدمی جمع ہو جائیں تو یہ بھر جائے۔ اس کی دیواریں کھردرے پتھر سے بنی ہوئی ہیں۔ میرے جانے پر جو لوگ کمرے میں تھے وہ باہر چلے

گئے تاکہ میں دیوی کے درشن اچھی طرح سے کر سکوں۔

دیوی کا سر کالے پتھر سے بنا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ اس کی آنکھیں پوجا کرنے والوں کو بڑا متاثر کرتی ہیں۔ "اس کی آنکھیں دیکھو" ایک شخص نے کہا۔ اس کے سر پر پھولوں کے ہار پڑے ہوئے تھے' جو اس کے کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس کے دونوں پیر پتھر کے بنے کالے چوہے پر رکھے ہوئے تھے اور اس کی ایک جانب مہادیو کا بت تھا۔ دیوی کا بت چار فٹ کی بلندی پر رکھا ہوا تھا اور دیکھنے میں وہ بچوں کا کھلونا معلوم ہوتا تھا.........

میں نے یہیں پر دیوی کا سکیچ بنایا۔ میری مدد کے لیے برہمن لیمپ لیے ہوئے کھڑا رہا۔ دیوی کے سر پر سفید پھولوں کا ایک زیور لٹکا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی کالے پتھر کی سل پر لیمپ رکھا ہوا تھا۔

مندر مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا' جو مسلسل آ اور جا رہے تھے۔ یہاں پر سالانہ میلہ ۱۵ نومبر سے ۱۳ دسمبر تک لگتا ہے۔ اس موقع پر یہ جگہ ٹھگوں سے بھری ہوتی ہوگی جو رسومات ادا کرنے اور پوجا کرنے یہاں آتے ہوں گے۔

(حصہ دوم' ص ۴۹۹ - ۴۵۲)

(۷)

ٹھگوں کی باتیں

ولیم سلیمن (William Sleeman) جس نے گورنر جنرل بینٹنک کے زمانہ میں ٹھگی کے خاتمہ کی مہم چلائی اور بالآخر اس کا خاتمہ کر دیا' اس نے اپنے تجربات کی بنیاد پر آخر میں ٹھگوں کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ حکومت کو پیش کی' جو "Report on The Thug Gangs" کے نام سے ۱۸۴۰ء میں کلکتہ سے چھپی۔ اس میں اس نے جہاں ان تمام مراحل کا ذکر کیا ہے کہ جو اسے ٹھگی کو ختم کرنے میں پیش آئے' وہاں اس نے ٹھگوں کے عقائد اور ان کی خفیہ زبان کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہاں جارج بروس کی کتاب "گلا گھونٹنے والے" (The Stranglers) کے حوالے سے سلیمن کی کتاب کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

✤

—————— (۱) ——————

بہت سے ٹھگوں نے اس کا اعتراف کیا کہ انہوں نے بہت زیادہ قتل کیے ہیں' چنانچہ ایک ٹھگ جس کا نام بہرام تھا' اس نے دعویٰ کیا کہ وہ ۹۴۱ لوگوں کا گلا گھونٹ کر مار چکا ہے اور یہ سب کچھ اس نے ۴۰ سال کے عرصے میں کیا۔ سلیمن کو اس پر

یقین نہیں آیا اور اس نے پوچھا: "۹۳۱ قتل؟ مجھے یقین ہے کہ اتنے قتل کرنے کا تو تم پر الزام لگانا بھی مشکل ہوگا"۔

"صاحب" ٹھگ نے ادب سے جواب دیا "اس کے علاوہ اور بھی قتل کی وارداتیں ہیں' آخر میں تو میں نے گنتی کرنا ہی چھوڑ دی تھی"۔

"کیا تمہیں لوگوں کو قتل کر کے کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا' میرا مطلب ہے کہ پہلے تم ان سے دوستی کرتے تھے' پھر انہیں دھوکہ دے کر تحفظ کا احساس دلاتے تھے"۔

"بالکل بھی نہیں' کیا آپ خود شکاری نہیں ہیں' اور کیا آپ کو شکار کا تعاقب کرتے ہوئے ایک خوشی کا احساس نہیں ہوتا کہ آپ شکار پھانسنے کے لیے تمام حربوں اور ترکیبوں کو آزماتے ہیں اور کیا آپ کو اس وقت خوشی و مسرت نہیں ہوتی کہ جب آپ کا شکار آپ کے قدموں میں مرا پڑا ہوتا ہے؟ تو ٹھگوں کے لیے بھی لوگوں کا تعاقب کرنا' دھوکہ دینا اور مارنا شکار کی ہی ایک قسم ہے"۔

"اور صاحب آپ کے لیے یہ آسان ہے کہ آپ شکار کو دیکھ کر اپنے جذبہ پر قابو نہ پائیں اور اسے ظاہر کر دیں' مگر ہم ٹھگوں کو' ذہین شکاریوں' جن میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں' ان کے سامنے خود پر قابو رکھنا ہوتا ہے۔ ہمارے شکاری اکثر مسلح ہوتے ہیں' میرا مطلب ہے کہ ہمارے شکاری اس قابل ہوتے ہیں کہ مدافعت کر سکیں' اس لیے انہیں صرف چالاکی اور خوشامد سے قابو میں لایا جا سکتا ہے"۔

"صاحب آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے' ہمیں اس وقت کس قدر خوشی ہوتی ہے جب وہ ہمارے تحفظ میں دن گزارتا ہے' اور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اس کا شک و شبہ دوستی میں بدل جاتا ہے' یہاں تک کہ وہ شاندار لمحہ آتا ہے کہ جب رومال شکاری کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہ نرم و ملائم رومال' جس نے کہ کئی سو آدمیوں کی زندگیوں کا خاتمہ کیا ہے' افسوس' صاحب' نہیں کبھی نہیں' ہاں خوشی اور فخر کا احساس ضرور ہوا ہے"۔

(اس کے بعد سلیمن نے ایک مسلمان ٹھگ سے بھوانی دیوی کے بارے میں پوچھا)

"کیا بھوانی کا تمہاری جنت سے یا جنت کے تصور سے کوئی تعلق ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں"۔

"کیا اس کا تمہاری آخرت کی زندگی پر کوئی اثر نہیں؟"

"نہیں"۔

"کیا تمہارے پیغمبرؑ نے اس قسم کے جرائم، جیسے کہ تم کرتے ہو، اجازت دی ہے؟"

"نہیں"۔

"کیا انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان جرائم کی سزا آخرت میں ملے گی؟"

"ہاں"۔

"تو پھر تمہیں کیوں آخرت میں اس سزا سے کوئی ڈر نہیں"۔

"نہیں کیونکہ ہم کسی کو اس وقت تک قتل نہیں کرتے جب تک کہ اس کے بارے میں کوئی موافق شگون نہ ہو اور ہم اس موافق شگون کو دیوی کی طرف سے اجازت نامہ سمجھتے ہیں"۔

"کون سی دیوی؟"

"بھوانی"۔

"مگر تم نے ابھی کہا ہے کہ بھوانی کا تمہاری آخرت والی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے؟"

"ہاں کوئی نہیں ہے، مگر وہ اس دنیا میں ہماری تقدیر کی مالک ہے اور وہ اس دنیا میں جو بھی حکم دیتی ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا آخرت میں اس کی کوئی سزا نہیں دے گا"۔

"کیا تمہاری بیویاں تمہیں اس پر کبھی برا بھلا نہیں کہتی ہیں؟"

"ہندوستان کے جنوب میں ہم اپنی بیویوں پر یہ راز کبھی ظاہر نہیں کرتے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی اسے فاش کر دیں" صاحب خان نے کہا۔

"اور اگر تم انہیں بتا دو، تو کیا وہ اسے برا نہیں سمجھیں گی؟"

"ہاں کچھ برا سمجھیں گی اور کچھ، جنہیں ان کے ٹھگ شوہر بتا دیتے ہیں، اسے

خاموشی سے تسلیم کر لیں گی"۔

"اور کیا وہ اتنی وفادار اور فرمانبردار رہیں گی جیسی کہ دوسری عورتیں؟"

"ہم ٹھگوں کی بیویوں کی وفاداری تمام ہندوستان میں ضرب المثل ہے"۔

"یعنی ٹھگ جماعت کے اندر"۔

"ہاں"۔

"کیا اس کی وجہ رومال کا کرشمہ تو نہیں؟"

"شاید تھوڑا بہت ہے' مگر بہت کم عورتیں اپنی بے وفائی کی وجہ سے ماری گئی ہیں" صاحب خان نے دعویٰ کیا۔

سلیمن نے فرنگیا (مشہور زمانہ ٹھگ) سے سوال کیا۔

"کیا تم کالی کے مندروں میں پوجا کرتے ہو؟"

"ہاں' تمام لوگ اس کے مندروں میں پوجا کرتے ہیں"۔

صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا "دکن میں نواب اور بڑے بڑے امراء اس وقت کالی کے مندر میں آکر اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں کہ جب ان کے بچوں میں چیچک پھیلتی ہے' ہم نے خود ان لوگوں کو اکثر دیکھا ہے"۔

"تو کیا وہ لوگ اس پر یقین کرتے ہیں کہ دیوی تم ٹھگوں کی حفاظت کرتی ہے؟"

"ہاں' ان میں سے کچھ تو کرتے ہیں اور کچھ کوشش کرتے ہیں ہمیں ہمارے کاروبار سے روکیں مگر وہ ہمیں سزا دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بڑا صاحب' مدورا کا جمعدار' جس کے پاس کئی سو ٹھگ ہیں' وہ نواب دولے خاں کو قیمتی تحفے تحائف دیتا رہتا ہے اور نواب کو معلوم ہے کہ یہ سب کچھ کہاں سے آتا ہے۔ نواب نے اسے پیشکش کر رکھی ہے کہ جب بھی وہ اس کاروبار سے ریٹائر ہو تو اسے لگان سے معاف زمین کھیتی باڑی کے لیے دے دی جائے گی' مگر میرا خیال ہے وہ اپنا کام کبھی بھی نہیں چھوڑے گا"۔

"آخرکار اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

"ہوا یہ کہ اسی کا ہم نام ایک بڑا خطرناک ڈاکو تھا' جس نے بڑی لوٹ مار کر رکھی تھی اور نواب کا حکم تھا کہ جب کبھی وہ پکڑا جائے تو اسے توپ کے منہ سے باندھ کر

اڑا دیا جائے۔ انہوں نے اتفاق سے صاحب خان ٹھگ کو پکڑ لیا اور غلطی سے اسے ڈاکو سمجھ کر توپ سے اڑا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد نواب کا یہ پیغام آیا کہ اسے خطرہ ہے کہ پکڑا جانے والا ڈاکو نہیں کوئی اور شخص ہے' مگر اس وقت تک نواب کے لوگ اپنا کام کر چکے تھے۔ اس کی موت کی خبر سن کر نواب کو بہت افسوس ہوا۔ مگر کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے' اس لیے اس میں نواب کی کوئی خطا نہیں تھی"۔

سلیمن نے پوچھا "کیا نربدا سے اوپر والے علاقے کے سردار بھی ٹھگوں سے ڈرتے ہیں؟"

"ہاں پہلے تو وہ ڈرتے تھے اور اب بھی اکثر ان سے خوف کھاتے ہیں" فرنگیا نے کہا۔

"مگر وہ کیوں ڈرتے ہیں' کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ انہیں پریشان کیا گیا ہو؟"

"ہاں ایسی کئی مثالیں ہیں' کیا جھلونا کا راجہ نتھا دیوی کے حکم سے کوڑھ کے مرض میں مبتلا نہیں ہوگیا تھا' کیونکہ اس نے بدھو اور اس کے بھائی کھمبولی کو' جو نامی گرامی ٹھگ تھے' مروا دیا تھا"۔

"کیا اسے اس بات پر یقین تھا کہ یہ سزا دیوی نے اسے ان دو ٹھگوں کے مروانے پر دی ہے؟"

"ہاں' اس بات کو وہ بخوبی سمجھتا تھا" ایک مسلمان ٹھگ نے کہا۔

"کیا اس نے دیوی کو منانے کے لیے کچھ کیا؟"

"ہر چیز کی' بدھو نے جھلونا میں ایک کنواں بنوانا شروع کیا تھا' راجہ نے اسے مکمل کرایا۔ اس نے ان کے نام پر ایک چبوترہ بنوایا' برہمنوں کو کھانا کھلایا اور ان کی سمادھی پر رسومات کرائیں اور پوجا پاٹ کا انتظام کیا' لیکن یہ سب بیکار ہوا۔ اس کا مرض لاعلاج ثابت ہوا اور راجہ چند مہینوں میں ہی بری حالت میں مر گیا۔ وہ کنواں اور چبوترہ اب تک باقی ہیں اور وہاں ہزارہا لوگ پوجا پاٹ کے لیے آتے ہیں۔ تمام لوگوں کو اس بات کا یقین ہے کہ راجہ ٹھگوں کو سزا دینے کی وجہ سے مرا ہے"۔

"مگر بدھو کو مارنے سے پہلے اس کی ناک اور کان کو کاٹ ڈالا گیا تھا' اس وقت

دیوی نے اس کی مدد کیوں نہیں کی؟"
"وہ بڑا شہرت کا ٹھگ تھا" فرنگیا نے کہا' "جہاں تک دانش مندی کا تعلق ہے' ہم نے اس سے زیادہ عقل مند اور کسی کو نہیں پایا' جو لوگ ٹھگی کے کاروبار میں ہیں' وہ اس کے پاس برکت کے لیے جاتے تھے"۔
"کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں؟"
"کئی سو" شیخ عنایت نے کہا "جب مادھو جی سندھیا نے ۷۰ ٹھگوں کو گرفتار کیا اور انہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا تو دیوی نے خواب میں آکر اس سے کہا کہ وہ انہیں چھوڑ دے مگر جب اس نے انہیں قتل کر دیا تو کیا دوسرے دن اس نے خون تھوکنا شروع نہیں کر دیا تھا؟ اور کیا پھر وہ تین مہینے کے اندر اندر نہیں مر گیا؟"
فرنگیا نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "جب کچھواہہ راجپوتوں نے ان ۸۰ ٹھگوں کو گرفتار کیا جو کہ لیفٹیننٹ ماؤسیل کے قتل کے بعد نودھا میں آباد ہو گئے تھے' اور انہیں کئی بار تنبیہہ کرنے کے باوجود نہیں چھوڑا گیا' یہاں تک کہ ان میں سے ۳۰ قید میں مر گئے' انہوں نے ۲۵ روپیہ فی ٹھگ کے حساب سے ۱۴ ہزار روپے جمع کیے۔۔۔ مگر ان کے خاندانوں پر کیا بیتی؟ کیا وہ سب کے سب تباہ نہیں ہو گئے؟ ان کا کوئی بچہ تک زندہ نہیں رہا۔ رائے سنگھ حوالدار نے جب پیسہ لیا' تو اس کے دوسرے دن ہی اس کا اکلوتا لڑکا اور سب سے عمدہ گھوڑا مر گئے اور وہ خود بھی بیمار پڑ گیا اور جلد ہی بے بسی کی موت مرا"۔
ناصر ٹھگ نے کہا "دیوی ہماری اس لیے حفاظت کرتی ہے کہ ہم اس کے احکامات مانتے ہیں......"
"تمہارا یہ عقیدہ ہے کوئی آدمی' آدمی کو قتل نہیں کرتا ہے' بلکہ جن کو گلا گھونٹ کر مارا جاتا ہے' وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے"۔
"یقیناً"۔
"پھر ان ٹھگوں کے بارے میں کیا کہو گے جنہیں قتل کے الزام میں ساگر اور جبل پور میں پھانسی دی گئی؟"
"یہ بھی خدا کے حکم سے ہوا"۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہم ٹھگوں کو بغیر خدا کی مرضی کے نہ پکڑ سکتے ہیں' نہ قتل کر سکتے ہیں؟"

"بالکل"۔

"تو پھر یہ صحیح ہے کہ ہمارے اب تک کے اقدامات خدا کی مرضی کے مطابق ہوئے ہیں"۔

"جی ہاں"۔

"ٹھگوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد کتنی ہے؟"

فرنگیا نے جواب دیتے ہوئے کہا "اودھ میں دس میں سے نو مسلمان ہیں' دوآبہ میں پانچ میں سے چار ہندو ہیں' نربدا کے جنوب میں ۳/۴ مسلمان ہیں' راجپوتانہ میں ۱/۴ مسلمان ہیں' بنگال' اڑیسہ اور بہار میں آدھے آدھے ہیں۔ یہ ایک سرسری اندازہ ہے"۔

▲ ▼ ▲

ٹھگوں میں اس بات کا عقیدہ ہے کہ ان کی برادری کی ابتداء میں روحانی قوتیں کارفرما تھیں۔ ان کے اس عقیدہ کو اس تصویر سے تقویت ملتی ہے جو ایلورا کے مقام پر ایک چٹان پر کھدی ہوئی ہے۔ یہ تصویر زیر زمین غاروں میں چٹانوں پر بنائی گئی ہے' وہیں پر کالی کی ایک بڑی شکل بنی ملتی ہے جس کے ساتھ کنول کا پھول ہے اور اس کے دونوں جانب ہاتھی بنے ہوئے ہیں' جن کی سونڈیں مل کر اس کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ تصویر خاص مندر کے اندر داخل ہوتے ہی ہے۔

سلیمن نے فرنگیا سے پوچھا۔

"تم نے مسٹر جانسٹن سے ذکر کیا تھا کہ تمہارے کاروبار کے طریقوں کے بارے میں ایلورا کے غار کی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے"۔

دورگاہ نے کہا "ہاں ہمارے کاروبار کے طریقوں کو ان غاروں میں دیکھا جا سکتا ہے"۔

ایک دوسرے ٹھگ نے' جس کا نام چھوٹے تھا' کہا "جب کبھی بھی ہم وہاں سے قریب ہوتے یا ادھر سے گزرتے تو ان غاروں کی سیر کرتے تھے۔ وہاں ہر آدمی کے

کاروبار کے بارے میں تصویریں ہیں' چاہے وہ کتنا ہی خفیہ کیوں نہ ہو' اور یہ ساری تصویریں ایک رات میں بنائی گئی ہیں"۔

"کیا تمہارے علاوہ کوئی اور بھی اس پر یقین رکھتا ہے کہ ان تصویروں میں کوئی ایک ٹھگوں کے بارے میں ہے؟"

"نہیں کوئی نہیں" فرنگیا نے کہا "مگر یہ بات تمام ٹھگ جانتے ہیں اور ہم کسی کو نہیں بتاتے کہ ہم ان تصویروں کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ وہاں ہر آدمی اپنے کاروبار کے بارے میں خفیہ باتیں دیکھتا ہے مگر وہ کسی کو بتاتا نہیں ہے اور کوئی دوسرا آدمی سمجھ بھی نہیں سکتا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ وہ سارے کام خدا کے بنائے ہوئے ہیں' اس کو بنانے میں کسی انسان کی شرکت نہیں' اس کو تو سبھی مانتے ہیں"۔

"اس میں کون سی خاص باتیں ہیں جو ٹھگوں کے بارے میں ہیں؟"

"صاحب خان نے کہا "میں نے اس میں ورغلانے والے کو ایک مسافر کے ساتھ قالین پر بیٹھے ہوئے گفتگو میں مصروف دیکھا' بالکل اسی طرح جیسے ہم مسافروں سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سین میں گلا گھونٹنے والا رومال سے اس کی گردن کو مروڑ رہا ہے' جبکہ دوسرا اس کی ٹانگوں کو پکڑے ہوئے ہے"۔

"میں نے بھی یہ دیکھ رکھی ہیں" ناصر نے کہا "ایک نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ رکھا ہے اور دوسرا رومال سے اس کی گردن کو جکڑے ہوئے گلا گھونٹ رہا ہے"۔

"کیا تم نے ان کے علاوہ اور بھی تصویریں دیکھی ہیں؟"

فرنگیا نے کہا "میں نے یہ دو دیکھی ہیں' اس کے علاوہ ایک میں لغائی مردہ جسموں کو لے جا رہے ہیں اور گورکن مقدس پہاڑوں سے قبریں کھود رہے ہیں۔ یہ سب بالکل اسی طرح سے ہے جیسے کہ ہم کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ صحیح چیز اور کوئی نہیں ہوسکتی ہے"۔

"تمہارا کیا خیال ہے' یہ کام کس نے کیا ہے؟"

"یہ تو یقینی ہے کہ یہ کام ٹھگوں کا نہیں' کیونکہ وہ اپنے کاروبار کے راز کس پر ظاہر نہیں کرتے اور ان کے علاوہ کوئی اور دوسرا شخص یہ کام کر نہیں سکتا' اس لیے یہ خدا کا ہی کام ہوسکتا ہے' انسانی ہاتھ اس قدر مہارت کا ثبوت نہیں دے سکتا"

فرنگیا نے کہا۔

"اور یہ فرض کرتے ہوئے کیا تم اس کی پوجا کرتے ہو؟"

"نہیں" صاحب خان نے کہا "ہم وہاں اپنے تجسس کی تشفی کے لیے جاتے ہیں' پوجا کرنے نہیں۔ ہم اس کو مقبرہ کی مانند سمجھتے ہیں کہ جہاں ہر قسم کی نت نئی تصویریں ہیں کہ جنہیں شاید ان شیطانوں نے بنایا ہو کہ جو انسانوں کے تمام خفیہ کاروبار کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں اور ان کی تصویر کشی کر کے انہوں نے اپنے لیے تفریح کا سامان مہیا کیا ہو"۔

▲ ▼ ▲

کیپٹن جیمس پیٹن' جو اودھ کے ریذیڈنٹ کرنل لو کا اسسٹنٹ تھا' اس نے بھی بہت سے ٹھگوں کو گرفتار کیا تھا اور ان سے سوالات کیے تھے۔ اکثر سلیمن سے زیادہ تفتیشی انداز میں' اس کے نتیجے میں بھی بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔

"کیا ٹھگ اپنے ساتھیوں کی عزت کرتے ہیں یا انہیں برا سمجھتے ہیں کہ جنہوں نے بہت زیادہ لوگوں کو گلا گھونٹ کر مارا ہو؟"

"وہ بورکی یا ماہر ٹھگ کی عزت کرتے ہیں" بہرام نے کہا "اس کی خدمت کے لیے قبولیا ٹھگ حاضر رہتے ہیں اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس کی مالش کرنا' سر' پیر دبانا اور اس کا سامان اٹھانا۔ وہ اکثر گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ جو ٹھگ ہم سے علیحدہ ہو جاتا ہے ہم اس کی عزت نہیں کرتے"۔

"کیا تم اپنی قتل و غارت گری کی مہم پر خوشی سے جاتے ہو یا افسوس کے ساتھ؟"

"خوشی کے ساتھ" بہرام نے کہا "اگر ہمیں خوشی نہ ہو تو ہم آخر جائیں کیوں؟ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"خصوصیت کے ساتھ ہمیں اس وقت بڑی خوشی ہوتی ہے' جب کہ مہم پر جانے سے پہلے ہمیں اچھا شگون مل جائے" رمبا' ہندو ٹھگ نے کہا۔ "بھوانی ہماری ہمت بڑھاتی ہے اور یہ تباہی کی دیوی ہے جس کی تمام ہندو پوجا کرتے ہیں"۔

"کیا ٹھگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ گلا گھونٹنے کی ذمہ داری انہیں دی جائے یا وہ

اس بات کی خواہش کرتے ہوں کہ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیا جائے؟"
رمبا نے جواب دیا "کچے دل والا ٹھگ تو اس سے جی چراتا ہے' مگر بہادر اور جرات مند اس کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا ہے"۔
"کیا کسی کا گلا گھونٹنے کے لیے زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے؟"
"ہاں' اس کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے' دونوں ہاتھوں کے لیے' تاکہ یہ کام جلدی ہو جائے۔ اگر کام میں ذرا بھی گڑبڑ ہو جائے تو پھر وقت لگ جاتا ہے"۔
"اکثر لوگ لاشوں کو چھیڑتے ہوئے ڈرتے ہیں' کیا ٹھگوں کو اپنے ہاتھوں مارے ہوئے لوگوں کے مردہ جسموں کو اٹھاتے ہوئے کسی قسم کا احساس نہیں ہوتا؟"
مسلمان ٹھگ فتح خان نے جواب دیتے ہوئے کہا "اگر کوئی شخص فطری موت مرتا ہے تو ہم اس کے مردہ جسم کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں' لیکن جب ہم کسی کو قتل کرتے ہیں تو ہمیں پھر کوئی ڈر نہیں ہوتا' چاہے ہمارے اردگرد کتنی ہی لاشیں کیوں نہ ہوں' ہم ان کے درمیان بغیر کسی خوف کے بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر ہم لاشوں سے کیوں ڈریں کہ جنہیں ہم نے خود مارا ہو؟ یہ ہمارا کاروبار ہے' ہم مردہ جسموں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ان سے ہمیں بہت پیسہ ملے گا"۔
"کیا تمہیں اپنے مارنے والوں پر کوئی رحم نہیں آتا؟"
"کیا" الہ یار نے زور سے کہا "کیا قاتل کو بھی رحم آنا چاہیے؟"
"کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ٹھگ کبھی کبھی مسافروں کی نیک دلی اور مہذب برتاؤ سے متاثر ہو جائیں اور ان کو مارنے کا خیال ترک کر دیں؟ اور کیا ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ٹھگ کہ جو ابھی ابھی اس کاروبار میں آئے ہیں' انہیں رحم آ جائے اور وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے رحم کی درخواست کریں؟"
"ہم انہیں خاموش کر دیتے ہیں" الہ یار نے کہا۔
"وقت کے ساتھ ساتھ' جب انہیں کپڑے اور دولت ملتی ہے تو انہیں اس کاروبار سے خوشی ہونے لگتی ہے" فتح خان نے کہا۔
"اگر ہم ہر وقت رحم کرنے لگیں تو ہمارا کاروبار کیسے چلے؟" ایک ہندو ٹھگ شیو دین نے کہا۔

"کیا جن کا گلا گھونٹا جاتا ہے' وہ کوئی آواز نکالتے ہیں یا ان کی آواز کو دبایا جاتا ہے؟"

"نہیں کسی قسم کی آواز نہیں نکلتی" فتح خان نے کہا "ہاں' اگر کام میں ذرا بھی گڑبڑ ہو جائے تو کافی شور مچ جاتا ہے"۔

"کیا اس رومال سے' جس سے کہ تم گلا گھونٹتے ہو' اس کا نشان گردن پر رہ جاتا ہے؟"

"ہاں اس سے سرخ نشان باقی رہ جاتا ہے اور گردن سوج جاتی ہے"۔

"لیکن تم مردہ جسم پر خنجر کیوں مارتے ہو؟"

"تاکہ اس میں کوئی زندگی باقی نہ رہے"۔

"اور تاکہ بھوانی کو اس کا خون مل جائے' کیونکہ وہ خون سے خوش ہوتی ہے" فتح خان نے کہا۔

"کیا ٹھگ اپنے پڑوسیوں کے ہاں چوری کرتے ہیں؟"

اس پر چھ ٹھگ جو بیٹھے ہوئے تھے' انہوں نے سر ہلا کر ایک ساتھ کہا "ہرگز نہیں' ہم چوری کبھی نہیں کرتے"۔

"اگر ہمیں ہزار روپیہ چوری کرنے کا موقع ملے' تب بھی ہم ایسا نہیں کریں گے" اللہ یار نے کہا۔

فتح خان نے کہا "ہم کبھی چوری نہیں کرتے' خدا ہمیں جو بھی دیتا ہے وہ ٹھگی کے ذریعہ دیتا ہے"۔

"ہمارے گاؤں میں بہت سے چور تھے" شیو دین نے کہا "مگر میرے باپ نے مجھے ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ ان کا ساتھ کبھی نہ دوں کیونکہ وہ ٹھگی کے بغیر روپیہ حاصل کرتے ہیں"۔

بہرام نے فخر کے ساتھ کہا "ایک چور حقیر ترین چیز ہے اور ایک ٹھگ ــــــ گھوڑے پر سواری کرتا ہے' خنجر رکھتا ہے' سینہ تان کر چلتا ہے' چوری ــــــ کبھی نہیں' چاہے کسی ساہوکار کا پورا خزانہ میرے سامنے ہو اور میں اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں اور اس کے باوجود کہ میں بھوک سے مر رہا ہوں' میں اس میں سے چوری نہ

کروں ـــــ لیکن اگر یہی ساہوکار سفر پر ہوگا تو میں اسے قتل کر ڈالوں گا......"

"کیا ٹھگ آپس میں ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے ہیں؟"

"ٹھگ صرف مخبروں کو مارتے ہیں' مگر ایک دوسرے کو نہیں"۔

"سارے ٹھگ بھائی بھائی ہوتے ہیں" دوسرے ٹھگ نے کہا۔

"کیا تم کسی ایسے ٹھگ کو جانتے ہو' جس نے خوب روپیہ اکٹھا کرنے کے بعد یہ پیشہ چھوڑ دیا ہو؟"

"ہاں' مگر وہ چاہے جس قدر بھی امیر ہو جائیں' اس پیشہ کو نہیں چھوڑ سکتے"۔

"تم مارنے والے لوگوں کی لاشوں کو کس طرح سے ٹھکانے لگاتے ہو؟"

فتح خان نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "اگر زمین زیادہ پتھریلی نہیں ہوتی تو ہم لاشوں کو چاقوؤں اور تلواروں سے ٹکڑے کر کے دفن کر دیتے ہیں اور اس خیال سے کہ لوگوں کو وہاں قبروں کا شبہ نہ ہو' ہم اسی جگہ کھانا پکاتے اور کھاتے ہیں اور رات کو انہیں مردہ جسموں پر سوتے ہیں اور آخر میں جلی ہوئی راکھ چھوڑ جاتے ہیں"۔

"کیا تم لوگ مردہ لوگوں کی قبروں پر کھانا پکاتے' کھاتے اور سوتے ہو؟"

"ہم کھانا پکاتے ہیں' کھاتے ہیں اور سوتے ہیں اور ایک یا دو دن وہاں اطمینان سے رہتے ہیں' لیکن اگر کوئی فطری موت مرتا ہے تو ہم شیطان کے خوف سے وہاں نہ کھاتے ہیں اور نہ سوتے ہیں"۔

(جارج برُوس' ص ۱۴۶ - ۱۸۲)

——— (۲) ———

دریائی ٹھگ

دریائی ٹھگ' اپنے ان بھائیوں کی طرح' جو جنگلوں اور میدانوں میں کام کرتے تھے' گروہ بنا کر رہتے تھے اور ان کے ہر رکن کا ایک مخصوص کام ہوا کرتا تھا۔ کچھ چپو چلانے والے' کچھ تاجروں کا روپ بھرنے والے یا عقیدت مند زیارت کرنے والے' جو دریا کے راستے بنارس یا الٰہ آباد جانے کا سوانگ بھرتے تھے......

دریائی اور بری ٹھگوں کے درمیان قتل کرنے کے طریقوں میں اختلاف تھا۔ دریائی ٹھگ اپنے شکاری کی گردن میں سامنے سے رومال ڈال کر اسے پیچھے کی جانب دھکا دیتے تھے' جبکہ بری ٹھگ پیچھے سے رومال گردن میں ڈال کر آگے کی جانب اسے جھکاتے تھے۔ بری ٹھگوں کے برخلاف دریائی ٹھگ عورتوں کو قتل نہیں کرتے تھے......

سلیمن نے ان کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

یہ دو یا تین سو کی تعداد میں ہیں اور ان کے پاس تقریباً بیس کشتیاں ہیں جو نومبر' دسمبر' جنوری اور فروری کے مہینوں میں دریائے گنگا میں ادھر سے ادھر جاتی رہتی ہیں۔ ہر کشتی میں اندازاً ۱۴ افراد ہوتے ہیں اور یہ سب ٹھگ ہوتے ہیں۔ اکثر کئی کشتیاں ایک ہی ٹھگ گروہ کی ہوتی ہیں' جو ایک دوسرے سے ۴ یا ۶ میل کے فاصلے پر رہتی ہیں اور اگر مسافر کسی ایک کشتی کے لوگوں پر اعتماد نہیں کرتے یا اس میں بیٹھنے سے پرہیز کرتے ہیں تو ٹھگ اشاروں سے دوسری کشتیوں کو اطلاع دے دیتے ہیں تاکہ وہ مسافروں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں۔

نیا دھوکہ باز مسافروں کو باتوں میں لگاتا ہے' اور پہلی کشتی والے پر اپنے شک و

شبہ کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح مسافر و کشتی والے' دونوں باہم ایک دوسرے کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔

وہ کشتی پر ایسی کوئی چیز نہیں رکھتے کہ جس سے شبہ ہو' کیونکہ ان کی کشتیوں کی کسٹم والے برابر تلاشی لیتے رہتے ہیں۔ ان میں ہندو' مسلمان دونوں مذاہب اور ہر ذات کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ دریائے گنگا میں بنارس اور کبھی کبھی کانپور تک چلے جاتے ہیں۔ جو ٹھگ بہار اور بنگال میں رہتے ہیں' وہ ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ یہ دریا کے کنارے واردات کرتے ہیں اور مردہ جسموں کو گنگا اور دوسرے بڑے دریاؤں میں بہا دیتے ہیں۔

ان کے ٹھکانے دریاؤں کے کنارے اس جگہ ہوتے ہیں کہ جہاں بڑی بڑی شاہراہیں آتی ہیں۔ یہاں یہ طویل عرصہ تک ٹھہرتے ہیں اور مسافروں کو قتل کرتے ہیں......

دریائی ٹھگوں کا جمعدار شاندار لباس زیب تن کر کے اپنے ملازموں کے ساتھ' جو کہ اس کا سامان اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں' اپنے ٹھکانے کے قریب شاہراہ پر اپنے شکار کی تلاش میں نکلتا ہے۔ جو مسافر اسے راستے میں ملتے ہیں' یہ ان سے خوش اخلاقی کے ساتھ سلام دعا کرتا ہوا چلتا ہے۔ ان سے معلوم کرتا ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا کہاں رکنے کا ارادہ ہے اور آخر میں انہیں بتاتا ہے کہ اس کا ارادہ بھی ادھر ہی جانے کا ہے۔ جب گرمی بڑھ جاتی ہے تو وہ ان سے کہتا ہے کہ وہ سڑک کے سفر سے تھک گیا ہے اور اس کے مقابلے میں دریائی سفر زیادہ خوشگوار ہوگا اور یہ کہ وہ چند کشتی والوں کو جانتا ہے اور ان سے بات کر کے کرایہ بھی کم کرا لے گا۔ مسافر کے لیے یہ پیشکش بڑی اچھی ہوتی ہے' اس لیے وہ دونوں قریب کے کنارے کی طرف جاتے ہیں' جہاں ٹھگ اپنی کشتی لیے ہوئے ان کے انتظار میں ہوتے ہیں۔

یہاں پر ایک بناوٹی سین ہوتا ہے۔ کشتی والا جمعدار سے کرایہ کم کرنے سے بالکل انکار کر دیتا ہے' لیکن جب وہ اور مسافر واپس جانے کے لیے پلٹتے ہیں تو وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مسافر کشتی میں سوار ہوتا ہے اور اسے مہذب انداز

میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کس جگہ بیٹھے۔ اس کے بعد بادبان کھول دیے جاتے ہیں اور سفر شروع ہوتا ہے۔ دریائی ٹھگ کیسے مسافروں کو ٹھکانے لگاتے ہیں' اس کے بارے میں سلیمن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ

"حکم چند جوہری اور اس کے دو باڈی گارڈ دریائے گنگا میں کشتی کے کیبن میں بیٹھ گئے۔ حکم چند کلکتہ سے واپس اپنے گھر مرشد آباد جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ تین مسافر اور بیٹھے تھے جو اسے راستے میں ملے تھے۔ اس کے ساتھ وہ شخص بھی بیٹھا تھا کہ جو اسے راستہ میں ملا تھا اور جس نے اسے کشتی کے سفر پر آمادہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ چھ آدمی اور تھے جنہیں وہ مسافر سمجھ رہا تھا۔ سیٹھ کو لانے والے کا نام سروپ دت تھا جو کہ ایک ماہر اور مشاق گروہ سے تعلق رکھتا تھا' اس کے لیے سیٹھ اور اس کے آدمیوں کو پھانس کر لانا ایک معمولی سا کام تھا۔ دوسرے تاجر بھی ان کے شکاری تھے۔ دوسرے دریائی ٹھگوں کے جمعداروں کی طرح سروپ دت بھی ہر موقع پر ایک مسافر کا خود گلا گھونٹتا تھا۔ بیس سال تک اس پیشہ میں رہنے کے بعد اس کے لیے یہ معمول کی بات ہوگئی تھی اور اب اسے مارنے والوں کی تعداد بھی یاد نہیں رہی تھی۔

کشتی کنارے سے ہٹ کر بیچ دریا میں خاموشی سے چلنے لگی اور سروپ دت نے کیبن میں بیٹھے لوگوں کو اپنی میٹھی میٹھی باتوں میں لگا لیا' عورتوں کے بارے میں' تجارت کے بارے میں اور انگریزوں کی نئی فتوحات کے بارے میں۔ اس نے گفتگو جاری رکھی...... جب دریا میں کشتی رکی تو سروپ دت نے پوچھا کہ اسے کیوں روکا گیا ہے؟

"چپو چلانے والوں کو کچھ کھانے اور آرام کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بڑا تھکانے والا کام ہے" اسے جواب ملا۔

سروپ دت نے اس کے جواب میں کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے بھی کھانا کھا لینا چاہیے"۔ اس نے اپنے بنڈل میں سے کھانا نکالا۔ اس پر تقریباً سب ہی نے اپنا کھانا نکالنا شروع کر دیا۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو سروپ دت

نے کشتی والوں سے اپنی خفیہ زبان میں کہا کہ وہ فوراً آگے چلیں کیونکہ اس وقت دریا صاف ہے اور دور و نزدیک کوئی کشتی نہیں ہے۔

دوپہر کی گرمی اور کھانے کے نشہ سے مسافروں نے اونگھنا شروع کر دیا تھا۔ سات ٹھگ تنے ہوئے تیار بیٹھے تھے کہ اشارہ ہو اور وہ اپنا کام کریں۔ ان کی انگلیاں ان کے رومالوں پر پھر رہی تھیں۔ کشتی کے پانچ آدمی کیبن میں آئے اور سامان اٹھانے کے بہانے سے مسافروں کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ ادھر ڈیک پر زور سے کھٹکے کی آواز آئی جو کہ قتل کرنے کا اشارہ تھا۔ حکم چند کے بازوؤں کو جکڑ لیا گیا' اگرچہ اس نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کی مگر رومال نے کام کیا۔ وہ اور اس کے ساتھیوں کا لمحہ میں خاتمہ ہوگیا۔ سروپ دت نے رومال کو واپس جیب میں رکھا اور اپنے سامنے چھ مردہ جسموں کو دیکھا۔ اس وقت تک کشتی کے دوسرے ٹھگ ان کی تلاشی لینے میں مصروف تھے۔

اس کے بعد ٹھگوں نے ان کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑا' ان کے سروں اور بازوؤں کو جھٹکا دیا اور پھر ان کی بغلوں میں ہاتھ مارے۔ ان کا خیال ہے کہ ان زخموں کی وجہ سے مردہ جسم دریا کے نیچے رہیں گے اور اوپر نہیں آئیں گے۔۔۔۔ اس کے بعد انہیں دریا میں پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد تلاشی سے جو ایک ہزار دو سو روپے ملے' وہ تقسیم کر لیے گئے۔ اس طرح صبح کا کام ختم ہوا' کشتی کو کنارے لگا دیا گیا' ٹھگ تھک کر سو گئے۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد دت اور اس کے ملازم دوبارہ سڑک پر مسافروں کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔ اس طرح ہر ایک دن' ہر مہینے اور ہر سال یہ المناک وارداتیں ہوتی رہیں"۔

(جارج بروس' ص ۱۹۰ – ۱۹۲)

✿

کرنل سلیمن نے ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے مشاہدات پر مبنی "Rambles and Recollections of an Indian Official" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں اس نے ٹھگوں کے بارے میں بھی معلومات دی ہیں' اس کا پہلا اقتباس ایک ٹھگ کا بیان کردہ واقعہ ہے۔

✚

ایک تنومند مغل' کہ جو چہرہ بشرہ سے کسی امیر خاندان کا معلوم ہوتا تھا' پنجاب سے اودھ جا رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت ترکی گھوڑے پر سوار تھا اور ساتھ میں اس کے ایک خدمت گار اور سائیس تھا۔ جب اس نے میرٹھ کے قریب گنگا کو عبور کیا تو اسے اچھے کپڑوں میں ملبوس اور دیکھنے میں اچھے لوگوں کی ایک جماعت ملی جو کہ اسی راستے پر جا رہی تھی۔ انہوں نے مہذب انداز میں اس سے اپنا تعارف کرایا اور پھر اس سے گفتگو کی کوشش کرنے لگے۔ چونکہ اس نے ٹھگوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا' اس لیے اس نے انہیں زیادہ منہ نہیں لگایا اور ان سے کہا کہ وہ اس سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔ وہ اس کے اس شک پر مسکرائے اور کوشش کی کہ اس کے ذہن میں جو شبہ ہے' اسے دور کر دیں مگر اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔

جب انہوں نے دیکھا کہ مغل غصہ میں ہے اور ان کے ساتھ بات کرنے پر تیار نہیں تو وہ اس سے علیحدہ ہوگئے اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگے۔ دوسرے دن پھر اسے اتنے ہی لوگ ملے' مگر اس بار ان کے لباس مختلف تھے اور یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ وہ بھی اس سے ملے' اپنا تعارف کرایا' ساتھ میں اسے راستہ کے خطرات سے آگاہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اگر وہ ساتھ رہیں تو ان کی حفاظت کے لیے اچھا ہے۔ مغل افسر نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چلتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ راستے میں کسی کو ساتھ نہیں لے گا اور تنہا سفر کرے گا۔ جب ان لوگوں نے ساتھ رہنے پر زیادہ اصرار کیا تو اسے

غصہ آگیا اور اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر ان سے کہا کہ یا تو وہ بھاگ جائیں ورنہ وہ ان کے سر اڑا دے گا۔ اس کا حلیہ یہ تھا کہ اس کے کندھے پر کمان اور تیروں سے بھرا ترکش تھا' تو کمر کی بیلٹ میں پستول اور ایک طرف لٹکتی ہوئی تلوار' اور دیکھنے میں وہ بڑا غصیلا اور جواں مرد نظر آتا تھا۔

شام کو سرائے میں اس کے ساتھ ایک جماعت آ کے ٹھہری اور انہوں نے خدمت گار اور سائیس کے ساتھ دوستی کرلی اور انہیں بتایا کہ وہ بھی اسی راستے سے جا رہے ہیں۔ صبح مغل جلدی ہی سفر پر روانہ ہوگیا اور اس کے پیچھے پیچھے یہ جماعت چلی۔ انہوں نے بھی مغل سے اپنا تعارف کرا کے اس سے گفتگو کرنا چاہی مگر اس نے غصے سے انہیں دھتکار دیا۔

دوسرے دن صبح کو مغل افسر نے دیکھا کہ سڑک کے ایک آباد حصے میں چھ غریب مسلمان ایک لاش کے قریب بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سپاہی ہیں اور لاہور سے لکھنؤ اپنے اہل خاندان سے ملنے جا رہے ہیں۔ ان کا ایک ساتھی راستے کی تھکن اور مصیبتوں کی وجہ سے مرگیا ہے اور اب وہ اس کے لیے قبر تیار کرنا چاہتے ہیں' لیکن وہ چاہتے ہیں کہ دفن کرنے سے پہلے اس کی نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔ یہ کام وہ خود اس لیے نہیں کر سکتے کہ وہ جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ انہوں نے مغل سے درخواست کی کہ وہ یہ رسم انجام دے' کیونکہ یہ ثواب کا کام ہے اور اس کا اجر اسے آخرت میں ملے گا۔ یہ سن کر مغل گھوڑے سے اتر گیا۔ اس کے بعد فوراً قالین بچھایا گیا اور مغل نے تیر کمان' تلوار اور پستول اتار کر رکھے اور پھر پانی منگا کر وضو کیا۔ اس کے بعد اس نے نماز جنازہ پڑھانی شروع کی۔ اس وقت ان میں سے ایک نے اشارہ کیا (جھرنی کہلاتا ہے) اور فوراً ہی مغل' اس کے خدمت گار اور سائیس کے گلے میں رومال ڈال کر مار ڈالا گیا اور فوراً ہی انہیں وہیں دفن کر دیا گیا۔

اس مغل کو راستے میں جتنے گروہ ملے' وہ اودھ کے مشہور ٹھگ جمال دیہی کے تھے۔ مغل کو لوٹنے کی خاطر اور اس امید میں کہ اس کے پاس جواہرات و زیورات ہوں گے' انہوں نے مختلف حیلوں کو اختیار کیا اور سب میں ناکام ہو کر آخری حربہ اختیار کیا۔

(ص ۸۰ - ۸۲)

حصہ دوم

پنڈاری

پنڈاری

پنڈاریوں کی ابتداء اور عروج اس زمانہ میں ہوا جبکہ مغل حکومت زوال پذیر ہو رہی تھی اور اس کی جگہ نئی چھوٹی خودمختار سلطنتیں وجود میں آ رہی تھیں۔ مرہٹوں' جاٹوں' سکھوں اور روہیلوں نے اس سیاسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار شروع کر رکھی تھی۔ اس عرصے میں پنڈاریوں کا گروہ وجود میں آیا۔ ابتداء میں یہ مرہٹہ فوج کے ساتھ مل کر لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیتے تھے مگر بعد میں انہوں نے اپنے اپنے گروہ بنا لیے اور لوٹ مار' ڈاکہ زنی اور قتل و غارت گری کو باقاعدہ اپنا پیشہ بنا لیا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر لیا' تو ان کی سیاسی طاقت کے لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ ہندوستان میں وہ امن و امان قائم کریں' اور ڈاکوؤں' ٹھگوں اور پنڈاریوں کا خاتمہ کر کے نہ صرف لوگوں کو امن و امان کا احساس دیں' بلکہ تجارت اور زراعت کو بھی فروغ دیں۔ لہٰذا اس مقصد کے تحت' پنڈاریوں کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ مہم کا آغاز ہوا۔ سر جان مالکم' جو اس مہم میں اہم کردار ادا کرتا ہے' اس نے پنڈاریوں کی ابتداء اور ان کے خاتمہ کی تاریخ' اپنی کتاب "تاریخ وسط ہند" میں دی ہے۔ یہاں اسی کتاب سے یہ اقتباس دیا جا رہا ہے۔

✤

پنڈاریوں نے اس مختصر زمانے میں جب کہ وہ ہندوستان کے امن و امان کے نہایت خوفناک دشمن تھے اسے اپنا وطن یا مستقر بنایا تھا۔ اس لیے انہیں وسط ہند کی تاریخ سے خارج نہیں کر سکتے۔ ان لٹیروں کی بنا' کیرکٹر اور نظام ترکیبی کے متعلق چند خیالات اور ان کے چند مشہور و معروف سرداروں کی سوانح عمری کے مختصر سے خاکے سے مضمون کا یہ حصہ پورے طور پر بیان ہو جائے گا۔ تاریخ ہند میں لفظ پنڈاری اول مرتبہ ۱۶۸۹ء میں آیا ہے لیکن گزشتہ چند سال سے اس قوم یا اس جماعت نے اہمیت حاصل کی ہے اور اس کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ انہوں نے گمنام ڈاکوؤں کی حیثیت سے ترقی کر کے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ مختلف مرہٹہ حکمرانوں نے معاونتی فوج کے لیے انہیں نہایت کار آمد تصور کر لیا جن کی نبرد آزمائی کا غیر منظم طریقہ پنڈاریوں کی لوٹ مار کے خصائل کے لیے نہایت موزوں تھا۔ گاہے گاہے اراضیات عطا کر کے یا سچ پوچھیے تو ان علاقوں پر ان کا قبضہ رہنے کے حق کو صرف زبانی تسلیم کر کے جو انہوں نے غصب کر لیے تھے اور مرہٹہ فوج کو جس قدر لوٹ مار کی اجازت تھی اس سے زیادہ لوٹ مار کرنے کی ان کے ساتھ رعایت کر کے ان کی امداد خریدی گئی اور اس نظام کے تحت انہوں نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی۔ ان کے سرداروں نے ناموری حاصل کی اور اپنے حمایتوں سے خدمت لینے کا انہیں موروثی حق حاصل ہوگیا جو ان کی اولاد پر منتقل ہوتا گیا۔ مختلف فرقوں میں پنچایتی اتحاد قائم ہوگیا اور اس غدار قوم میں مشترکہ ارادہ نیت سے مشترکہ اغراض پیدا ہوگئیں۔

پنڈاریوں کو ابتدائی مرہٹوں سے نسبت دی جاتی ہے لیکن اگرچہ دونوں کے عادات و خصائل اور کیرکٹر یکساں تھے لیکن ان دونوں کی حالت میں بہت کچھ اختلاف تھا۔ سیوا جی اور اس کے جانشینوں کے وابستگان میں مذہبی رسم و رواج اور بھائی بندی کے رشتوں سے اتحاد قائم ہوا اور جوش ہمدردی پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک ہی فرقے اور ایک ہی صوبے کے تھے۔ وہ کسی جنگی سردار کی ہوسناکی یا محض لوٹ مار کی الفت کی وجہ سے دوڑ کر نہیں آئے تھے بلکہ ان کے دل میں اپنی مادر وطن اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی محبت تھی اور اس لیے ان کے اغراض جائز اور مستقل تھے۔ وہ اپنے فرمانرواؤں کے ناقابل برداشت ظلموں سے سخت بیزار ہوگئے تھے جنہوں نے ان کو

ستایا تھا۔ ان وجوہ سے اگرچہ ان کی تعداد کی بیشی میں موافقت پیدا ہوسکتی تھی مگر ان وجوہ نے ان کے اغراض اور اعمال میں یک جہتی اور اتحاد پیدا کر دیا جو پنڈاریوں میں مفقود تھا۔ پنڈاریوں کی تعداد کی فراوانی میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اگرچہ ان میں نااتفاقی تھی اور صرف کسی مشترکہ غرض کے وجود ہی سے ان میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جانے کا امکان تھا اور ان کی ترتیب میں بے حد وسعت تھی لیکن وہ اپنی قوم کے آوارہ گرد اور بے کار لوگوں کو اپنی جانب رجوع کرنے کے لیے مرکز کا کام دیتے تھے۔ اس وجہ سے ہر وقت ان کی اتنی بڑی تعداد موجود رہتی تھی کہ قابل اور مشہور سردار اس کو اپنی ذاتی عظمت حاصل کرنے یا دوسروں کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔

پنڈاری جب کسی زرخیز ملک میں پہنچتے تو تاتاریوں کی طرح جن سے انہیں نسبت دی جاتی ہے وہ نہ تو وہاں پر سکونت اختیار کرنے کی اور نہ آرام پانے کی خواہش کرتے اور نہ اس کے وسائل انہیں میسر تھے۔ وہ ٹڈی دل کی طرح اپنی فطرت کے اقتضا سے اس علاقے کو تباہ اور پامال کر ڈالتے جس میں وہ پہنچ جاتے تھے۔ ان کے سرداروں کو چند املاک بطور جاگیر کے مل گئی تھیں یا انہوں نے غصب کر لی تھیں لیکن ان کی املاک کی آمدنی ان کی تعداد کے دسویں حصے کے گزارے کے لائق بھی نہ تھی۔ اس لیے وہ صرف لوٹ مار پر گزر کر سکتے تھے۔ گزشتہ ۲۰ سال میں جو وسط ہند میں ان کے قیام کا زمانہ ہے ان کی تعداد کا اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر قسم کے ۲۰ ۔ ۳۰ ہزار سوار شامل تھے لیکن ایک ایسی جماعت کا صحیح تخمینہ لگانا قطعی ناممکن ہے جس کی تعداد ہمیشہ مختلف ہوتی رہتی ہے اور جو ناکامی سے گھٹ جاتی اور کامیابی سے بڑھ جاتی ہے۔ جو عادات و خصائل اور حالت کی یکسانیت کی بدولت ہر ایسے سردار سے جا ملتے ہیں جو کسی فرماں روا کے یہاں ملازم رہ چکا ہے لیکن اس فرماں روا کی کمزوری یا ظلم کو دیکھ کر وہ اس کی اطاعت سے سرکشی اختیار کرنا چاہتا ہے اور وہ ڈاکو بن جانے کا خواہاں ہے اور یہ بھی مدنظر رہے کہ پنڈاریوں کا گزارہ ان مصیبتوں پر تھا جو خود انہوں نے پیدا کر دی تھیں کیونکہ ان کی لوٹ مار کے حملوں کی

توسیع سے جائیداد غیر محفوظ ہو گئی تھی اور ان کی لوٹ کھسوٹ سے جو لوگ تباہ ہو گئے تھے انہوں نے مجبور و معذور ہو کر ظلم و ستم ڈھانے پر کمر باندھ لی چونکہ اب ان کے لیے معاش کا صرف یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھی اس لہر میں جا ملے جس کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتے تھے اور دوسروں کو لوٹ کر انہوں نے اپنے نقصانات کی تلافی کر لی۔ ان حالات کے باعث پنڈاریوں کی تعداد کے متعلق سب تخمینے غلط ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ ہندوستان کی جنگی آبادی کے آوارہ گرد حصے سے اس طرح مل گئے تھے کہ وہ ایک نظام نہ کہ کوئی خاص قوت بن گئے تھے جسے شکست کرنا مطلوب تھا۔

پنڈاریوں کے لوٹ مار کے حملوں کی مدافعت کا انتظام یا ان کے سرداروں پر معمولی حملے کرنا یہ دونوں تدبیریں اس خرابی کے انسداد کے لیے یکساں بے سود اور بے اثر ثابت ہوئیں کیونکہ جب شیش ناگ کا ایک سر کچل دیا جاتا تو اس کے دوسرا سر اور پیدا ہو جاتا تھا اور جن حکومتوں نے ان کو دبانے کی کوشش کی ان کے وسائل ایک ایسے دشمن کے مقابلے کے لیے فضول ضائع کیے گئے جن کو اپنی کامیابی سے ہر بات کی توقع تھی اور شکست کھانے پر ان کی حالت چنداں مخدوش نہ ہوتی تھی۔ اس بات کو سمجھنے کے واسطے ہم ان لٹیروں کے طرز جنگ کو بیان کرتے ہیں جب وہ کسی حملے پر روانہ ہوتے تھے تو وہ کسی ایک یا چند چیدہ سرداروں کے ماتحت بن جاتے تھے جنہیں لیبریا کہتے تھے۔ جو اس ملک کی بابت اپنی معلومات کے باعث منتخب ہوتے تھے جس پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تھا۔ پنڈاریوں کے پاس خیمے یا اور کچھ سامان سفر نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک سوار اپنے کھانے کے لیے چند روٹیاں اور اپنے گھوڑے کے لیے تھوڑا سا دانہ اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ جماعت جس میں عموماً ۲ یا ۳ ہزار شہسوار اور اسی نسبت سے ان کے ہمراہی ہوتے تھے۔ وہ ۴۰ یا ۵۰ میل روزانہ کے حساب سے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوتی اور کوئی سوار دائیں بائیں مڑ کر نہ دیکھتا۔ حتیٰ کہ وہ منزل مقصود پر جا پہنچتے تھے اور پھر ٹولیوں میں تقسیم ہو کر مویشیوں اور مال و اسباب کا صفایا کرتے جو ان کے ہاتھ آ جاتا اور اسی دوران میں نہایت خوفناک مظالم کرتے اور جس چیز کو وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے تھے اسے تباہ و برباد کر ڈالتے تھے۔ وہ چپکے سے

اچانک حملہ کر دیتے تھے تاکہ اس شہر کی سرحد کی محافظ سپاہ کی گرفت سے بچے رہیں
جس پر کہ انہوں نے حملہ کیا ہے۔ اپنے خلاف کسی فوج کی آمد سے پیشتر ہی وہ واپس
چلے جاتے تھے۔ انہیں خاص قوت یہ حاصل تھی کہ وہ کسی کی گرفت میں نہیں آسکتے
تھے۔ اگر ان کا تعاقب کیا جاتا تو وہ نہایت طویل کوچ کرتے (بعض وقت ۴۰ میل سے
بھی زیادہ) اور ایسے راستوں سے جاتے جن پر کسی باقاعدہ فوج کا سفر کرنا قطعی ناممکن
ہے۔ اگر تعاقب کرنے والے ان تک جا پہنچتے تو وہ منتشر ہو جاتے اور کسی ایک مقررہ
مقام پر پھر آکر جمع ہو جاتے تھے اور اگر اس شہر تک ان کا پیچھا کیا جاتا جہاں سے وہ
روانہ ہوتے تھے تو پھر وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ ان کی دولت'
مال غنیمت اور اہل و عیال ایک نہایت وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے جس میں کہ
انہیں پناہ ملتی تھی اور یہ مقامات پہاڑوں یا قلعہ جات میں تھے جن کے یا تو وہ خود
مالک تھے یا وہ مقامات ان روسا کی ملکیت تھے جن کے ساتھ ان کے خفیہ یا علانیہ
تعلقات قائم تھے لیکن ان میں سے کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ان پر حملہ ہو سکتا ہو اور
کسی ایک جماعت کی شکست یا ان کی ایک چھاؤنی کی بربادی یا ان کی چند گڑھیوں پر
عارضی قبضہ کر لینا ایک ڈاکو کو نیست و نابود کرنے سے زیادہ کچھ اثر نہ کرتا تھا۔ جس
کی جگہ اس سے زیادہ نڈر اور من چلا ڈاکو پر کر دیتا تھا۔

پنڈاری جو کمزور اور قریب الختم ریاستوں کی خرابیوں کی بدولت جانور کے سڑے
ہوئے گوشت کی مانند پیدا ہوگئے تھے' خوش قسمتی سے ان میں کوئی رشتہ اتحاد موجود نہ
تھا جو مصیبت کے وقت ان لوگوں کو مربوط اور متحد کر دیتا۔ ان کے یہاں نہ تو کوئی
مذہبی تعلق تھا اور نہ قومی خیالات تھے۔ ان میں ہر ایک ملک اور ہر مذہب کے لوگ
شامل تھے۔ وہ کسی مایوسی اور مصیبت کے باعث مجتمع نہیں ہوتے تھے' بلکہ ہندوستان
کی اصلی حالت کو دیکھ کر انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس وقت ڈاکو جیسی زندگی بسر
کرنے میں خطرہ کم اور نفع زیادہ ہے۔ اس قسم کی جماعت البتہ اس وقت ہیبت ناک
متصور ہو سکتی تھی جب کہ وہ کسی مضطرب جماعت کا جزو سمجھی جاتی جس کے ہر ایک
شعبے سے ان کا تعلق ہوتا۔ انہوں نے اس وجہ سے بہت اہمیت حاصل کر لی تھی کہ

ان کی مثال مہلک متعدی بیماری جیسی تھی اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ وسط ہند میں جو تھوڑی بہت حکومت باقی رہ گئی یہ لوگ بہت جلد اس پر بھی فتح یاب ہو جائیں گے اور ان کی جماعت میں وسط ہند کی جنگی آبادی شامل ہو کر اس کی تعداد کو نہایت عظیم الشان بنا دے گی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنڈاریوں کو مرہٹے لائے جو وسط ہند میں آباد ہوگئے۔ غازی الدین ایک شخص تھا جو باجی راؤ اول کے یہاں ملازم تھا اور جب وہ بمقام اجین ایک فوجی دستے میں نوکر تھا اس وقت اس کا انتقال ہوگیا۔ اس نے دو فرزند گردی خان اور شہباز خان چھوڑے۔ بڑا بیٹا اگرچہ صرف ۱۲ برس کا تھا لیکن وہ باپ کا جانشین ہوا اور ایک جماعت کا کمان دار ہوگیا جو لوٹ مار کی مہم پر روانہ کی گئی تھی۔ ملہار راؤ ان لوگوں کی کامیابیوں سے اس درجہ خوش ہوا کہ اس نے اس جماعت کے سردار کو ایک زرین جھنڈا عطا فرمایا جس کی بدولت اس نے اپنے ہمراہیوں کی تعداد میں اضافہ کر لیا۔

یہ بات خصوصیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس کے آدمی دوسری فوج سے بالکل علیحدہ خیمہ زن ہوتے تھے اور بڑے شاطر ڈاکو تھے۔ اگرچہ اپنے قبیلے کے نام سے وہ تورائی کہلاتا تھا (اور یہ فرقے والے اب بھی معزز شخص کو تورائی کہتے ہیں) اس شخص کے ہمراہی مجموعی طور پر پنڈاری کہلاتے تھے۔ ملہار راؤ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو گردی خان اس کے ساتھ گیا اور مدت العمر اسی رئیس کے پاس رہا۔ جن قزاقوں کا وہ سپہ دار تھا ان کے کارنامے مرہٹوں کی کارگزاریوں میں شامل ہیں جن کے ساتھ وہ شریک تھے۔ لیکن غالباً ان قزاقوں کے مظالم مرہٹوں کے ظلم و ستم سے بھی زیادہ تھے۔ کیونکہ لوٹ مار ہی ان کی بسر اوقات کا وسیلہ تھا۔

ان غارت گر فاتحین کا مقصد نہایت بے دردی کے ساتھ غیر محفوظ صوبوں کو تباہ کرنا تھا اور پنڈاریوں سے ان صوبوں کو تباہ کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ پنڈاری دیگر افواج کے آگے روانہ کر دیے جاتے تھے۔ چونکہ ان کا کام جنگ کرنا نہیں تھا بلکہ لوٹ مار کی خدمت ان کے سپرد تھی۔ پنڈاریوں نے ایک بہادر جماعت کی حیثیت سے

کبھی ناموری نہیں حاصل کی اور نہ ان کے مظالم کی تاریخ میں ہمدردی اور فیاضی کی وہ مثالیں پائی جاتی ہیں جو اکثر خونخوار قزاقوں کی داستان میں شامل ہوتی ہیں۔ چونکہ وہ مرہٹوں کے مہتر ہونے کی حیثیت سے نہایت ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے تھے اس لیے ابتدا ہی سے ان کے عادات اور ان کے کیرکٹر نے ایسی شکل اختیار کی تھی جو اس کام کے لیے نہایت موزوں تھا جو انہیں انجام دینا ہوتا تھا۔ بے شک ان کے سرداروں اور بہت سے ہمراہیوں میں اولوالعزمی اور دلیری کے اوصاف اکثر پائے جاتے تھے لیکن فتح اور شکست کے موقع پر ان میں سے کسی شخص نے بھی اپنی کوئی شریفانہ خصلت نہیں ظاہر کی۔ یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ ان لٹیروں میں سے کبھی کسی فرد نے بھی ناموری حاصل کرنے کا استحقاق نہیں پیدا کیا البتہ سب نے جہالت' رذالت' سفاکی اور شقاوت قلبی میں ضرور حصہ لیا اور بحیثیت ایک جماعت کے یہ لوگ اپنے انہی اوصاف کے لیے مشہور تھے۔ ایک ایسی قوم کی داستان سے سوائے ان باتوں کے اور توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ گردی خان اپنا کیمپ یا دڑا اپنے فرزند لعل محمد کے لیے چھوڑ گیا۔ لعل محمد کا جانشین، اس کا بیٹا امام بخش ہوا۔ اس سردار کی حکومت اس کی خواہش کے بموجب اس کے خاندان میں نہیں رہی۔ کیونکہ بہت سے عہدہ داروں نے اپنی آزادانہ کمان قائم کر لی۔ لعل محمد کے متعلق بہت کم بیان کیا گیا ہے اور امام بخش جو آج کل بھوپال میں قید ہے اگرچہ اہلیہ بائی نے اسے ایک گاؤں عطا کر دیا تھا لیکن وہ کوئی مشہور سردار نہ تھا۔ البتہ قادر بخش ایک جاہل اور بہادر شخص تھا۔ وہ ہلکر کے یہاں ملازم تھا اور وہ پچھلے دنوں میں اس فرقے کا خاص سردار تھا۔ اس کی زندگی کی کارناموں میں ایک پنڈاری کے معمولی واقعات سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ گزشتہ جنگ کے اختتام پر اس نے اطاعت قبول کر لی اور اس نے اب ہندوستان کے ضلع گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی ہے اور وہ حکومت برطانیہ کی فیاضی پر بسر اوقات کرتا ہے۔

گزشتہ لوٹ مار کے واقعات میں جو پنڈاری دربار ہلکر کے یہاں ملازم رہے تھے ان میں سے قادر بخش کے ہم پلہ ٹکو خان اور بہادر خان دو پنڈاری سردار تھے۔ وہ خود حاضر ہو گئے اور انہیں تھوڑی سی اراضیات دے دی گئی ہیں جو ان کی کاشت میں

ہیں۔

مرقومہ بالا پنڈاری سرداروں کے ہمراہیوں کی تعداد ۳ - ۴ ہزار سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ آخر تک اس خاندان کے مطیع اور فرماں بردار رہے جس کے یہاں وہ ملازم تھے اور اس وجہ سے وہ ہلکر شاہی کے نام سے موسوم تھے۔

ملہار راؤ اور تکاجی ہلکر کے زمانے میں پنڈاری جب مرہٹوں کے کسی علاقے میں پہنچتے تھے تو وہ علیحدہ خیمہ زن ہوتے تھے اور انہیں لوٹ مار کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس صورت میں انہیں ۲ روپیہ یومیہ فی کس کے حساب سے الاؤنس دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی بسر اوقات کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ وہ اپنے ٹٹوؤں اور بیلوں سے غلہ' چارہ اور لکڑی لاد کر لے جانے کا کام لیتے تھے کیونکہ ان اشیاء کے لیے پنڈاری بازار بڑا دساور تھا۔ جب غنیم کے ملک میں داخل ہونے سے چند روز پیشتر انہیں لوٹ مار کی اجازت دے دی جاتی تھی تو ان کا الاؤنس بند کر دیا جاتا تھا اور اس حملے کے اختتام سے پیشتر ان لٹیروں کی کچھ روک ٹوک نہیں کی جاتی تھی اور پھر مرہٹہ کمان دار اگر طاقتور ہوتا تو عموماً وہ پنڈاری سرداروں کو گرفتار کر لیتا یا ان کے کیمپ کا محاصرہ کر لیتا تھا اور مال غنیمت کا بیشتر حصہ ان سے چھین لیتا تھا۔ اس طرز عمل سے واقف ہو کر پنڈاری سرداروں نے اپنے جور و ستم کو دو چند کر دیا تھا تاکہ وہ بغیر تباہی کے اپنے آقاؤں کی اس متوقع لوٹ کھسوٹ کو برداشت کر سکیں۔

جسونت راؤ ہلکر کے مجنون ہو جانے کے زمانے تک جو پنڈاری سردار اس ریاست میں ملازم تھے وہ اپنی مناسب حیثیت پر برقرار رہے۔ وہ بڑے بڑے گروہوں کے کمان دار تھے لیکن راجہ کے سامنے انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ جسونت راؤ نے جب محاربہ پنجاب سے قبل دولت راؤ سندھیا سے ملاقات کی تو جسونت راؤ نے اسے بہت پھٹکارا کہ اس نے پنڈاری سرداروں کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ آپ ان سے خود بات چیت کرتے ہیں اور آپ نے انہیں خطابات اور جاگیرات عطا کی ہیں حالانکہ وہ اس قسم کے اعزاز کے ہرگز مستحق نہ تھے۔ جسونت راؤ پنڈاریوں کی ترقی کے خطرے سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے ان کا یک قلم استیصال کرنے کی ایک تجویز سوچی تھی لیکن اس کے پاگل ہو جانے کے بعد منابائی اور دیگر لوگوں نے جو اس کی

ریاست کے دعویدار ہوئے پنڈاریوں کی قوت بڑھانے کے لیے ہر طرح پر کوشش کی۔ اس لیے ہلکر شاہی پنڈاریوں کے سرداروں کی وقعت قائم ہوگئی اور نہ صرف ان کی تعظیم و تکریم ہوتی تھی بلکہ ان کے اور ان کے ہمراہیوں کے گزارے کے واسطے جاگیرات عطا کی گئیں۔

یہ بات بیان کر دی گئی ہے کہ غازی الدین پنڈاری سردار نے جب اس کا اجین میں انتقال ہوا تھا دو فرزند چھوڑے تھے۔ اس کا بڑا بیٹا ملہار راؤ ہلکر کے یہاں رہا۔ چھوٹا لڑکا شہباز خان اپنے باپ کے انتقال کے وقت شیرخوار بچہ تھا۔ جب وہ بڑا ہوگیا تو اس نے رانوجی سندھیا کے یہاں نوکری کر لی جس کی نوازشات سے شہباز خان کو کمان دار بنا دیا۔ ابتدا ہی سے اس کی فوج پنڈاریوں کی تھی۔ شہباز خان رانوجی کے ساتھ ہندوستان گیا اور وہ ریاست جے پور میں بمقام ٹونک ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس نے ہیرا اور برن دو لڑکے چھوڑے تھے اور ان دونوں نے مادھوجی سندھیا کی فوج میں بحیثیت پنڈاری سردار ناموری حاصل کی۔ اس فوج کے ہمراہ وہ ہندوستان گئے تھے۔ وہ بیرسیہ کے قریب مع ۵ ہزار ہمراہیوں کے خیمہ زن ہوئے اور انہوں نے ریاست بھوپال کی خدمت میں اپنی خدمات پیش کیں تاکہ نواب بھوپال کی اجازت لے کر وہ ریاست ناگپور کے علاقوں کا صفایا کر دیں جس سے ریاست بھوپال کی لڑائی تھی۔ یہ واقعہ چھوٹا خان کے انتقال کے بعد ہی پیش آیا تھا جب کہ راجا ہمت راؤ برائے نام دیوان ریاست تھا۔ ان لٹیروں کی یہ درخواست بنظر احتیاط (جو سندھیا کے حمایتی خیال کیے جاتے تھے) منظور نہ کی گئی اور وہ ناگپور چلے گئے جہاں پر رگھوجی بھونسلا نے ان کی بڑی خاطرداری کی اور اس راجا نے انہیں پہلا حکم یہ دیا کہ وہ ریاست بھوپال کو تاخت و تاراج کر ڈالیں جو اس وقت نہایت خوش حال تھی۔ پنڈاریوں نے اس خدمت کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ انہوں نے ریاست کو اس قدر زبردست نقصان پہنچایا کہ یہ ریاست ابھی تک نہیں پنپنے پائی ہے۔ جن لوگوں کو پنڈاریوں کی ظالمانہ سفاکیوں سے نقصان پہنچا ان کے لیے یہ بات کسی قدر تسلی کے لائق ہے کہ پنڈاریوں کے حاصل کیے ہوئے مال غنیمت کی بابت نہایت مبالغہ آمیز خبریں سن کر راجہ کی حرص و طمع اس قدر بڑھ گئی کہ جب پنڈاری راجا کے مستقر پر واپس آگئے تو

اس نے پنڈاریوں کے خیمے کا محاصرہ کر کے نہ صرف اسے لوٹ لیا بلکہ اس نے پنڈاری سردار برن کو گرفتار کر لیا جو بعد میں قید خانے میں مر گیا۔ اس کا بھائی ہیرا دولت راؤ سندھیا کے پاس پونا بھاگ گیا اور اس کے بعد ہی اس نے بھی بمقام برہان پور وفات پائی۔

دوست محمد اور واصل محمد اپنے باپ ہیرا کے پڑاؤ کے وارث بنے جو اپنے آپ کو دولت راؤ سندھیا کے پیروؤں میں شمار کرتے تھے جس کے وہ عموماً اطاعت گزار تھے مگر کبھی کبھی سرتابی سے بھی کام لیا کرتے۔ ان کی روش پنڈاری سرداروں کے عام انقلابات کے اثر سے خالی نہ تھی۔ ان کا پڑاؤ مالوے کے شرقی علاقے میں ہوتا تھا۔ چند سال ہوئے کہ دوست محمد کا انتقال ہوگیا اوز سارے دڑے کی کمان واصل محمد خان کے ہاتھ میں آگئی جس نے لٹیروں کی ان جماعتوں کی رہنمائی کی جنھوں نے برطانوی علاقوں میں چھاپے مارے۔ اس وجہ سے حکومت برطانیہ ان سے ناراض ہوگئی۔ جب ۱۸۱۷ و ۱۸۱۸ء کے حملے میں پنڈاریوں کو شکست دی گئی اور وہ منتشر کیے گئے تھے اس زمانے میں واصل محمد خان کچھ عرصے تک مفرور رہا اور پھر گوالیار جا پہنچا جہاں پر اسے یہ امید تھی کہ دولت راؤ سندھیا اب بھی اسے پناہ دے گا۔ گرچہ وہ چھپا رہا لیکن برطانی نمائندے نے نہایت ہوشیاری سے اس کا پتا لگا لیا اور اس قدر استقلال کے ساتھ اس کی گرفتاری کا مطالبہ پیش کیا جو نہیں ٹالا جاسکتا تھا اور اگرچہ سندھیا کو اپنے وعدوں کے ایفا کرنے اور اپنی عزت کے خیال سے کسی قدر پس و پیش ہوا لیکن آخرکار وہ صادق القول رہا۔ اس نے پنڈاری سردار ہمارے حوالے کر دیے۔ واصل محمد خان غازی پور بھیج دیا گیا جہاں پر میجسٹریٹ نے اس کے ساتھ کریمانہ سلوک کیا اور حکومت برطانیہ نے فیاضانہ پالیسی کے خیال سے اس کی تقصیرات معاف کر دینے کی رائے قائم کی اور اپنے ممالک محروسہ میں دیگر مجرمان کی طرح اس کے گزارے کا بندوبست کر دیا لیکن اس کی حمیت نے قید اور ذلت کو گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن اس کی تجویز معلوم ہوگئی۔ اس نے زہر کھا لیا جو اس نے تیار کیا تھا اور اسی جگہ پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔

برن کے قید ہو جانے پر اس کا لشکر دولہ جمعدار کو منتقل ہوگیا۔ اس کے انتقال پر

اس کا فرزند راجن برائے نام سردار بن گیا۔ مگر اصلی اختیارات ایک بہادر سردار کو مل گئے جس نے اپنی جواں مردی اور اولوالعزمی سے کمان حاصل کر لی۔ اس شخص کا نام چیتوخان تھا—— وہ دہلی کے قریب میوات کا باشندہ تھا۔ اولاً وہ بطور غلام کے گرفتار ہوا تھا اور پھر دولہ خان نے اسے اپنا کنور یعنی بیٹا بنا لیا اور بہت سے انقلابات کے بعد اس نے یہ رتبہ حاصل کر لیا کہ اپنے محسن کے فرزند کے ساتھ اس کے برتاؤ اور سلوک کی تعریف ہونے لگی اور جسے وہ ابھی تک لشکر کا سردار تصور کرتا تھا لیکن چیتو نے اس معاملے اور کئی دیگر امور میں اپنی دانائی اور فرزانگی ظاہر کی۔ اس نے راجن کی طرف توجہ کر کے نہ صرف پنڈاریوں کو راضی کر لیا کیونکہ وہ راجن کی موروثی عزت کرتے تھے بلکہ اس نے اس مشہور شخص سے میل جول پیدا کر کے بہت فائدہ اٹھایا کیونکہ وہ صادق القول مشہور تھا اور اس کی یہ صداقت پنڈاریوں کے حق میں اکثر کار آمد ثابت ہوتی تھی۔

اس سے پیشتر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ دولت راؤ سندھیا جب ۱۸۰۴ میں وسط ہند میں آ گیا تو سب پنڈاری اس سے جا ملے اور سرجی راؤ کی سفارش سے ان کے سرداروں کو خطابات دے کر سرفراز کیا گیا۔ چیتو کے خطابات اس کی مہر پر کندہ کر دیے گئے۔ اس زمانے میں وہ اپنے فرقے میں نہایت قابل اور بہت طاقتور سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے دور کے ابتدائی زمانے میں کریم خان کا بہت ممنون و شکر گزار تھا جس کی جمعیت میں وہ نوکر رہا تھا اور جب کریم خان دولت راؤ سندھیا کے یہاں سے بھاگ گیا تو چیتو نے دیگر پنڈاریوں کے ہم خیال ہو کر کریم خان کی امداد کے واسطے اپنی ساری فوج جمع کر لی جو اپنی بدسلوکیوں کا انتقام لینا چاہتا تھا لیکن جب ان شہ زور پنڈاریوں کے اتحاد سے سارا ہندوستان خوف زدہ ہو گیا تو عیار چیتو نے اپنے سابق کمان دار کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے دشمنوں سے جا ملا اور اس کی تباہی میں اس کے دشمنوں کی مدد کی اور اپنی اس چالاکی کی بدولت پنڈاری لیڈروں میں بلاشرکت غیرے سب سے اعلیٰ رتبہ حاصل کر لیا۔

چیتو نے اپنا مسکن ناہموار پہاڑیوں اور سنسان جنگلوں کے درمیان بنایا تھا جو دریائے نربدا کے شمالی کنارے اور کوہ بندھیا چل کے مابین واقع ہیں۔ جس علاقے پر

اس کا قبضہ تھا اس کے مشرق میں ریاست بھوپال اور مغرب میں راجا باگلی کا علاقہ تھا۔ اس کی چھاؤنی ہنڈیا کے سامنے موضع نیماڑ کے قریب تھی۔ وہ خود وہاں یا ستواس میں رہتا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مقبوضات اونچی پہاڑیوں پر تھے اور آخر میں اس نے امت واڑے کے پرگنہ تالین پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ اپنی حکومت کے آخر زمانے میں یہ سردار اپنے مستقر سے زیادہ دور کبھی نہیں گیا لیکن اس کے لشکر کی جماعتیں جس کی تعداد اندازاً ۲ ہزار سوار تھی ہر طرف دھاوے کیا کرتی تھیں۔ وہ دولت راؤ سندھیا کی فرماں برداری کا دم بھرتا تھا لیکن اس راجا کی ریاست اگرچہ عموماً محفوظ رہتی تھی لیکن اکے دکے حملوں سے وہ بھی نہیں بچتی تھی۔ گوالیار سے کئی مرتبہ فوجیں چیتو اور دیگر پنڈاری سرداروں کے مقابلے کے واسطے بھیجی گئی تھیں لیکن خود سندھیا کی بدنیتی یا ملازمان کی کمزوری فوجوں کی غداری یا باہمی رشک و عداوت کے باعث جو سندھیا کے نیم آزاد نمائندوں میں ہمیشہ موجود رہتی تھی یا ان سب وجوہ کے مل جانے سے کسی مقابلے میں بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ان لٹیروں پر جین بپت کے زیر کمان حملہ کرنے سے کامیابی کی بہت کچھ توقعات کی گئی تھیں کیونکہ وہ خود نہایت بہادر اور مستعد شخص تھا اور اس کی ماتحت فوج نہایت چاق و چوبند تھی لیکن اس کی کوششوں کا (اگرچہ اس نے پنڈاریوں اور ان کے دوست جسونت راؤ بھاؤ کو شکست دے دی) صرف اس قدر نتیجہ نکلا کہ ایک معاہدہ طے ہوا جس کی رو سے پنڈاری سرداروں نے لوٹ مار سے احتراز کرنے کا اقرار کیا اور دولت راؤ سندھیا کی خدمت میں سواروں کی ایک جماعت پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ سندھیا نے پنڈاریوں کی بسر اوقات کے لیے چند اراضیات دینے کا اقرار کیا۔ سندھیا کو اس معاہدے کی توثیق کرنے میں بہت سی وجوہ سے پس و پیش ہوا۔ ازاں جملہ ایک خاص وجہ یہ تھی کہ یورپین کماں دار نے نہایت دریا دلی سے جن علاقوں کے دینے کا وعدہ کیا تھا ان میں سے اکثر علاقے اس کی ملکیت میں سے نہ تھے بلکہ وہ علاقے پیشوا کے یا پوار اور ہلکر کے تھے اور اگرچہ اس نے کئی بار ان کی حکومت اور ریاست پر قبضہ کرلیا تھا لیکن اکثر موقعوں پر اس نے ظاہری تعلقات کو قائم رکھا تھا۔

تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے یہ رائے قائم کرلی کہ یا تو اس معاہدے کو تسلیم

کر لیا جائے جو میرے فوجی سپہ داروں نے طے کیا ہے یا پھر اپنی ریاست میں لوٹ مار کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ مختلف سرداروں کو احکام یا سندات دے دیے گئے۔ ان میں سے خاص سردار چیتو تھا۔ اسے اپنی فوج کے گزارے کے لیے ۵ پرگنے ملے اور یہ پہلا موقع تھا جب کہ وہ جائز حکمراں تسلیم کیا گیا اور اس سے بہت جلد نہایت اہم تبدیلیاں وقوع میں آ جاتیں اگر یہ اور اس جیسے دیگر پنڈاری سردار کامیابی کے نشے سے بدمست ہو کر قریب کی ریاستوں کی سازشوں کے لیے معاون نہ بن جاتے جو اگرچہ ان قزاقوں کے جور و ستم سے ڈرتی تھیں لیکن وہ اپنے دشمنوں کو دق کرنے کے لیے پنڈاری سرداروں کو اپنا آلہ کار بنا لیتی تھیں لیکن ان کی ہمیشہ یہی پالیسی تھی کہ ان پر کمان کرنے کے لیے ان میں تفرقہ اندازی کی ضرورت ہے۔

چیتو ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد جو اسے دیے گئے تھے امت واڑے سے دریائے نربدا کے کنارے اپنی چھاؤنی میں واپس آ گیا اور پھر دوسرے سال اس کی لٹیری جماعتوں کے انگریز فوجوں سے مقابلے ہوئے' جنھوں نے راجہ ناگپور سے معاونتی معاہدہ کر لیا تھا اور وہ دریائے نربدا کے جنوبی کنارے کی جانب روانہ ہو گئیں۔ آئندہ سال انگریزی فوجیں وسط ہند میں داخل ہو گئیں۔ چیتو مع دیگر پنڈاری سرداروں کے امن کا دشمن اور مجرم قرار دیا گیا۔ وہ اپنے قلعے چھوڑ کر بھاگ گیا ور اس نے مدافعت کی کچھ کوشش نہ کی۔ آگرہ تک اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہاں سے وہ مضافات میواڑ میں چلا گیا لیکن انگریزی فوج کے اس جگہ پہنچ جانے پر وہ پھر بھاگ گیا اور طویل چکر کاٹ کر وہ اپنے مستحکم علاقے میں آ گیا جہاں سے اولاً وہ نکال دیا گیا تھا لیکن یہاں بھی اسے چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کی خاص جمعیت پر حملہ کیا گیا اور وہ تباہ کر دی گئی۔ اس کے ہمراہیاں جب منتشر ہو گئے تو انگریزی فوجوں نے ان کا تعاقب کیا حتیٰ کہ ان کی کیمپ ٹوٹ گئی اور وہ چھوٹے چھوٹے راجپوت رئیسوں اور دیہاتی عہدہ داروں کا شکار ہو گئے اور ان لوگوں نے عرصہ دراز تک جو مصیبتیں اور تکالیف ان کمینہ اور بے رحم لٹیروں کے ہاتھ سے اٹھائی تھیں ان کو یاد کر کے اور اپنے نفع کے لالچ سے انھوں نے پنڈاریوں کو بڑے شوق اور مستعدی سے اچھی طرح لوٹا۔ چیتو کی ساری قوت کا بغیر کسی ایک مقابلے کے خاتمہ ہو گیا اور وہ اروا س کے گھنے جنگلات میں اپنے

یار راجن اور ۳۰ ۔ ۴۰ ہمراہیان کے ساتھ مارا مارا پھرا۔ یہاں کا گونڈ سردار جو اس سے قبل ایک جرم میں اس کا شریک رہا تھا اب تک خفیہ طور پر اس کا دوست تھا لیکن یہاں بھی چیتو پر اس قدر دباؤ پڑا کہ وہ نہیں ٹھہر سکا۔ اس نے یہ روایت سنی تھی کہ حکومت برطانیہ ان پنڈاری سرداروں کے ساتھ رحم اور فیاضی کے برتاؤ کرتی ہے جو اطاعت قبول کر لیتے ہیں لیکن اپنی جہالت کی وجہ سے وہ اس برتاؤ کے منشا سے واقف نہ ہوسکا اور معافی کی امید اور سزایابی کے اندیشے سے اس کا ارادہ ڈانواڈول رہا۔ اسی تذبذب کی حالت میں وہ بھوپال گیا اور نواب سے پناہ مانگی لیکن جب وہ نواب کی پناہ میں آگیا تو اس کا مضطرب دل پھر خوف زدہ ہوگیا اور نواب کی پناہ سے نکل کر جو اس نے بمنت حاصل کی تھی وہ اپنے سابق مسکن کو چلا گیا۔ اب وہاں پر انگریزی فوج کا ایک دستہ پہنچ گیا تھا اور مع دیگر فوجوں کے وہ اس علاقے میں داخل ہو رہا تھا اگرچہ چیتو کے روبرو شرائط پھر پیش کیے گئے لیکن حبس دوام .عبور دریائے شور کی سزا کے اندیشے سے اس نے ان شرائط کو قبول نہیں کیا اور جب راجن نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ اطاعت قبول کر لے تو اس کے گزارے کا معقول بندوبست ہو جائے گا تو چیتو دریائے نربدا کو عبور کر کے قلعہ اسیر گڑھ میں چلا گیا اور اپا صاحب سابق راجہ ناگپور نے وہاں سے چیتو کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ راجہ قید سے نکل کر بھاگ گیا تھا اور وہ مہادیو پہاڑ میں ایک لشکر جمع کر رہا تھا۔ اس راجہ کے اسیر گڑھ کے مضافات کو جانے میں پنڈاری سردار نے رہنما کا کام کیا لیکن وہ اس خیالی محفوظ مقام پر پہنچنے ہی پایا تھا کہ انگریزی فوج کے ایک دستے نے اس کے ہمراہیوں کی مختصر جماعت کو منتشر کر دیا۔ چیتو مع اپنے بیٹے اور ۵ ہمراہیان کے اپنی سابق جائے پناہ یعنی ستواس کے جنگلوں کی جانب بھاگ گیا لیکن کئی مختصر ٹولیوں نے اس کا تعاقب کیا اور انگریزی فوج کے دیگر سپاہیوں نے ایسے ہر ایک مقام پر قبضہ کر لیا جہاں سے چیتو کو ایک دن کی خوراک میسر آ سکتی تھی۔ اس کا آخری دوست خوش حال سنگھ ساکن ارواس اسے چھپانے کے شبہے سے بچنے کے لیے ایک انگریزی کیمپ میں حاضر ہوگیا۔ گویا اس شہرہ آفاق سردار کو اب ڈاکو بھی پناہ دینے سے گریز کرنے لگے اور اس کے گھوڑے کے سم کے نشانات سے جنگلوں میں اس کی سراغ رسی کی گئی۔ چیتو ہر ایک مشہور جائے

پناہ تک تعاقب کیے جانے اور بھوک پیاس کی تکلیف سے مجبور ہو کر اپنے بیٹے اور ہمراہیان سے جدا ہوگیا۔ اس نے ایک گھنے جنگل کی جھاڑی میں پناہ لی جہاں پر ایک شیر نے اس پر حملہ کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ جب ریاست ہلکر کے ایک مقامی عہدہ دار کو اس واقعے کی خبر ملی تو وہ فوراً اس موقع پر جا پہنچا اور جس جگہ شیر نے چیتو کو اول مرتبہ پکڑا تھا وہاں پر اس کا گھوڑا' کاٹھی' تلوار' زیورات' سابق راجہ ناگپور کی عطیہ جاگیر کے کاغذات اور اس کے جسم کا ایک حصہ ملا لیکن اس کی موت کو بغیر کسی شبہے کے ثابت کرنے کی غرض سے انہوں نے شیر کا سراغ اس کے غار تک لگا لیا اور اگرچہ شیر ان لوگوں کی آمد سے خوف زدہ ہوگیا اور وہاں سے بھاگ گیا لیکن وہاں پر چیتو کا سر صحیح و سالم حالت میں مل گیا۔ انہوں نے یہ اسیر انگریزی کیمپ میں بھیج دیا تاکہ اس واقعے کی تصدیق ہو جائے۔ اس وقت انگریزی فوج سیر گڑھ کا محاصرہ کر رہی تھی۔

یہ واقعات صحیح مان لیے گئے اور چیتو کا سر اس کے بدنصیب فرزند محمد پناہ کو دفن کرنے کے لے دے دیا گیا جو اپنے باپ کی موت کے دوسرے روز قید ہوگیا تھا۔ محمد پناہ بچپن ہی سے بہرا تھا اور اس کی سمجھ بہت کمزور تھی اس لیے بجائے سزا دینے کے اس پر رحم کیا گیا۔ علاوہ بریں اگرچہ وہ مجرم تھا لیکن اس کے باپ کی موت اس طور پر واقع ہوئی تھی جو افسوس کے قابل تھی۔ اس لیے محمد پناہ کو رہا کر دیا گیا اور وہ حکومت ہلکر کے پاس بھیج دیا گیا جہاں سے چند کھیت اس کے گزارے کے لیے اسے مل گئے ہیں۔

کریم خان پنڈاری سردار جسے ایک زمانے میں اپنے رقیبوں سے بہت زیادہ قوت اور آزادی حاصل ہوگئی تھی اپنے کو محمد داؤد کا فرزند بتاتا ہے جو رگھویا پیشوا کے یہاں لٹیروں کی ایک جماعت کا سپہ دار تھا۔ اس کا بیان ہے کہ "میں بیرسیہ کے قریب پیدا ہوا تھا اور اپنے بچپن کا یہ واقعہ مجھ کو یاد ہے کہ جب میں ۸ سال کا تھا اس وقت میرا باپ شاہ پور میں مارا گیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد کیمپ کی کمان میرے چچا یار محمد کو مل گئی تھی۔ اس نے رگھویا کے یہاں اس وقت تک ملازمت کی کہ وہ انگریزوں سے مل گیا۔ پھر یار محمد مادھوجی سندھیا کے یہاں نوکر ہوگیا اور اس کے ہمراہ ہندوستان چلا

گیا اور وہاں پر اس وقت تک رہا جب کہ میری عمر ۲۰ سال کی ہوگئی۔ مادھو جی نے مالوے میں مجھے جاگیر دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں وہاں پر ڈی بون کی فوج کے ہمراہ پہنچا تھا اور سکھاری گھاٹ کے قریب ہلکر کی فوجوں کے شکست پانے کے وقت میں موجود تھا"۔

ان واقعات کی صداقت میں شک کیا جاسکتا ہے کیونکہ کئی سال بعد جب ہیرا اور برن نے اپنی خدمات بھوپال گورنمنٹ کو پیش کیں اور انکاری جواب ملنے پر وہ ریاست کے لیے وبال جان ہوگئے اس وقت کریم نے بھی لوٹ مار میں شرکت کی اور وہ ۵ یا ۶ سو آدمیوں کا سپہ دار تھا۔ برن کے قید ہو جانے پر وہ ناگپور سے بھاگ گیا اور دولت راؤ سندھیا کے یہاں نوکر ہوگیا جو حال ہی میں مسند پر بیٹھا تھا۔ دوسرے مرہٹہ رؤسا سے مل کر وہ نواب نظام الملک پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کریم کا بیان ہے کہ اس جنگ میں اگرچہ کشت و خون بالکل نہیں ہوا لیکن اس قدر مال غنیمت میرے ہاتھ لگا جو مدت العمر کبھی پلے نہ پڑا تھا۔ اس مال غنیمت کے اندیشے سے میں سندھیا کی فوج سے نکل بھاگا اور وسط ہند میں آگیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد میں نے اپنی خدمات جسونت راؤ ہلکر کے حضور پیش کیں جو قبول کر لی گئیں۔ مجھ کو یہ حکم ملا کہ کریم الدین کے پاس جاؤ اور اس کے بھائی امیر خان کی مدد کرو جو ابھی حال ہی میں ساگر سے پسپا ہونے پر مجبور ہوا ہے۔ کریم خان اب ۲ - ۳ ہزار سوار سپاہ کا کماں دار تھا لیکن اپنی جائیداد کو نقصان پہنچنے کے اندیشے سے یہ جنگجو سردار جسونت راؤ ہلکر کی ملازمت سے دست کش ہوگیا اور اگرچہ اس نے سندھیا کے ملازمان میں داخل ہو جانے کے لیے پھر درخواست کی مگر اس کے ساتھ اس نے امیر خان سے خط و کتابت شروع کر دی اور اس سے استدعا کی کہ اس کے بال بچوں کے سر لگانے کو جگہ دے دیجئے۔ امیر خان اگرچہ اپنے ہمراہیان کی تعداد میں اضافہ کرنے سے گھبراتا تھا لیکن اس نے کریم خان کی درخواست کو منظور کر لیا لیکن امیر خان کو بہت جلد اپنے اس جدید تعلق پر کف افسوس ملنا پڑا کیونکہ جب وہ دولت راؤ سندھیا سے جنگ و جدال کرنے میں مصروف تھا اس وقت کریم خان دوسرے پنڈاریوں سے سازباز کر کے مشہور پرگنہ شجال پور کا خود مالک بن بیٹھا۔ اس نے حال ہی میں ریاست پوار کا قصبہ

بیرسیہ فتح کر لیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ اپنی ناکام جنگ کے بعد جب سندھیا دکن سے واپس آیا تو اس نے کریم خان کے ان دونوں مقامات پر قبضہ کرنے کی منظوری دے دی۔

سندھیا نے کریم خان کو نواب کا خطاب دیا اور اس نے نواب بھوپال کے اس خاندان کی ایک خاتون سے شادی کر لی جو راتھ گڑھ میں رہتا تھا اور اسے یہ امید ہوگئی کہ اس جدید رشتے سے اس کی عزت و توقیر بڑھ جائے گی اور اس کی دیرینہ تمنائیں بر آئیں گی۔ سندھیا اور ہلکر دونوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر جو اس وقت ہندوستان کی سرحدوں پر نبرد آزمائی میں مصروف تھے اس نے کئی زرخیز پرگنے فتح کر لیے اور انھیں اپنے سابق مقبوضات میں شامل کر لیا۔ اب اس کا ستارۂ اقبال نصف النہار پر تھا اور پہلی بار ایک پٹھان سردار ایک باضابطہ ریاست کا رئیس ہو جانے والا تھا حقیقتہً کریم کے دل میں اس کی بڑی تمنا تھی اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ نہایت سرگرمی کے ساتھ تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ایک ہزار پیدل سپاہ بھرتی کی اور ۲ توپیں ڈھال لیں۔ ۲ توپیں اس کے پاس پیشتر سے موجود تھیں۔ ان کے ملنے سے اس کا توپ خانہ تیار ہوگیا۔ اس نے ۲ سو سواروں کا پائگاہ یعنی باڈی گارڈ کا ایک رسالہ تیار کیا جس کو ملا کر اب ۲ ہزار پنڈاری اس کے زیر کمان ہوگئے اور فی الحقیقت اب وہ ہیبت ناک بن گیا اور جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے غوث محمد کے مدعو کرنے پر کریم خان بھوپال چلا گیا لیکن اس ریاست کے افلاس اور وزیر محمد کی شجاعت اور اولوالعزمی نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر گیا جو اس نے اس ریاست میں اپنے علاقوں کی توسیع کے لیے کر رکھی تھیں۔ اس کوشش میں ناکامی نصیب ہونے پر دولت راؤ سندھیا کے یہاں سے اس کی طلبی ہوئی جس نے مختلف حیلے تراش کر اسے تباہ کرنے کی غرض سے اپنے مستقر سے نقل و حرکت کی لیکن اپنی قوت سے علانیہ طور پر اس کام کو درجہ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہ تھا اس لیے چالبازی سے کام لیا گیا اور اس موقعہ پر مرہٹہ رئیس نے جیسی عیاری سے کام لیا وہ اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ یہ پنڈاری سردار اپنی کامیابی سے نہایت مغرور ہوگیا تھا اور اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک بالاتر سے ملنے کے لیے گیا جس کی فرماں برداری کا وہ

قائل تھا مگر اس شان سے گویا اس سے کم درجے کا نہ تھا۔ دولت راؤ بیرسیہ کے مضافات میں ستن باڑی کے قلعے کے قریب خیمہ زن تھا۔ دولت راؤ نے اولاً اس امید پر کریم خان کی چاپلوسی کی کہ فتح ہونے پر وہ قلعے کو اس کے حوالے کر دے گا۔ اپنی اس خوشامد کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اس نے کریم خان سے کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کریم خان اگرچہ نہایت بہادر اور محتاط تھا لیکن وہ اپنی شاندار اقبال مندی کی عظیم الشان توقعات کے دھوکے میں آ گیا۔ کریم خان نے اپنے معزز مہمان کی نذر جو تحائف کیے ان کا ایک جزو یہ تھا کہ اس نے روپیوں کا ایک تخت یا مسند اس کے لیے تیار کیا۔ سندھیا نے اس ملاقات میں اور پھر کئی دن تک یہی دھوکا بازی کی کہ کریم خان کے اوصاف معلوم کر کے اس کو بے حد مسرت حاصل ہوئی ہے اور بیان کیا کہ کریم خان میں سپاہی اور مدبر دونوں کے اوصاف موجود ہیں اور ایسے شخص کی تلاش میں عرصہ دراز تک وہ فضول سرگرداں رہا۔ کریم خان کی ہر ایک درخواست بلاچون و چرا فوراً منظور کی گئی اور اس سے جو کچھ وعدہ کیا گیا تھا اس کے علاوہ کریم خان نے چند بیش قیمت اضلاع کی اور فرمائش کی اور وعدہ کیا کہ ان علاقوں کے حوالے ہو جانے پر وہ ساڑھے چار لاکھ روپے نذر کرے گا۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ سندات تیار کی جائیں اور ایک اعلیٰ درجے کا خلعت کریم خان کے لیے تیار کیا گیا۔ چند معمر پنڈاری سرداروں نے کریم خان کو متنبہ کیا کیونکہ اگلے موقعوں پر وہ اپنے سرداروں کا لوٹا جانا اور گرفتار ہونا دیکھ چکے تھے اور ان سرداروں نے کریم خان کو مرہٹوں کی دغا بازی یاد دلائی لیکن اسے اپنی حفاظت کی بابت کامل اطمینان ہو گیا تھا۔ سندھیا نے ہر ایسے شخص کو رشوت دینے یا فریب دینے کا بندوبست کر لیا تھا جس پر اسے اعتماد تھا۔

اپنے نئے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے روانگی کا جو دن مقرر ہوا تھا اس روز آخری ملاقات کرنے کے لیے وہ مدعو کیا گیا تاکہ جو باتیں ناتمام رہ گئی ہیں ان کی تکمیل ہو جائے۔ چنانچہ وہ چند خدام کے ہمراہ گیا اور بڑے تپاک کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا۔ سندات طلب کی گئیں۔ خلعت تیار ہو گئے تھے۔ المختصر شبہ دور کرنے کی ہر ایک کارروائی کی گئی۔ الغرض یہ سوانگ مکمل ہو گیا۔ سندھیا کسی حیلے سے اٹھ کر چلا

گیا اور خیمے کی قناتوں کے نیچے سے مسلح آدمی گھس پڑے اور انہوں نے جب نئے مغرور پنڈاری سردار کو مع اس کے خاص خاص ہمراہیوں کے گرفتار کرلیا۔ ایک توپ داغی گئی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ تجویز کے اول جز میں کامیابی حاصل ہوگئی اور جو فوجیں کریم خان کو سلامی دینے کے لیے جمع ہوئی تھیں اور جو فوجیں کہ عطیہ علاقوں تک اس کی ساتھ جانے والی تھیں انہوں نے اشارہ پاتے ہی پنڈاری کیمپ پر دھاوا بول دیا۔ کریم خان کے ہمراہیان اس خطرے سے شروع ہی میں آگاہ ہوگئے تھے اور اگرچہ ان کے صرف معدودے چند آدمی مارے گئے لیکن ان کا سارا مال و اسباب ضائع گیا اور سندھیا کی فوج نے لوٹ کھسوٹ سے آسودہ ہو کر اپنے فرماں روا کی قابلیتوں کو نیک نام کیا جس نے اس موقع پر اس فن کا کمال دکھا دیا جو مرہٹہ حکمراں کا اعلیٰ وصف مانا جاتا ہے۔ اس کی شہرت اور ناموری اس وجہ سے دوچند ہوگئی کہ اس کی فوج کی تعداد لٹیروں کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم تھی جن کو اس نے ایسی ہوشیاری اور کامیابی کے ساتھ جال میں پھانس لیا۔

کریم کی تباہی کی خبر نہایت سرعت کے ساتھ شجال پور میں اس کے اہل و عیال تک پہنچ گئی اور کہا جاتا ہے کہ وہاں پر اس کا بہت سا خزانہ اور مال و اسباب جمع تھا۔ اس کی ماں اگرچہ ضعیفہ تھی لیکن اس نے بڑی مستعدی سے کام کیا اور ساتھ لے جانے کے قابل مال و اسباب لے کر فوراً باگلی کے جنگلوں کی جانب چلی گئی جہاں پر پنڈاریوں کی ایک زبردست جماعت اسے مل گئی لیکن سندھیا کی قوت کے ڈر سے اس علاقے کے سب لوگوں نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ مغرب کی جانب روانہ ہوئی اور ظالم سنگھ کارپرداز کوٹا کی ریاست میں اسے پناہ کی ایک جگہ مل گئی۔

کریم ۴ سال تک گوالیار میں قید رہا لیکن اگرچہ اس کی سخت نگرانی ہوتی تھی مگر قید سخت نہ تھی۔ اس نے اپنے پنڈاریوں کو ہدایت کردی کہ ہر ایک جگہ اور بالخصوص سندھیا کی ریاست میں خوب لوٹ مار کریں۔ وہ چھوٹی ٹولیاں بنا کر کارروائی کرتے تھے اور ان کی سب سے بڑی جماعت اس کے بھتیجے نامدار خان کی ماتحتی میں تھی۔ دولت راؤ سندھیا مدت تک اس پنڈاری سردار کو رہا کرنے سے انکار کرتا رہا لیکن آخرکار وہ ۶ لاکھ روپے نذرانہ کے لالچ میں آگیا اور کریم نے اس نذرانے اور ایک لاکھ روپے

مصالحت کی گفت و شنید کرنے والے عہدہ داروں کو ادا کرنے کے لیے ظالم سنگھ کو اپنا ضامن بنا لیا۔ اس کی رہائی کے بعد گزشتہ واقعات کی تلافی کی کوشش کی گئی اور اس کی خدمت میں بیش بہا تحائف پیش کیے گئے اور ہر طرح پر اس کا ادب اور احترام کیا گیا لیکن اس کے ایسا کاری زخم لگا تھا جو با آسانی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے رہا ہوتے ہی فوراً اپنے پنڈاریوں کو پھر جمع کرنا شروع کر دیا جو ہر مقام سے اس کے پاس آ پہنچے اور انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ کریم خان نے شجال پور میں سکونت اختیار کی اور قید ہونے سے پیشتر اس کے پاس جس قدر مقبوضات تھے اب ان سے کہیں زیادہ وسیع علاقوں پر وہ قابض ہو گیا۔

اس زمانے میں چیتو کی ساری فوج کریم خان کے پاس آ گئی تھی اور اس کی آمد سے دوستی کے وہ تعلقات پیدا ہو گئے جو ان سرداروں اور امیر خان کے درمیان قائم تھے جس کے اقبال کا ستارہ نصف النہار پر تھا اور جس نے سارے ہندوستان میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس سے خائف ہونا بلاوجہ بھی نہیں تھا۔ ان لٹیروں کے گروہ میں کم از کم ۶۰ ہزار سوار تھے جنہیں منچلا رہبر کسی مقررہ مقام پر جانے کی ہدایت کر سکتا تھا لیکن خوش قسمتی سے یہ اتحاد زیادہ دیرپا نہیں ہوا۔ کریم خان نہایت سنگدل تھا اور اس کے دل میں دولت راؤ سندھیا کے خلاف آتش غیظ و غضب بھڑک رہی تھی اس لیے اس نے سندھیا کی ریاست میں بڑے جور و ستم کیے۔ سندھیا اپنی کوتاہ اندیش اور حریصانہ پالیسی کے ان نتائج سے نہایت شرمندہ اور خوف زدہ ہو گیا جس کی بدولت اس کی ریاست میں یہ بلا نمودار ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے ایک خاص سپہ دار بھکو بابو کو فوراً اس پنڈاری سردار کے مقابلے کے لیے روانہ ہونے کی ہدایت کی۔

چونکہ چیتو کی کریم سے کچھ پیشتر کی چشمک تھی اس لیے وہ کریم کے مقابلے میں سندھیا سے مل جانے پر باآسانی راضی ہو گیا اور صوبہ امت واڑہ میں کریم کے کیمپ پر حملہ کیا گیا اور وہ تباہ کر دیا گیا۔ کریم میدان جنگ سے ریاست کوٹا کو چلا گیا۔ اس ریاست کا جنگجو رئیس چونکہ سندھیا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے پرانے رفیق سے کہا کہ براہ کرم دور باش۔ اور اس نے کریم کو یہ صلاح دی کہ آپ امیر خان سے پناہ مانگئے لیکن اس نے کریم کے اہل و عیال کے قیام کے لیے جگہ

دے دی۔

چنانچہ کریم امیر خان کے پاس گیا مگر اس نے تلسا بائی سے سفارش کرنے کے حیلے سے اسے غفور خان کے سپرد کر دیا اور ریاست ہلکر میں بغاوتیں ہونے کے دوران میں وہ اس کے پاس ۲ سال تک نظر بند رہا۔ اس زمانے میں غفور خان کی فوج بہ ماتحتی نامدار خان مختلف معرکوں اور بالخصوص بھوپال کے محاصرے میں مشغول و معروف رہی اور اس خدمت کے صلے میں کریم کے بھتیجے نے بہت نام پیدا کیا لیکن اس کے چچا کا جو اس سے مسلسل خط و کتابت رکھتا تھا یہ بیان ہے کہ وہ میرے احکام کی حرف بحرف تعمیل کرتا تھا۔ مالوے میں انگریزی فوج کے داخل ہونے سے چند ماہ پیشتر کریم خان ہلکر کے لشکر سے نکل بھاگا اور بیریسیہ میں اپنے ہمراہیان سے جا ملا۔ وہ اس موقع پر اپنی اس حرکت کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ دولت راؤ سندھیا نے میرے پاس ایک خط بھیجا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ پچھلے واقعات پر خاک ڈال دیجئے اور اپنے دل سے انہیں فراموش کر دیجئے۔ آپ کے نہ صرف سابق مقبوضات واپس کر دیے جائیں گے بلکہ آشٹہ اور دیگر علاقے آپ کو دے دیے جائیں گے بشرطیکہ آپ آئندہ جنگ میں جو انگریزوں سے ہونے والی ہے مرہٹوں کے جتھے کا ساتھ دیں۔

جب انگریزی فوجیں دریائے نربدا کو عبور کرنے والی ہی تھیں اس وقت کریم خان (اپنے بیان کے بموجب) دولت راؤ سندھیا کے حکم کی تعمیل میں واصل محمد خان کے لشکر سے جا ملا اور جس مقام پر انہیں جانے کا حکم ملا تھا وہاں سے گوالیار صرف ۴۰ کوس اور نروار ۱۷ کوس تھا۔ اس وقت سندھیا کے پاس سے ایک خاص معتمد برہمن آیا اور اس نے سندھیا کا یہ حکم سنایا کہ آپ لوگ کہیں دور چلے جائیں کیونکہ انگریزی فوجوں کی پیش قدمی سے میں ایسی حالت میں ہوگیا ہوں کہ آپ لوگوں کو پناہ نہیں دے سکتا۔

اس خبر نے قزاقوں کو مایوس اور ناراض کر دیا۔ چنانچہ فوراً یہ تجویز قرار پائی کہ اب ہم لوگوں کو مغرب کی طرف چل دینا چاہیے اور ہلکر کی فوج میں شریک ہو جانا چاہیے جس کی بابت انہوں نے سنا تھا کہ وہ ریاست ہلکر کی سرحد سے ماہید پور کی طرف جا رہی ہے۔

سندھیا نے انہیں جنگ میں شرکت کرنے کے لیے طلب کیا تھا مگر اس کی غداری سے خفا ہو کر انہوں نے ارادہ کیا کہ جس حد تک ممکن ہو اس کی ریاست میں لوٹ مار کرنی چاہیے مگر ان کا خاص مقصد یہ تھا کہ اپنی سلامتی کا بندوبست کیا جائے۔ روزانہ انگریزی فوجوں کے ہر طرف بڑھنے کی خبریں آ رہی تھیں اور ان کی فتوحات سے کریم اس قدر خائف اور پریشان ہوگیا کہ وہ اپنے اہل و عیال اور بہت سا سامان چھوڑ کر بھاگ گیا اور راستے میں بغیر قیام کیے ہوئے وہ سیدھا ہلکر کی فوج میں جا پہنچا جو منڈیسر کے قریب خیمہ زن تھی۔ جو پنڈاری کہ کریم کے ہمراہ تھے فراری سے ان کی تعداد اس قدر کم ہوگئی تھی کہ ہلکر کے یہاں پہنچنے کے وقت ان کی تعداد ۵ ہزار سے زیادہ نہ تھی ان کی خدمت پیش کی گئیں لیکن ہلکر کے وزرا نے نامنظور کیا جنہیں ماہید پور کی جنگ کے بعد اپنے کو تباہی سے بچانے کے علاوہ اور کوئی فکر نہ تھی اور چند روز پس و پیش کرنے کے بعد غفور خان نے کریم سے چلے جانے کی فرمائش کی۔ چونکہ انگریزی فوج بڑھتی چلی آتی تھی اور پنڈاریوں کی قربت کی وجہ سے ہلکر صلح نہ کر سکتا تھا۔ پنڈاری جاوو کی طرف چلے گئے لیکن وہاں پر اپنے باہمی نزاعات اور انگریزی فوج کی آمد سے وہ منتشر ہو جانے پر مجبور ہوگئے۔ کریم تو تکان سے خستہ ہو کر شہر میں جا چھپا اور اس کا لشکر بماتحتی نامدار خان میواڑ سے مالوے کو چل دیا اور جب وہ لشکر گنگرو کے قریب پہنچا تو ایک انگریزی فوج سے اس کا مقابلہ ہوگیا جس نے اسے ایسی شکست فاش دی کہ اس سے سپہ دار کامیابی سے مایوس ہو کر بھوپال چلے گئے اور انہوں نے نواب بھوپال سے درخواست کی کہ براہ نوازش آپ ہمارے شفیع بن جائیے اور اس ابتدائی اطاعت کیشی سے نہ صرف نامدار خان کے گزارے کا بندوبست کر دیا گیا بلکہ حکومت برطانیہ نے اس کے بہت سے ہمراہیان کے ساتھ رحم و کرم کا سلوک کیا۔

کریم کے حالات اب قریب الاختتام ہیں وہ جاوو کے ایک نہایت ذلیل مکان میں چھپا ہوا تھا لیکن جب انگریزی فوج نے اس شہر پر قبضہ کر لیا تو وہ وہاں سے نکل بھاگا اور اپنے بیان کے بموجب وہ فقیرانہ بھیس میں بھوکا پیاسا کئی روز تک مارا مارا پھرا۔ آخرکار اس نے غفور خان کو اپنی حالت لکھ بھیجی۔ اس پٹھان سردار نے اسے مشورہ

دیا کہ آپ غیر مشروط طور پر اپنے کو انگریزی حکومت کے رحم و کرم کے سپرد کر دیں جس نے اس کے ساتھ شفقت اور فیاضی کا سلوک کیا۔ اب وہ مع اپنے بال بچوں کے ضلع گورکھپور میں رہتا ہے جہاں پر اس کے گزارے کے واسطے اراضیات دے دی گئی ہیں اور وہ اب اپنی اقبال مندی کے وہ خواب فراموش کر سکتا ہے جو کسی زمانے میں وہ دیکھا کرتا تھا اور جو حیرت انگیز انقلابات خود اس پر گزرے ہیں ان سے سبق لے کر وہ اب بھی خوش رہ سکتا ہے۔

پنڈاریوں کے خاص سپہ داروں کی سوانح عمری کے اس مختصر خاکے میں وہ تمام ضروری باتیں ہم نے بیان کر دی ہیں جن کے جاننے کی پنڈاریوں کی تاریخ میں خواہش ہو سکتی ہے جو اپنی ساخت اور عادات کے باعث بحیثیت ایک قوم یا سلطنت کے کوئی مستقل شکل اختیار نہ کر سکے۔ وہ انقلابات پیدا کر سکتے تھے اور انہوں نے انقلابات پیدا کیے بھی لیکن ایسے موقعوں پر مستقل سلطنت قائم کرنا انؔ کے لیے بالکل غیر ممکن تھا وہ تاوقتیکہ اپنے کیرکٹر سے دست کش نہ ہو جاتے۔ وہ کسی جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہر ایک سیول سلطنت خواہ وہ کیسی ہی بھدی ہو وہ ان کے اساسی اصولوں کے منافی تھی جو ہر ایک سلطنت کے خلاف ہمیشہ برسرجنگ رہنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

ایسی ریاستوں میں پنڈاریوں کا رہنا خصوصیات کے ساتھ مخدوش تھا جن میں ان کے مغلوب کرنے کی سکت نہ تھی اور چونکہ وہ خود باقاعدہ قوم بننے کے لائق نہ تھے اور نہ انہیں امن عامہ سے کچھ سروکار تھا لیکن اس حالت میں وہ کمزور اور لاچار ریاستوں کے لیے نہایت ہیبت ناک ہوگئے تھے لیکن وہ کسی زبردست حکومت کے دلیرانہ حملے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ظاہربینوں کو ان قزاقوں کا استیصال اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور معلوم ہوتا تھا لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ وہ بغیر مکان اور وسیلہ معاش کے زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس عظیم الشان اور روزافزوں وبال کا صرف یہی علاج تھا کہ انہیں ان کے مقبوضہ علاقوں سے نکال دیا جائے اور جو لوگ انہیں امداد یا پناہ دیں ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے اور ان کے استیصال کے لیے جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ نہایت دانشمندی سے قرار پائی تھیں۔ ان پر پورے جوش اور

مستعدی کے ساتھ عمل کیا گیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ انہیں درجہ تکمیل کو پہنچا دیا گیا۔ ہندوستان میں ایسا کوئی ایک مقام بھی نہیں جو پنڈاریوں کا مسکن کہا جاسکتا ہے۔ وحشی درندوں کی طرح ان کا شکار کیا گیا۔ بے شمارے مارے گئے۔ ان کے جتھے سب تباہ و برباد ہوگئے۔ جن لوگوں نے ان کی حمایت کی انہیں شکست دی گئی۔ شروع ہی میں ان سے متعدی بیماری کی طرح نفرت کی جاتی تھی اور ان دیہاتیوں نے پنڈاریوں پر حملہ کرنے میں پیش دستی کی جو ان کے ہاتھ سے ستائے گئے تھے۔ ان کے خاص سپہ دار مار ڈالے گئے یا انہوں نے اطاعت قبول کر لی یا وہ قید کر لیے گئے اور ان کے ہمراہیوں کو گورنمنٹ نے رحم و کرم فرما کر محنتی بن جانے میں امداد دی ہے اور اب وہ عام آبادی میں گھل مل گئے ہیں جس کے فضلے سے وہ پیدا ہوئے تھے۔ تفصیلی تحقیقات کرنے پر صرف اس قدر معلوم ہوسکے گا کہ یہ ہیبت ناک لٹیرے اب رذیل اقوام میں مل کر پوشیدہ ہوگئے ہیں اور تجارت و زراعت میں مشغول ہو کر جو فائدہ کہ وہ پہنچا رہے ہیں اس سے وہ اپنے گزشتہ مظالم کی کچھ تلافی کر رہے ہیں۔ ان لٹیروں میں مذہبی تعصب بالکل نہ تھا' چونکہ ان میں ہر قوم والے شامل تھے۔ انہیں اپنی سپاہیانہ قابلیت یا وطن پر کبھی ناز اور فخر نہیں ہوا اور اس لیے وہ اس قسم کے کسی ایک رشتے سے بھی مربوط نہ تھے جو ہندوستان کی بہت سی اقوام میں ناقابل شکست صورت اختیار کرلیتا ہے۔ کسی خراب زمانے میں اور لٹیروں کا پیدا ہونا ممکن ہے لیکن منتخب جماعت کے پنڈاریوں کا جیسا چاہیے ویسا استیصال کر دیا گیا ہے کہ تقریباً ان کا نام بھی فراموش ہوگیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے کو ابھی ۵ سال بھی نہیں گزرے ہیں جب کہ ان کی بدولت سارے ہندوستان میں خوف اور دہشت چھائی ہوئی تھی۔

("تاریخ وسط ہند" جلد اول' ص ۳۳۱ - ۳۵۸)

⚙

حصہ سوم

ڈاکو

افغان اور بھیل ڈاکو

۱۸۵۸ء میں لطف اللہ نامی ایک شخص نے، جو کمپنی کی ملازمت میں رہا، اپنی سوانح شائع کی۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ۱۹ ویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ٹھگوں اور ڈاکوؤں دونوں کا تذکرہ ہے کہ جس میں خود لطف اللہ نے بھی کسی نہ کسی شکل میں حصہ لیا۔ یہاں پر اس حصہ کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے کہ جو ڈاکوؤں سے متعلق ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ۱۹ ویں صدی میں سیاسی انتشار اور بے چینی کے سبب ایسے پیشہ ور ڈاکوؤں کے گروہ وجود میں آ گئے تھے جو قافلوں اور مسافروں کو لوٹ کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔

✥

یہ جنوری ۱۸۱۸ء کی بات ہے کہ میں نے سنا کہ جنگ شروع ہونے والی ہے اس لیے مجھ میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں کوئی ایسا موقع تلاش کروں کہ جس کی وجہ سے مجھے عزت و شہرت دونوں نصیب ہو سکیں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی غرض سے میں نے شہر میں ایسے قافلوں اور لوگوں کی تلاش شروع کر دی کہ جن کے ذریعہ میں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکوں۔ ایک دن جب کہ میں ادھر ادھر آوارہ گردی کر رہا تھا میں نے بیس اجنبی افغانوں اور ان کے جمعدار کو دیکھا کہ جو بظاہر بڑے مہذب اور اچھی طبیعت کے نظر آئے۔ یہ لوگ ایک بنئے کی دوکان پر ٹھہرے ہوئے تھے جب میں

ان کے قریب سے گزرا تو میں نے مسلمانوں کی عادت کے مطابق انہیں سلام کیا۔ ان کے جمعدار موسیٰ خان نے میرے سلام کا جواب بڑی گرمجوشی سے دیا اور مجھ سے درخواست کی کہ ان کے پاس بیٹھ کر حقہ وغیرہ سے شوق کروں۔ چونکہ میں بیکار تھا اس لیے میں نے اس کی دعوت خوشی سے قبول کرلی۔ اس کی گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ پونا سے واپس چھٹیوں پر اپنے وطن لاہور جا رہا ہے۔ اس پر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سفر پر کب روانہ ہو رہے ہیں کیونکہ میں نے اس سے کہا کہ "میں بھی دکن جانے کی سوچ رہا ہوں تاکہ وہاں مجھے کوئی ملازمت مل سکے"۔

جمعدار نے کہا کہ وہ یہ جگہ کل فجر کی نماز کے بعد چھوڑ رہا ہے اور اگر میں تیار رہوں تو وہ مجھے دس روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھنے پر تیار ہے۔ تنخواہ کے علاوہ میرا کھانا اور پینا ان کے ذمہ ہوگا بلکہ وہ میرے کپڑوں کا بھی خیال رکھے گا۔ میرے ڈیوٹی ہوگی کہ اس کے بیس پٹھانوں کا حساب کتاب رکھوں اور اگر اس دوران میں مجھے اور کوئی اچھی ملازمت مل جائے تو میں جاسکتا ہوں۔ اس نے اصرار کیا کہ اس سلسلہ میں جلدی کوئی فیصلہ کروں۔

اس پر میں فوراً راضی ہوگیا اور اس کی تمام شرائط منظور کرلیں اور اس سے وعدہ کیا کہ میں اگلی صبح جلدی معہ اسباب کے اس کے پاس آ جاؤں گا۔

"سامان وغیرہ کچھ لانے کی ضرورت نہیں" اس نے کہا "کیونکہ ہمارے پاس بھی سوائے جانمازوں اور ہتھیاروں کے کچھ نہیں ہے لیکن اگر تم کچھ لانا پسند ہی کرتے ہو تو اسے اٹھانے کی ذمہ داری تمہاری ہوگی"۔

لہٰذا میں نے بھی یہ سوچا کہ اس مختصر سے سفر کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ میں سامان اٹھا کر لاؤں اس لیے میں نے اسے کہہ دیا کہ میں سامان کے معاملہ میں اس قدر مختصر ہوں گا کہ جتنے اس کے آدمی بھی نہیں ہوں گے۔

میں خوشی خوشی گھر واپس آگیا۔ اپنی ساری چیزیں ایک بکس میں بند کر کے اس کی چابی خود رکھی اور اسے اپنی والدہ کے حوالے کیا کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ میں نے اپنے ارادہ کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو بھی پتہ چل گیا تو وہ مجھے جانے سے روکیں گے۔ اس ساری رات میں بالکل

بھی نہیں سوسکا اور میرے دماغ میں مستقبل کے سہانے منصوبے آتے رہے۔ اس دوران میں مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنے آپ ایک ایسے خطرے میں ڈال رہا ہوں اور اس بدقسمتی سے دوچار ہونے والا ہوں کہ جس سے موت بدرجہا اچھی ہوتی ہے لیکن انسان کی قسمت میں جو لکھ دیا گیا ہوتا ہے وہ اس کے آگے بالکل بے بس ہوتا ہے۔ یہ کس کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کل کیا پیش آنے والا ہے۔

سویرے سویرے جیسے ہی میں نے مرغ کی پہلی آواز سنی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد چادر کندھے پر ڈالی۔ قلم' دوات اور کاغذات ساتھ لیے اور اپنے نئے دوست کے پاس پہنچ گیا۔ یہ لوگ تیار ہو کر چلنے ہی والے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی خوشی کے نعرہ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور موسیٰ کہنے لگا کہ "یہ تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے جو تم ہم بہادر لوگوں کے ساتھ گزارو گے۔ خدا سے دعا ہے تمہارے آنے والے دن خوشگوار ہوں۔ ہم تمہیں تہہ دل سے خوش آمدید کہتے ہیں"۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے نماز پڑھ لی ہے۔ اس کا اثبات میں جواب پا کر اس نے کہا کہ میں آگ کے قریب بیٹھ کر ان کے ہتھیاروں کی نگرانی کروں جب تک وہ نماز پڑھ کر واپس نہ آ جائیں۔ میں نے جیسے ہی ان کی چیزوں کا چارج سنبھالا وہ نماز کے لیے قریبی مسجد میں چلے گئے۔ نماز پڑھ کر جب وہ واپس آئے تو انہوں نے ایک بار پھر سلام کیا۔ اس کے بعد چند لمحوں میں سفر کے لیے تیار ہوگئے۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے دعا پڑھی جس میں کامیابی اور نصرت کے لیے خدا سے دعا مانگی۔ اس کے بعد ہم سب روانہ ہوئے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے شہر کے دروازے سے نکل گئے۔

ہم شہر سے جنوب مغرب کی سمت چلے اور اپنے بائیں طرف ہم نے اندور کے شہر کو راستہ میں چھوڑا اور اس کے بعد سے دن رات سفر کے ذریعہ برابر آگے بڑھتے رہے۔ ایک بات جو میں نہیں سمجھ سکا وہ یہ کہ انہوں نے راستہ میں کسی بھی بڑے شہر میں قیام نہیں کیا بلکہ رات میں ہم ہمیشہ چھوٹے گاؤں میں قیام کرتے اور وہاں سے

کھانے پینے کا سامان خریدتے۔ رات کا کھانا ہم ہمیشہ تقریباً ۸ بجے کھاتے تھے۔ کھانے میں روٹی' پیاز یا گڑ ہوتا تھا۔ جہاں تک ناشتہ کا سوال تھا تو یہ ہر ایک کی ذمہ داری تھی کہ وہ خود اس کا بندوبست کرے۔ دیکھا جائے تو میرا وقت ان لوگوں کی صحبت میں بڑا خوشگوار گزر رہا تھا۔ موسیٰ خان خصوصیت سے میرا آرام کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

سفر کے چھٹے دن شام کو جب ہم اجین سے چلے تو ہم نے بھیلوں کے ایک گاؤں میں قیام کیا جو کہ پہاڑیوں کے دامن میں نربدا دریا کے کنارے واقع تھا۔ اس کے دونوں جانب مالوہ اور خاندیش کے صوبوں کی سرحدیں تھیں۔ جب میں نے سوال کیا کہ ہم سیدھا اور آسان راستہ چھوڑ کر آخر کیوں اس مشکل' دشوار اور پہاڑی راستہ سے جا رہے ہیں تو میرے ساتھیوں نے جواب دیا کہ جانغیا کا درہ اگر مشکل ترین راستہ ہے اور تنگ بھی بہت ہے مگر موسیٰ خان اس کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ یہ مانڈیشوار پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے جہاں سے نربدا دریا کو آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن رات دو بجے کے قریب ہم پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئے۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ہمارے سامنے اندھیرا تھا اور عقب میں خطرناک آوازیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ موسیٰ خان اور اس کے آدمی اس راستہ سے بخوبی واقف ہیں۔ کیونکہ وہ پیچیدہ چڑھائیوں' خطرناک ڈھلوانوں اور ڈراؤنے آبشاروں سے آگاہ تھے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی شہری اپنے شہر کی پیچیدہ گلیوں اور راستوں سے۔

صبح کے وقت ہم ایک چشمے کے پاس ٹھہرے اور یہاں وضو کر کے نماز پڑھی۔ اس صبح اس قدر سردی تھی کہ ہمارے دانت بج رہے تھے مگر افغان شاید اس سردی کے عادی تھے مگر میرا یہ حال تھا کہ میرا پورا جسم سن ہوگیا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پورے جسم میں برف بھر دی گئی ہو۔ نماز کے بعد موسیٰ خان نے آگ جلانے کا حکم دیا اور ساتھ میں حقہ پینے کی بھی اجازت دی۔ ہم نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور فوراً سوکھی لکڑیوں کو جن کی اس علاقے میں کمی نہ تھی جمع کر لیا۔ ایک افغان نے چقماق کے ذریعہ آگ سلگائی جس نے فوراً شعلوں کی شکل اختیار کر لی۔ آگ کی وجہ سے ہمیں یکدم آرام محسوس ہونے لگا۔

جب سورج ابھرنے لگا تو اس کی شعاعوں نے ہمیں آگ سے بے نیاز کر دیا۔

ناشتہ کے بعد ایک مرتبہ اور حقہ پیا گیا اور اس کے بعد تازہ دم ہو کر ہم نے اپنا سفر تیزی کے ساتھ شروع کر دیا۔ اگرچہ راستہ بڑا مشکل تھا مگر ہم درختوں کے تنوں میں سے ہوتے ہوئے ابھری ہوئی چٹانوں کی نوکوں کو پکڑتے ہوئے تنگ راستے سے آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ شام کے پانچ بجے ہم ایک جگہ پہنچے تو تمام افغانوں نے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے سفر کو ختم کر کے منزل مقصود پر پہنچ گئے"۔

میرے لیے یہ اچھنبے کی بات تھی کیونکہ نہ تو وہاں آبادی کا کوئی نام و نشان تھا اور نہ ہی دریا اور کشتی کے کوئی آثار تھے۔ اس لیے میں نے حیرانی سے موسیٰ خان سے پوچھا کہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟ میرے اس سوال پر اس نے تھوڑی دور وادی میں واقع جنگل کی طرف اشارہ کیا کہ جہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں میں ایک سال تک رہوں گا اور اس کے بعد اپنے وطن واپس لوٹوں گا" موسیٰ خان نے کہا۔

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اسی وادی میں اس کا آقا جو بھیلوں کا سردار ہے وہ رہتا ہے۔ اس کا نام نادر ہے اور اس کے حکم پر عمل کرنے کے لیے ۵ سو کے قریب لوگ ہر وقت تیار رہتے ہیں اور میں اپنے افغان دوستوں کے ساتھ اس کی مدد کرتا ہوں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم قافلوں اور کارروانوں کو لوٹتے ہیں۔ مال غنیمت جو حاصل ہوتا ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس میں سے دو نادر لے لیتا ہے اور باقی ہم افغانوں کے حصہ میں آتا ہے۔ موسیٰ نے یہ بیان کر کے مجھ سے کہا کہ میں خاطر جمع رکھوں کیونکہ لوٹ مار کی مہمات میں وہ مجھے ساتھ نہیں لے کر جائیں گے۔ میرا کام یہ ہوگا کہ میں گھر پر رہوں اور ان کے سامان کی حفاظت کروں اور جہاں تک حساب کتاب رکھنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے مجھے زیادہ وقت دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ شاید ایک مہینہ میں آدھ گھنٹہ۔

میں یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے خوف زدہ ہو کر رہ گیا اور میرا غصہ اچانک اس قدر بڑھا کہ میرا دل چاہا کہ اسے گالیاں دینا شروع کر دوں جس کا مطلب تھا کہ میں اس کے بعد مرنے کے لیے تیار رہوں لیکن میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے سوچا کہ

جذبات ہونے کے بجائے مجھے ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کرنا ہوگا۔ اس لیے میں نے بناوٹی مسکراہٹ سے اس سے سوال کیا کہ "کیا ہم پونا بالکل نہیں جائیں گے؟"
"نہیں، کبھی نہیں" اس نے جواب دیا "وہاں جانے کا کیا فائدہ جب کہ ہم اپنے مقصد یہاں پر حاصل کر لیں گے"۔

"کوئی بات نہیں" میں نے جواب دیا "چونکہ میں نے تمہاری ملازمت اختیار کر لی ہے تو میں ایک سال تمہارے ساتھ رہ کر خود کو تمہارے لیے مفید بنانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ قسمت میرے لیے کیا فیصلہ کرتی ہے"۔

اس کے بعد ہم اپنے میزبان کی رہائش گاہ کے قریب پہنچے اور اطلاع دینے کی غرض سے بندوق سے تین بار فائر کیا گیا جس کی آواز وادی میں گونجتی رہی۔ اس کے جواب میں ہمیں بھیلوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم نیم برہنہ بھیلوں کے درمیان میں تھے جو کہ تیر کمان سے مسلح تھے۔ ان کی کمانیں بانسوں کے درخت کی لکڑی سے بنی ہوئی تھیں جب کہ تیر عام تیروں کی طرح ہی تھے۔

ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھا کہ جس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے دھمکانے والے انداز میں ہم سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم کون لوگ ہو کہ جو رضاکارانہ طور پر موت کے منہ میں چلے آئے ہو"۔

"کیوں کالیا! تم نے مجھے نہیں پہچانا" موسیٰ خان نے کہا۔

بھیل نے موسیٰ خان کی آواز کو پہچان لیا اور اس کے بعد وہ اور دوسرے بھیل یہ کہتے ہوئے ہماری طرف بڑھے کہ "اے موسیٰ رے اپنو رپ نہیں" یعنی یہ ہمارا موسیٰ ہے کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم سب ان مقامی ڈاکوؤں کے ساتھ گھل مل گئے اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ موسیٰ اور کالیا جس دوستانہ انداز میں بات چیت کر رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پرانے تعلقات ہیں۔

رات ہوتے ہوتے ہم غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں پر ہم نے دیکھا کہ ایک کالا بھجنگ آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بھی اسی طرح سے نیم برہنہ تھا جیسے کے دوسرے بھیل لیکن اس کے ہاتھوں میں موٹا سونے کا کنگن تھا۔ اس کے سامنے تلوار پڑی ہوئی تھا اور ساتھ میں تیر و کمان تھے۔ وہ بھیلوں کے درمیان بیٹھا ہوا

تھا اور اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان بھیل ڈاکوؤں کا سردار ہے۔

موسیٰ نے اسے دیکھ کر سلام کیا اور کہنے لگا "یہ نادر بھائی ہیں' جنگل کے شہزادے۔ ان کو آداب کر کے تم لوگ گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے پاس آتا ہوں"۔

ہمیں دیکھ کر سردار کھڑا ہوگیا۔ ہمارے سلام کا جواب دے کر وہ موسیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور پھر دونوں مل کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہماری جماعت اپنے ان گھروں کی جانب روانہ ہوئی کہ جن میں انہیں اب رہنا تھا۔ وہ اس جگہ سے بخوبی واقف تھے اسی لیے انہیں کسی راہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں میں جس صورت حال سے دوچار تھا اس میں مایوسی' نفرت' غصہ سب ہی شامل تھے اور میری خواہشات اور امنگیں ان حالات میں کبھی کی ختم ہوچکی تھیں۔ ہمارے گھروں کی جگہ اگرچہ آدھے میل کے قریب ہوگی مگر مجھے ایسی تھکاوٹ ہوئی جیسی کہ میں سو میل کے قریب چل کر آیا ہوں۔ ہمارے گھر پہاڑی کی ابھری ہوئی چٹانوں کی پشت میں بنے ہوئے تھے۔ یہ درختوں کے تنوں سے بنائے ہوئے تھے۔ اس کے تین جانب بانسوں کی مضبوط دیوار تھی اور سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ دو بڑے برآمدے تھے اور ہر ایک کے ساتھ تین تین کمرے تھے جو کہ بانسوں کی بنی چکوں سے علیحدہ کیے ہوئے تھے۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے افغان بھی تھک کر چور ہوگئے' اس لیے انہوں نے اپنی بندوقوں کو برآمدوں میں لٹکایا اور ہر ایک علیحدہ علیحدہ کمروں میں جا کر چارپائیوں پر سوگیا۔ میں نے بھی اپنے ساتھیوں کی مانند اس بات کی کوشش کی کہ فوراً سو جاؤں تاکہ جو جسمانی اور ذہنی تھکن ہے اس سے مجھے افاقہ ہو جائے لیکن سونے کے بجائے میرا ذہن پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا کہ "آخر میں نے کیوں بلا تحقیق کے ان قاتل لوگوں کی جماعت کے ساتھ آنا پسند کیا؟ میں ایک مہینہ اور اپنے مہربان والدین کے ساتھ رہ کر کسی اور قافلہ کا انتظار کر سکتا تھا۔ یہ میرے تجربے کی کمی ہے' یا میری حماقت کہ میں ہمیشہ بدقسمتی کا شکار ہوتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ موسیٰ نے میرے ساتھ دھوکا کیا مگر ڈاکو کے لیے دھوکہ کرنا تو ایک مذاق ہوتا ہی ہے لیکن دیکھا جائے تو قصور میرا ہے کہ میں اس کے فریب میں آیا۔ میری عمر اب ۱۸ سال کی ہے اور مجھ میں

اچھے و برے کی پہچان ہونی چاہیے"۔

میں نے خود کو انتہائی مجبور اور لاچار پایا اور جیسا کہ ان حالات میں ہوتا ہے' میں نے آنکھیں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور دعا کے طور پر ہاتھ اٹھا کر خدا سے یہ دعا مانگی "اے رحیم و کریم تو کب تک مجھے اس عذاب میں مبتلا رکھے گا؟ کیا یہ میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان ڈاکوؤں' قاتلوں اور لٹیروں کے ساتھ رہوں۔ اے مالک ارض و سماء کیا میں اپنے خاندان کے نام کو بے عزت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں؟ اگر ایسا ہی ہے تو میرے خدا مجھ پر رحم کر اور اسی وقت میری زندگی کا خاتمہ کر دے۔ آمین"۔ جب میں یہ دعا مانگ رہا تھا میرے آنسو خود بخود آنکھوں سے نکلتے میرے گالوں سے ٹپک رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا خیال میرے ذہن میں آیا اور اس نے مجھے میرے جرائم و گناہوں سے چھٹکارا دلانا چاہا۔ میں سوچنے لگا کہ "اس میں میرا کیا قصور ہے کہ میں نے ان لوگوں پر اعتبار کیا۔ میرے نزدیک تو یہ انسان تھے اور اگر یہ انسان کے بجائے ڈاکو اور قاتل تھے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر تو نہیں آتی"۔

رات کو ۸ بجے کے قریب موسیٰ واپس گھر آیا۔ اس نے آتے ہی ہمیں آواز دی اور ہم سب لوگ بھاگے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ ہم نے بڑی حیرت اور مسرت سے دیکھا کہ اس کے ساتھ کچھ بھیل بڑی مقدار میں ہمارے کھانے کے لیے دودھ' شکر' پانی اور روٹیاں لے کر آ رہے ہیں۔ بھوک اور تھکن کی حالت میں ان اشیاء کو بڑی نعمت سمجھا گیا اور سب نے مل کر موسیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہم نے وضو کیا اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔ کھانے کے بعد سب سونے چلے گئے' سوائے دو سنتریوں کے' جنہیں حفاظت کی غرض سے چھوڑ دیا گیا۔ ان میں سے ایک برآمدے میں ٹھہرا' جبکہ دوسرا ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چونکہ تمام لوگ تھکے ہوئے تھے' اس لیے میرے سمیت سب ہی سو گئے۔ میرا خیال ہے کہ میں ان سب میں زیادہ گہری نیند سویا' کیونکہ صبح کے وقت میں خود سے نہیں اٹھا' بلکہ میرے شانوں کو ہلا کر مجھے بیدار کیا گیا۔

اٹھنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی ساری پریشانیوں کو بھول

جاؤں اور اپنے ماحول اور وہاں کے رہنے والوں سے واقفیت پیدا کروں۔ لہٰذا میں کبھی کبھی تنہا درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور سوچ و فکر میں ڈوب جاتا۔ کبھی کبھی میں اپنے افغان دوستوں' (جو کہ عوام کے دشمن تھے) سے بات چیت میں مصروف ہو جاتا۔ اسی دوران لوٹ مار اور مسافروں کی قتل و غارت گری کا سلسلہ نادر اور اس کے بھیلوں کے تعاون سے جاری رہا۔ یہ لوگ نہ صرف قافلوں اور کاروانوں کو لوٹتے تھے' بلکہ موقع ملتا تو قریبی گاؤں اور قصبوں میں بھی جا کر تباہی پھیلاتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ لڑائی یا لوٹ مار کے دوران اگر ان کا کوئی ساتھی زخمی ہو جاتا اور اس قابل نہ ہوتا کہ ان کے ساتھ بھاگ سکے تو یہ خود اس کا سر کاٹ کر یا تو اسے جلا دیتے تھے یا دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ گرفتار ہو کر کہیں ان کے راز نہ اگل دے۔

ہمارے آنے کے بعد ان کی ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہوگیا۔ مہینہ میں دو یا تین مرتبہ ۱۵ افغانوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ مقامی ڈاکوؤں کے ہمراہ مہم پر جائیں۔ اگر وہ دروں کے آس پاس کوئی ایسا مسافر' کہ جس کے پاس مال و دولت ہو' نہ ملتا تو اس صورت میں افغان قریبی قصبوں اور گاؤں کا رخ کرتے تھے' جبکہ بھیل دروں میں یا جنگلوں میں چھپ کر ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ اکثر یہ افغان قافلوں کو بہکا کر اپنے ساتھ لاتے تھے اور جب خفیہ مقام پر' کہ جہاں بھیل چھپے ہوتے تھے' پہنچتے تو انہیں خفیہ اشارہ کرتے۔ اس پر بھیلوں اور افغانوں میں ایک جھوٹی اور دکھاوے کی لڑائی ہوتی' جس میں افغان شکست کھا کر بھاگ جاتے۔ اس کے بعد بھیل مسافروں کا سامان چھین کر' ان کے کپڑے تک اتروا لیتے تھے۔ ان کے پاس صرف اتنا کپڑا بچتا کہ جس سے وہ اپنی برہنگی چھپا سکتے۔ اس کے بعد انہیں وہاں سے جانے کی اجازت ملتی۔ اگر یہ مسافر ذرا بھی مزاحمت کرتے تو اس کے نتیجے میں یا تو یہ زخمی ہو جاتے یا جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ یہ وہ کرتوت تھے کہ جن کا تذکرہ میرے افغان ساتھی مجھ سے فخریہ بیان کرتے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے خود کبھی اپنی آنکھوں سے یہ دہشت ناک مناظر نہیں دیکھے' لیکن یہ ضرور ہوا کہ بار بار ان واقعات کو سن کر میرے دل پر کچوکے لگتے رہے۔

جب وہ چوتھے حملے کے بعد واپس آئے' تو اس مرتبہ لوٹ کے مال کے ساتھ ان

کے چار ساتھیوں کے سر بھی تھے۔ ان میں سے تین بھیلوں کے تھے اور ایک نوجوان افغان کا' جس کا نام دارا تھا۔ یہ تینوں قافلے کے حفاظتی دستے کے ہاتھوں اس بری طرح زخمی ہوگئے تھے کہ ان کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا ناممکن ہوگیا تھا' اس لیے ان کے دوستوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ ان کے سر جسموں سے جدا کر دیے جائیں۔ ہم نے دارا کے سر کو اپنی رسم کے مطابق دفن کر دیا اور افسوس یہ ہے کہ اس غریب کو پھر کبھی کسی نے یاد نہیں کیا۔

میرا غصہ' ناراضگی اور نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا' لیکن میری اپنی بچت اسی میں تھی کہ میں اپنے خیالات کو چھپائے رکھوں اور منافقت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے سامنے مسکراتا رہوں۔

میرا دستور تھا کہ میں صبح چار بجے سو کر اٹھ جایا کرتا تھا اور ایک خاموش جگہ پر واقع چشمے پر جا کر وضو کرتا اور نماز پڑھتا۔ اس کے بعد واپس آ کر میں موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ناشتہ کرتا۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد میں اپنی غلیل کے ساتھ' جو ایک بھیل نے مجھے تحفے کے طور پر دی تھی' جنگل میں چلا جاتا۔ وہاں میں اپنا وقت یا تو چڑیوں اور چھوٹے پرندوں کو مارنے میں گزارتا یا کسی درخت کے سائے میں خاموشی سے بیٹھ جاتا اور اپنی پریشان کن صورت حال پر غور کرتا۔ اسی طرح سے چار مہینے گزر گئے' جو کہ حقیقت میں مجھے چار سال معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کہ ۸ مہینے اور مجھے اسی طرح گزارنا ہوں گے' تب جا کر میں اس قید سے رہا ہوں گا۔

ہمارے ساتھیوں کی آٹھویں مہم بہت ہی کامیاب رہی اور ہر افغان سونے' چاندی' زیورات اور سکوں سے لدا ہوا واپس آیا اور رات کو اس مال کی سب میں تقسیم ہوئی' جس کی وجہ سے جمعدار اور اس کی جماعت کو بڑا مال مل گیا۔ چاندی کی دو پازیب' ایک سونے کی چوڑی اور تیس روپے نقد' جو سب ملا کر چار سو روپے کے برابر ہوں گے' میرے حصے میں آئے۔ میں نے جمعدار کا اس پر شکریہ ادا کیا اور اپنا یہ مال کمرے میں دفن کر دیا۔ میرے حصے میں جو مال آیا' اس نے اگرچہ میرے دل میں لالچ کو پیدا کیا' لیکن فوراً ہی یہ خوشی دور ہوگئی کیونکہ اس لوٹے ہوئے مال سے مجھے وہ مسرت نہیں ہوئی جو کہ انسان محنت کر کے قانونی طور پر حاصل کرتا ہے۔

جب افغانوں کو یہ مال مل گیا تو اب ان کی خواہش ہوئی کہ وہ بھیل سردار سے رخصت لے کر چند مہینوں کے لیے اپنے گھر ہو آئیں۔ موسیٰ نے یہ درخواست ساتھیوں کی طرف سے کی اور بھیل سردار نے اسے فوراً منظور کر لیا۔ بھیل سردار نے کہا کہ چونکہ موسیٰ اور اس کے ساتھی چھ مہینے کے لیے جا رہے ہیں' اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ان کے جانے سے پہلے انہیں تین دن تک دعوت دے۔ فوراً ہی اس نے اپنے بھیل پیروکاروں سے کہا کہ وہ دعوت کی تیاری کریں۔

موسیٰ نے واپس آ کر جب یہ خبر اپنے ساتھیوں کو سنائی تو انہوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور میں سچ بتاؤں کہ اس خبر سے میں بھی بڑا خوش ہوا کیونکہ ایک لحاظ سے یہ میری آزادی کی خبر تھی۔ تین دن تک دعوت کے طور پر افیم' بھنگ سادہ اور مٹھاس کے ساتھ' مٹھائیاں اور ایک موٹا دنبہ بھیلوں کی طرف سے بھیجا گیا۔ افغان' جو مہمات کے بعد خود کو آزاد اور بے فکر محسوس کرتے تھے' انہوں نے کھانے اور نشہ آور چیزوں کا خوب استعمال کیا۔ وہ ہر رات کچھ دیر تک کھانے کے بعد بھیلوں کا ناچ دیکھتے رہے اور ان کے گانے سنتے رہے۔

ہمارے ساتھی تین دن تک دعوت کے کھانوں میں مصروف رہے اور اب انہیں امید تھی کہ چوتھی رات کی دعوت' جو آخری تھی' اس کے بعد انہیں جانے کی اجازت مل جائے گی۔ دعوت کی صبح کو میں جلدی بیدار ہو گیا اور اس چشمے کی جانب چلا گیا کہ جہاں میں وضو کرتا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں بیٹھ کر آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ جب میں آزاد ہو جاؤں گا اور مہذب دنیا میں واپس چلا جاؤں گا' اور ان ڈاکوؤں اور لٹیروں سے چھٹکارا پا لوں گا' لیکن میں نے ایک عجیب چیز محسوس کی کہ ان خیالات نے خوش کرنے کے بجائے مجھے اداس کر دیا۔ مجھے پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟ صبح کے سہانے وقت میں بجائے اس کے کہ میں خوش ہوتا' میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن میں نے ان باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اپنی رہائش گاہ کی جانب چلا۔ جب میں اس جگہ کے قریب پہنچا تو میں نے اچانک چیخنے' چلانے اور ایسی آوازیں سنیں کہ جیسے قصائی جانوروں کو ذبح کر رہے ہوں۔ اس کے بعد دردناک آوازیں آئیں جو دب کر سسکیاں بن گئیں۔ یہ سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے رک

گیا اور سوچنے لگا کہ شاید یہ بھیڑوں کی آواز ہو کہ جنہیں ہماری دعوت کے لیے ذبح کیا جا رہا ہو' لیکن پھر میں نے سوچا کہ ان دہشت ناک چیخوں کا کیا مطلب ہے؟ اس صورت حال میں ہوا یہ کہ میں جو آگے جا رہا تھا' اس کے بجائے پیچھے کی جانب بھاگنے لگا۔ تھوڑی دیر میں' میں نے حیرانی اور خوف کے عالم میں دیکھا کہ ایک افغان' کہ جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور جس کا لباس اس سے سرخ ہو گیا تھا' وہ بھاگا ہوا آ رہا ہے۔

اسے دیکھ کر میں اس کی جانب بھاگا اور اس سے پوچھا "ابراہیم خاں' کیا بات ہے؟" اس پر اس نے جواب دیا "ہم سب ختم ہو گئے' بھیلوں نے تمام افغانوں کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے اپنے سر کو بچاتے ہوئے' دیکھو' تین انگلیاں کٹوا دی ہیں۔ میرے زخم اس قدر گہرے نہیں ہیں' لیکن موت سے بچنے کی خاطر میں بھاگا جا رہا ہوں۔ تم میرے پیچھے مت آنا' وہ شاید میرا پیچھا کریں اور پکڑ لیں۔ تم خود بھاگ جاؤ اور اپنی جان بچاؤ"۔

"خدا حافظ ابراہیم" میں نے کہا "خدا تمہاری حفاظت کرے"۔

(لطف اللہ نے بھی بھاگ کر جان بچائی)

(ص ٦٧ تا ٨٠)

سلطانہ ڈاکو

عہد برطانیہ میں جن ڈاکوؤں نے بڑی شہرت حاصل کی' ان میں سلطانہ ڈاکو اپنی بہادری' فیاضی و سخاوت اور دلیری کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ اس کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ امیروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا تھا' اسی لیے گاؤں کے لوگ اس کی مدد کرتے تھے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے باغی کی بن گئی تھی کہ حکومت کی طاقت کے خلاف وہ عام لوگوں کے لیے مزاحمت کی علامت بن گیا تھا۔

سلطانہ ڈاکو کے بارے میں مشہور شکاری جم کاربیٹ نے اپنی کتاب "میرا ہندوستان" میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں اس کی سرگرمیوں اور پھر اس کی گرفتاری پر لکھا ہے۔ یہ اقتباس اس کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

✥

ہندوستان جیسے وسیع ملک' جس میں بڑے بڑے جنگلات' ناقص خبر رسانی کا نظام اور بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی' جو فاقوں سے ہمکنار ہے' یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو گا کہ لوگ بحالت مجبوری جرائم کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور حکومت کو مجرموں کے گرفتار کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ علاوہ ان معمولی مجرموں کے جو دنیا کے تمام ممالک میں پائے جاتے ہیں' ہندوستان میں متعدد قبائل ایسے ہیں جن کو جرائم پیشہ قرار دینے کے بعد علیحدہ علیحدہ نو آبادیات میں منتقل کر دیا گیا ہے اور حکومت ان کی

نقل و حرکت پر ان کے جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے پابندیاں عائد کرتی ہے۔

جنگ عظیم کے دوران جب میں فلاح و بہبود کے کام پر متعین تھا' میں اکثر ان نوآبادیات کو دیکھنے جاتا تھا۔ ان جرائم پیشہ قبیلوں کی نوآبادیات میں لوگ مقید نہیں تھے' اس لیے مجھے ان سے اور سرکاری ملازمین سے نہایت دلچسپ باتیں کرنے کے مواقع ملے' جو ان کی نگرانی کرتے تھے۔ ان قبیلوں کی مجرمانہ ذہنیت مبذول کرانے کے لیے حکومت نے ان کو مفت زرخیز زمین میرٹھ ضلع میں دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر دی تھی۔ اس زرخیز زمین میں نہایت عمدہ گنا' گیہوں' تل' جو اور مختلف قسم کی دالیں پیدا ہوتیں' لیکن جرائم میں کمی نہیں ہوئی۔ حکومت کے نمائندے نے اس کا الزام لڑکیوں پر رکھا جو سوائے جرائم پیشہ کے کسی اور سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ یہ قبیلہ سرقہ کرنے کا ماہر تھا اور اس نوآبادی کے پرانے تجربہ کار ضعیف لوگ جوانوں کو نفع کی شراکت پر تربیت دیتے تھے۔ مردوں کو اجازت نامہ حاصل کر کے اس میں اندراج کیے ہوئے مقررہ وقت تک کے لیے نوآبادی سے باہر جانے کی اجازت مل جاتی تھی لیکن عورتوں کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ آبادی کے جرائم پیشہ بزرگ تین باتوں کی سختی سے پابندی کراتے تھے۔ پہلی پابندی یہ تھی کہ ہر شخص تنہا سرقہ کرے گا۔ دوسری یہ کہ جائے واردات آبادی سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پر ہو اور تیسری یہ کہ جرم کرتے وقت کسی حالت میں کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے۔

جوان لڑکے تربیت مکمل کرنے کے بعد عام طور پر یہ طریقہ کار استعمال کرتے تھے کہ کلکتہ' بمبئی یا دور دراز مقامات پر کسی مالدار شخص کے گھر ملازم کی حیثیت سے کام کرتے اور جب بھی موقع ملتا' اپنے آقا کے گھر سے ایسی قیمتی اشیاء جو آسانی سے علیحدہ کی جا سکتی تھیں مثلاً سونا' زیورات یا قیمتی پتھر سرقہ کر لیتے۔ ایک موقع پر جب میں بہت سے جوان لڑکوں کو اجرت دے رہا تھا' جن لوگوں نے گنے کے کھیت سے ہانکا کر کے کالے تیتر اڑائے تھے' حکومت کے نمائندے نے مجھے بتایا کہ جس لڑکے کے ہاتھ میں ابھی میں نے آٹھ آنے رکھے تھے اور مزید دو آنے تیتر اٹھا کر لانے کے لیے وہ ایک سال کی غیر حاضری کے بعد ابھی چند دن ہوئے اس آبادی میں واپس آیا ہے اور اپنے ساتھ تیس ہزار روپے کا ہیرا لے کر آیا ہے۔ آبادی کے بزرگوں سے اس

کی مالیت کا اندازہ لگوا کر اس کو چھپا دیا ہے اور سب سے حسین لڑکی نے اس سے اگلے شادی کے موسم میں منسلک ہونے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک اور شخص نے' جو نزدیک کھڑا ہے اور جس نے ہانکے میں حصہ نہیں لیا تھا' اپنی منظور نظر کو متاثر کرنے کا ایک نرالا طریقہ استعمال کیا اور وہ یہ تھا کہ کلکتے سے چوری کی ہوئی نئی موٹر آبادی میں لانے کے لیے کچے اور بیل گاڑی کے راستوں سے چلاتا ہوا موٹر کو لڑکی کے گھر کے سامنے لا کر کھڑی کر دیا۔ کار چلانے کے لیے اس نے پہلے سے باقاعدہ فیس دے کر لائسنس حاصل کیا تھا۔

چند اشخاص' جن کا تعلق جرائم پیشہ قبیلوں سے ہے اور جن پر سخت نگرانی نہیں کی جاتی' بحیثیت چوکیدار نجی گھرانوں میں نوکر ہو جاتے ہیں اور میرے علم میں ایسی مثالیں ہیں کہ چوری نہ ہونے کی ذمہ داری کے لیے چوکیدار کا اپنا جوتا مالک مکان کے دروازے کے سامنے رکھ دینا کافی ضمانت تصور کی جاتی ہے۔ یہ افشائے راز کی دھمکی دے کر روپیہ بٹورنے کا گھٹیا طریقہ ضرور ہوگا کیونکہ ان کی تنخواہ تین سے لے کر پانچ روپیہ تک تھی جو اس کے تجربہ کے لحاظ سے دی جاتی تھی اور یہ رقم آسانی سے مل جاتی تھی کیونکہ چوکیداروں کو صرف یہ کرنا پڑتا تھا کہ رات کو اپنے جوتے جگہ پر رکھ دیں اور صبح کو اٹھا لیں۔

یو۔ پی میں سنگین جرائم کو ترجیح دینے والی "بھانتو" ایک ایسی جرائم پیشہ قوم تھی جس پر سخت پابندی کی جاتی تھی۔ سلطانہ اسی قبیلے کا ایک بدنام ڈاکو تھا جو تین سال متواتر حکومت کی طرف سے کی جانے والی انتہائی کوشش کے اپنی گرفتاری کو ناکام بناتا رہا۔ یہ قصہ سلطانہ ہی کے بارے میں لکھا ہے۔

پہلی مرتبہ جب میں نے نیا گاؤں دیکھا تھا' وہ ترائی اور بھابر کے درمیان کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھا اور اس خطے میں واقع تھا جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں تھا۔ ایک ایک گز اس زرخیز زمین کا حصہ نئے جنگل کے اندر بنایا گیا تھا جہاں نہایت عمدہ کاشت ہوتی تھی اور سو سے زیادہ کاشت کار خوش حال' مطمئن اور خوش تھے۔ سر ہنری ریمزے' جو بغیر تاج کے بادشاہ کہلائے جاتے تھے' ان محنتی لوگوں کو ہمالیہ پہاڑ سے لے کر آئے تھے اور ایک پشت تک ان لوگوں نے خوب ترقی کی اور خوش حال

رہے۔

اس حصے میں ملیریا کو بھابر بخار کہا جاتا ہے اور اتنے پھیلے ہوئے حصے میں چند ڈاکٹر تھے جن کی نہ تو اتنی قابلیت تھی اور نہ ذرائع جو اس بیماری کو پھیلنے سے بچا سکتے۔ بھابر کے جنگلوں کے درمیان میں نیا گاؤں پہلا مقام تھا جو اس بیماری سے متاثر ہوا اور جوں جوں کاشتکار مرتے گئے' کھیت پر کھیت تباہ ہوتے گئے حتیٰ کہ چند صحت مند لوگ باقی رہ گئے اور جب ان لوگوں کو ہمارے گاؤں میں زمین دے دی گئی تو نیا گاؤں دوبارہ جنگل بن گیا۔ ایک مرتبہ اور اگلے سالوں میں زمین کو کاشت کے قابل بنانے کی کوشش کی گئی' اس مرتبہ پنجاب کے ایک ڈاکٹر نے ہمت کی لیکن جب پہلے اس کی بیٹی' پھر اس کی بیوی اور بعد ازاں خود ملیریا کی وجہ سے انتقال کر گیا تو دوسری مرتبہ نیا گاؤں جنگل ہو گیا۔

جو زمین کا حصہ بڑی محنت سے صاف اور ہموار کیا گیا تھا اور جہاں کثرت سے گنا' جو' گیہوں' تل اور چاول پیدا ہوتے تھے' وہاں نہایت عمدہ گھاس پیدا ہونے لگی۔ ایسی عمدہ چراگاہ دیکھ کر ہمارے گاؤں کے مویشیوں نے اس تین میل دور جگہ کو مستقل طور پر اپنا پیٹ بھرنے کی جگہ بنا لیا۔ جب کھلے میدانوں میں' جو جنگلوں سے گھرے ہوں' مویشی کافی عرصے تک چرتے رہیں تو گوشت خور جانور قدرتی طور پر اس طرف رجوع ہوتے ہیں اور ایک سال ہمارے موسم گرما کے نینی تال والے مکان سے کالا ڈھنگی کے موسم سرما والے مکان واپسی پر یہ سن کر قطعی تعجب نہیں ہوا کہ اس چراگاہ کے نزدیک ایک تیندوے نے رہائش اختیار کر لی ہے اور مویشیوں کا بے حد نقصان کر رہا ہے۔ اس گھاس کے خطے میں کوئی درخت نہیں تھا' جہاں اس تیندوے کو مارنے کی غرض سے بیٹھ سکتا' اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ یا تو میں علی الصبح' جب وہ کسی پوشیدہ مقام پر چھپنے اور دن گزارنے جا رہا ہو یا شام کو اپنے مارے ہوئے شکار کو کھانے یا نئے جانور کے مارنے کی گھات میں بیٹھنے جا رہا ہو' میں اس کو ماروں گا۔ ان دونوں منصوبوں میں سے کسی ایک کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کی کمین گاہ کا سراغ لگاؤں' چنانچہ ایک دن صبح میں اور میرا کتا روبن یہ اطلاع فراہم کرنے روانہ ہوئے۔

باوجود اس کے کہ کئی سال سے کوئی کاشت نہیں ہو رہی تھی' جگہ کا نام ابھی تک نیا گاؤں چلا آ رہا تھا۔ اس کے شمال میں ایک سڑک ہے جس کو کنڈی سڑک کہتے ہیں اور مشرق میں پرانی شاہراہ ہے جو ریل کے وجود میں آنے سے پہلے یو۔ پی کو کماؤن کے اندرونی حصے سے ملاتی تھی۔ نیا گاؤں کے جنوب میں اور مغرب میں گھنے جنگل ہیں۔

کنڈی اور شاہراہ دونوں آج کل بہت کم استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ پہلے ان دونوں راستوں کا جائزہ لوں' قبل اس کے کہ جنوب مغرب کی مشکل زمین دیکھوں' گزشتہ زمانے میں اس چوراہے پر راہ گیروں کو رہزنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کا گارڈ تعینات کیا جاتا تھا۔ روبن اور میں نے مادہ تیندوے کے پیروں کے نشانات کا پتہ چلا لیا۔ ہم دونوں اس تیندوے سے واقف تھے کیونکہ یہ کئی سال ہمارے گاؤں کے نچلے حصے میں ایک گھنے ٹکڑے میں رہتی تھی۔ علاوہ اس کے کہ اس نے کبھی ہمارے مویشیوں کو نقصان نہیں پہنچایا' وہ سوروں اور بندروں کو ہماری کاشت کو نقصان پہنچانے سے محفوظ رکھتی تھی۔ چنانچہ ان نشانات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم شاہراہ پر "گرپو" کی جانب چلتے رہے۔ گزشتہ شام سے اس سڑک پر کوئی نقل و حرکت نہیں ہوئی تھی' اس لیے جتنے جانور اس پر چلے تھے یا سڑک پار کی تھی' اپنے پیروں کے نشانات خام سڑک پر مٹی میں چھوڑ گئے تھے۔

روبن میرا مستقل ساتھی اور ذہین کتا تھا اور میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر اس کو بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ ہم پرندوں کے شکار کی نیت سے نہیں نکلے ہیں' اس لیے راستے میں ملنے والے مور یا کہیں کہیں جنگلی مرغیاں' جو پنجوں سے سوکھے پتے کھرچتے ملیں' ان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی توجہ اس شیرنی اور اس کے دو بچوں پر رکھی جو ہم سے ایک گھنٹہ پہلے اسی سمت گئی تھی۔ درمیان میں کسی کسی جگہ اس چوڑی سڑک پر بہت زیادہ گھاس پیدا ہو گئی تھی۔ شبنم سے بھیگی اس گھاس پر شیرنی کے بچے لوٹتے اور قلابازیاں کھاتے گئے تھے اور روبن کی ناک شیر کی بھینی اور ہیبت ناک خوشبو سے بھری تھی۔ یہ تینوں ایک میل تک تو سڑک پر چلتے رہے' اس کے بعد شمال کی جانب ایک شکاری راستے پر مڑ گئے۔ چوراہے سے تین میل اور گرپو سے دو میل ایک شکاری

راستہ نیا گاؤں سے آ کر اس راستے کو کاٹ کر گزرتا ہے۔ اس سڑک پر ہم نے ایک بڑے نر تیندوے کے پیر کے نشانات دیکھے۔ اسی تیندوے کی ہم کو تلاش تھی۔ یہ تیندوا چراگاہ کی طرف سے آ کر اس راستے کو کاٹ کر گزرا تھا۔ اس تیندوے میں ایک بڑی گائے کے مارنے کی صلاحیت تھی اور ایک ہی قامت کے دو تینددوں کا ایک ہی علاقے میں رہنے کا امکان نہیں تھا۔ روبن تو ان نشانات پر چلنے کا بے حد خواہش مند تھا لیکن جس گھنے اور خاردار جنگل کی طرف تیندوا گیا تھا' وہی جنگل تھا جہاں ایک سال قبل کنور سنگھ اور ہر سنگھ زندگی سے قریب قریب ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور تیندوے جیسی قوت بینی اور سماعت رکھنے والے جانور کی گھات میں بیٹھنا نامناسب تھا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں اس سے بہتر اور آسان منصوبہ تیندوے سے رابطہ قائم کرنے کا تھا' چنانچہ ہم نے اپنے گھر کی طرف رخ کیا اور ناشتہ کرنے واپس لوٹ آئے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں روبن اور میگی اپنے ہی پیروں کے نشانات پر گرپو کی سڑک پر روانہ ہوئے۔ تیندوے نے گزشتہ دن ہمارے مویشیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن یہ امکان تھا کہ اس نے چیتل یا سور' جہاں ہمارے مویشی چرتے ہیں' مارا ہو۔ اگر کوئی جانور نہ بھی مارا ہو تو یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی مقبول شکارگاہ میں معمول کے مطابق جائے' چنانچہ روبن کو اپنے درمیان بٹھا کر میں اور میگی سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گئے جو اس پگڈنڈی سے تقریباً سو گز تھی اور جس سمت تیندوا صبح گیا تھا۔ ہمیں وہاں بیٹھے طائران خوش نوا کی بولیاں سنتے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ ایک بڑا مور اپنے پروں کو پھیلائے شاہانہ انداز میں سڑک پار کر کے شکار والی پگڈنڈی کی سمت چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دس یا بارہ چیتلوں نے جہاں ہمارا خیال تھا کہ تیندوا لیٹا ہوگا' اہل صحرا کو اس کی موجودگی سے متنبہ کیا۔ دس منٹ بعد اور ہمارے نزدیک ایک چیتل نے اس تنبیہہ کو دہرایا۔ تیندوا حرکت میں تھا اور ہماری طرف آ رہا تھا' چونکہ وہ اپنے مارے ہوئے شکار کی طرف جا رہا تھا۔

روبن اپنے اگلے پنجوں پر سر رکھے ساکت لیٹا تھا اور جنگلی جانوروں کے دیے جانے والے اشاروں کو غور سے سن رہا تھا۔ جب اس نے مجھے اپنا پیر کھینچ کر اپنی رائفل کو گھٹنے پر رکھتے دیکھا تو اس کا بدن تھرتھر کانپنے لگا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وجہ

سے ہوا کہ وہ میرے بائیں پیر سے لگا بیٹھا تھا۔ تیندوا' جس سے روبن تمام اور جنگلی جانوروں سے زیادہ خائف تھا' عنقریب اپنے سر کو جھاڑیوں کے پیچھے سے نکالے گا اور سڑک کو اوپر نیچے دیکھ کر ہماری طرف آئے گا' چاہے وہ گولی لگتے ہی ختم ہو جائے یا مہلک زخم کھانے کے بعد۔ روبن اسی طرح ساکت اور خاموش بیٹھا رہے گا کیونکہ وہ اس شکار میں حصہ لے رہا تھا جس کی ہر حرکت سے وہ بخوبی واقف تھا اور اس کے لیے اتنا ہی دلچسپ تھا جتنا ہیبت ناک۔

مور تھوڑی دور چلنے کے بعد آلوچے کے درخت پر چڑھ گیا تھا اور پکے ہوئے پھلوں کے کھانے میں مصروف تھا' اچانک اڑ کر شور مچاتا ایک سوکھے درخت پر بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے اس نے چیتل کی دی ہوئی تنبیہہ میں اضافہ کر دیا۔ چند منٹ بعد شاید پانچ منٹ' تیندوا نہایت احتیاط سے سڑک کے قریب آئے گا۔ میں نے کن اکھیوں سے سڑک کے نیچے کی طرف ایک حرکت محسوس کی۔ وہ ایک شخص تھا جو بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔ اس سڑک پر ایسے وقت کسی کو دیکھنا جب سورج غروب ہونے والا ہو' تعجب انگیز تھا اور اس کا تنہا ہونا اور بھی غیر معمولی تھا۔ ہر قدم جو وہ شخص اٹھا رہا تھا' ہمارے تیندوے کے مارنے کے امکانات کو ختم کرتا جا رہا تھا اور غالباً وہ مدد کا طالب اور بہت تکلیف میں تھا۔ وہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا لیکن میں اس کو پہچان گیا۔ وہ ہمارے گاؤں کے برابر والے گاؤں میں اسامی کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور سردیوں میں کرپو سے تین میل کے فاصلے پر تنخواہ دار گوالے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا لیکن جب مجھے پہچانا تو ہماری طرف رخ کیا اور سخت مشتعل انداز میں کہنے لگا "صاحب بھاگو' سلطانہ کے آدمی میرا پیچھا کر رہے ہیں"۔

اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور سخت تکلیف میں تھا۔ میری اس کو بیٹھنے اور آرام کرنے کی دعوت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے اپنا پاؤں موڑ کر دکھایا اور کہنے لگا "صاحب دیکھئے میرا کیا حشر بنایا ہے۔ اگر مجھے پکڑ لیا تو یقینی طور پر مجھے جان سے مار دیں گے اور اگر آپ نہیں بھاگے تو یہی حشر آپ کا بنائیں گے۔ جو پیر مجھے دکھایا اس کی پنڈلی پر چابک مار کر شدید زخمی کیا تھا اور مٹی اور خون ملا ہوا ٹپک رہا تھا۔ میں

نے اس شخص کو سمجھایا کہ اب بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں' میں جھاڑیوں سے باہر آیا جہاں سے سڑک کافی دور تک دکھائی دیتی تھی لیکن نہ تو تیندوا دکھائی دیا اور نہ ہی سلطانہ کے ساتھی۔ وہ شخص لنگڑاتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ چونکہ صحیح نشانہ لگانے کے قابل روشنی نہیں رہی تھی' میگی' میں اور نہایت دل برداشتہ روبن اپنے گھر کالا ڈھنگی واپس آ گئے۔

دوسرے دن صبح اس شخص سے مفصل حالات معلوم ہوئے۔ ہوا یہ تھا کہ وہ گرپو اور مویشیوں کے باڑے کے درمیان بھینس چرا رہا تھا۔ اس کو بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے گاؤں کے مکھیا کا بھتیجا اس دن علی الصبح چیتل کا شکار کھیلنے کی نیت سے مویشیوں کے باڑے آیا تھا۔ جب وہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا اس بات کا اندازہ کر رہا تھا کہ آیا چلائی ہوئی گولی کاری ثابت ہوئی ہوگی یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو کیا وہ شکار کے گوشت کا کچھ حصہ اس کے رات کے کھانے کے لیے مویشیوں کے باڑے میں چھوڑ کر جائے گا یا نہیں' اسی دوران اپنے پیچھے اس کو سرسراہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو پانچ اشخاص اس کے سر پر سوار تھے۔ ان لوگوں نے اس سے کہا "کھڑے ہو جاؤ اور اس جگہ لے کر چلو جہاں سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی ہے"۔ جب اس نے کہا کہ وہ سو رہا تھا اور اس کو بندوق چلنے کی آواز سنائی نہیں دی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ اچھا تو مویشیوں کے باڑے کا راستہ بتاؤ کیونکہ ان کے خیال میں گولی چلانے والا شاید وہیں جائے گا۔ ان اشخاص کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا لیکن ان کے سردار کے پاس ننگی تلوار تھی اور اس نے تنبیہہ کی کہ اگر وہ بھاگا یا شور مچایا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

جب وہ جنگل میں ہو کر گزر رہے تھے' تو تلوار والے شخص نے اس کو بتایا کہ وہ سلطانہ کے گروہ کے آدمی ہیں اور سلطانہ بھی تھوڑے فاصلے پر خیمہ زن ہے۔ جب سلطانہ کے کان میں بندوق چلنے کی آواز آئی تو اس نے حکم دیا کہ بندوق چھین لاؤ' اس لیے اگر مویشیوں کے باڑے میں کوئی مخالفت ہوئی تو باڑے کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا اور اس کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس تنبیہہ نے اس کو پس و پیش میں مبتلا کر دیا۔ باڑے والے بہادر لوگ تھے اور ان کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو یہ شخص یقیناً جان

سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اگر مخالفت نہ ہوئی تو اس کا سلطانہ جیسے خوفناک ڈاکو کے ساتھیوں کو راستہ بتا کر باڑے لانا ایک ناقابل معافی جرم تصور کیا جائے گا اور باڑے والے اس کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ جس وقت یہ ناخوشگوار خیالات اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے' ایک نر چیتل' جس کا جنگلی کتے تعاقب کر رہے تھے' جنگل سے بے تحاشا بھاگتا ان لوگوں سے چند گز کے فاصلے سے گزرا۔ یہ دیکھ کر کہ ڈکیت اس دوڑ کو دیکھنے میں مصروف ہیں' نہایت پھرتی سے پگڈنڈی سے لمبی لمبی گھاس میں غوطہ لگایا اور باوجود پیر شدید زخمی ہونے کے جیسے ہی ڈاکو نے تلوار کا وار کیا' وہ اپنے پیچھا کرنے والے سے پینترا بدل کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور شاہراہ پر پہنچ کر بھاگنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد ہمارے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا' جہاں ہم تیندوے کی گھات میں بیٹھے تھے۔

سلطانہ کا تعلق جرائم پیشہ قوم "بھانتو" سے تھا۔ مجھے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کسی قوم کو جرائم پیشہ قرار دے کر اس کو نجیب آباد کے قلعہ میں مقید کر دینا صحیح تھا یا غلط' لیکن یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ سلطانہ مع اپنی جوان بیوی اور بچے کے سالویشن آرمی کی زیر نگرانی اس قلعہ میں بند تھا۔ ایک رات اپنے مقید ہونے سے بیزار آکر قلعہ کی مٹی کی دیوار کود کر فرار ہوگیا۔ یہ حرکت کوئی بھی جوان اور بلند حوصلہ انسان کر سکتا تھا۔ اس کے فرار ہونے کا واقعہ میری اس کہانی کے قلمبند کرنے سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا اور اس دوران اس نے اپنے گروہ میں سو مسلح جوشیلے لوگ اکٹھے کر لیے تھے۔ اس مرعوب کرنے والے گروہ کا کام ڈکیتیاں ڈالنا تھا اور ترائی' بھابر کے جنگلوں میں چلتی پھرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی سرگرمی کا دائرہ مشرق میں گونڈہ سے لے کر مغرب میں سہارن پور تک تھا' جن کا درمیانی فاصلہ کئی سو میل تھا اور اکثر ملحقہ صوبہ پنجاب میں بھی چھاپہ مارتے تھے۔

حکومت کے دفاتر میں کئی کاغذی مسلیں سلطانہ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں ہیں۔ میری تو ان مسلوں تک رسائی نہیں ہو پائی' اس لیے اگر میری کہانی جو میری ذاتی معلومات اور ان کاوشوں تک محدود ہے' جن میں خود میں نے حصہ لیا تھا' حکومت کی اطلاعات سے مختلف ہو یا تضاد پایا جائے' تو میں صرف

افسوس کر سکتا ہوں لیکن اپنی کہانی سے ایک لفظ کی بھی رد و بدل کرنے کو تیار نہیں۔
سلطانہ کے بارے میں سب سے پہلے مجھے اس وقت معلومات ہوئیں جب وہ گرپو کے جنگلوں میں ہمارے کالا ڈھنگی والے مکان سے چند میل کے فاصلے پر خیمہ زن تھا' اس وقت پرسی ونڈھم کماؤن کے کمشنر تھے اور چونکہ ترائی اور بھابر کا علاقہ انہی کے تحت تھا' اس لیے ونڈھم نے حکومت سے فریڈی ینگ ایک نوجوان پولیس آفیسر' جن کی یو۔ پی پولیس میں چند سال کی سروس تھی' خدمات حاصل کیں۔ حکومت نے ونڈھم کی درخواست قبول کرتے ہوئے تین سو افراد پر مشتمل ایک خاص ڈکیتی پولیس فورس قائم کرنے کی اجازت دی اور فریڈی ینگ کو اس فورس کا سربراہ مقرر کرتے ہوئے ان کو اختیار کلی دیا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق آدمیوں کا چناؤ کریں۔ ینگ اس فورس کے چناؤ کی وجہ سے کافی غیر مقبول ہوگئے' اس لیے کہ ملحقہ اضلاع سے اس فورس کے لیے بہترین پولیس والوں کا چناؤ کیا۔ چونکہ سلطانہ کی گرفتاری ایک خاص اہمیت رکھتی تھی' اس لیے ان کے اپنے ساتھیوں کو بہترین آدمیوں سے محروم ہونا سخت ناگوار گزرا جو شاید ضلع میں رہتے ہوئے سلطانہ کی گرفتاری میں کار آمد ثابت ہوسکتے تھے۔

جس وقت فریڈی ینگ اسپیشل ڈکیتی پولیس فورس کی تنظیم میں مصروف تھے' سلطانہ ترائی اور بھابر کے چھوٹے قصبوں میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ فریڈی ینگ کی سلطانہ کو گرفتار کرنے کی پہلی کوشش رام نگر کے جنگلوں میں تھی۔ محکمہ جنگلات جنگل کے کچھ حصے کے درخت کٹوا رہا تھا اور اس کام کے لیے کافی مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک ٹھیکیدار سے کہا گیا کہ وہ سلطانہ کو اپنے کیمپ میں ناچ' گانے اور کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دے کیونکہ سلطانہ قریب ہی کسی جگہ خیمہ زن تھا۔ سلطانہ اور اس کے گروہ نے یہ دعوت قبول کرلی۔ جشن شروع ہونے سے تھوڑی دیر قبل ڈاکوؤں نے اس پروگرام میں ایک تبدیلی کی اور وہ یہ کہ پہلے کھانا ہو اس کے بعد ناچ۔ سلطانہ نے کہا کہ اس کے ساتھی کھانے کے بعد ناچ سے اور بھی زیادہ لطف اندوز ہوں گے۔

اس واقعہ کو شروع کرنے سے پہلے ان لوگوں کی اطلاع کے لیے ضروری ہوگا جن

کو کبھی مشرقی ممالک میں جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو کہ محفل رقص میں یہاں مہمان صرف تماش بین کی حیثیت سے بیٹھتے ہیں' خود کوئی حصہ نہیں لیتے۔ رقص صرف رقاصہ اور سازندوں تک محدود رہتا ہے۔

اس ڈرامے کی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے دونوں جانب روپے کی فراوانی تھی۔ خبر حاصل کرنے کے لیے مشرق میں اتنا ہی خرچ کیا جاتا ہے' جتنا مغرب میں۔ سب سے پہلا کھیل جو میزبان اور مہمان کے درمیان کھیلا جانے والا تھا' وہ پوشیدہ طریقوں سے معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس معاملہ میں سلطانہ فائدے میں تھا' اس لیے کہ وہ انعام بھی دے سکتا تھا اور سزا بھی اور فریڈی ینگ مخبروں کو سلطانہ کی نقل و حرکت بتانے کے سلسلے میں صرف انعام دے سکتے تھے اور جب بات مشہور ہو گئی تو سلطانہ کو ناخوش کرنے پر کوئی آمادہ نہیں تھا' اس لیے کہ سرکاری مخبروں کے ساتھ وہ سخت بے دردی سے نمٹتا تھا۔

غریب یا بہت مفلس ہونے کی صعوبتوں کا اندازہ سلطانہ کو کئی سال نجیب آباد کے قلعہ میں مقید ہونے کے دوران ہوا اور اسی وقت سے وہ غربا کے لیے گداز دل رکھتا تھا۔ اس کے لیے مشہور تھا کہ جتنے عرصے وہ ڈکیتیاں ڈالتا رہا' کبھی کسی غریب کا ایک پیسہ نہیں لوٹا۔ مالی امداد دینے میں ہمیشہ دریا دلی سے کام لیا اور چھوٹے دکانداروں سے چیزیں خریدتے وقت ہمیشہ دوگنی قیمت ادا کی۔ اس کی فیاضی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے مخبروں کی تعداد سینکڑوں ہوگی اور اس کے علم میں ہوگا کہ جو دعوت رقص اور طعام اس کو دی گئی تھی' وہ فریڈی ینگ کے ایما پر ہوگی۔

اس رات کے لیے تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ مالدار ٹھیکیدار نے رام نگر اور کاشی پور سے اپنے دوستوں کو مدعو کیا۔ بہترین طائفوں اور ان کے سازندوں کو بلایا گیا اور وافر مقدار میں کھانا اور شراب مہیا کی گئی۔ شراب خاص طور پر ڈکیتوں کے لیے خرید کر بیل گاڑی کے ذریعے کیمپ تک لائی گئی تھی۔

مقررہ وقت پر وہ رات جو سلطانہ کا خاتمہ دیکھنے والی تھی' ٹھیکیدار کے مہمان اکٹھے ہوئے اور کھانا شروع کیا۔ یہ ممکن ہے کہ ٹھیکیدار کے مہمانوں کو یہ علم نہ ہو کہ ان کے ساتھ کون مہمان ہیں کیونکہ ایسے موقعوں پر ذات اور برادری کے لحاظ

سے مختلف گروہوں میں بیٹھتے ہیں۔ چراغاں آگ کی روشنی اور چند نہ ہونے کے برابر لالٹین تھے۔ سلطانہ اور اس کے ساتھیوں نے خوب کھایا اور احتیاط سے پیا اور جب کھانا ختم ہونے کے قریب تھا' سلطانہ اپنے میزبان کو ایک طرف لے گیا۔ اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور معذرت چاہی کہ وہ رقص دیکھنے کے لیے نہیں رک سکتا' اس لیے کہ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کافی دور جانا ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے میزبان سے درخواست کی کہ جشن بدستور جاری رہے۔ سلطانہ کی بات ٹالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ناچ کے وقت گانے کا خاص ساز ڈھول ہوتا ہے اور فریڈی نے اسی ڈھول کی آواز شروع ہونے پر اپنی فورس کو کیمپ کا محاصرہ کرنے کے لیے روانہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس فورس کا ایک حصہ تو فاریسٹ گارڈ کے ساتھ روانہ کیا گیا لیکن تاریک رات ہونے کی وجہ سے محکمہ جنگلات کا یہ شخص راستہ ہی بھول گیا۔ درحقیقت محکمہ جنگلات کا ملازم' جس کو سلطانہ کے ساتھ رہنا ہی تھا' راستہ بھولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی' اس لیے کہ پروگرام میں معمولی سا رد و بدل کر کے سطانہ نے اس جال سے نکلنے کے لیے کافی وقت نکال لیا تھا (قبل اس کے کہ ڈھول کا اشارہ دیا جاتا۔) نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت جملہ فورس نہایت دشوار گزار راستوں' جنگلوں اور رات کی تاریکی سے گزرتی ہوئی کیمپ تک پہنچی تو بے حد خائف طوائفوں' ان سے زیادہ خائف سازندوں اور حیرت زدہ ٹھیکیدار کے مہمانوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔

رام نگر کے جنگلوں سے بچ نکلنے کے بعد سلطانہ پنجاب پہنچا لیکن وہاں چھپنے کے لیے جنگل نہ ہونے کی وجہ سے اس کا قیام بہت تھوڑے عرصے رہا اور اس دوران اس نے تقریباً ایک لاکھ روپے کا سونا اور قیمتی زیورات لوٹے اور یو۔ پی کے گھنے جنگلوں میں واپس آ گیا۔ پنجاب سے واپس ہوتے وقت اس کو گنگا کی نہر عبور کرنی تھی۔ نہر پار کرنے کے لیے چار چار میل کے فاصلے پر پل بنے ہوئے تھے' چونکہ اس کی نقل و حرکت کا برابر علم ہو رہا تھا' اس لیے ان پلوں کو' جن پر سلطانہ کا گروہ نہر پار کر سکتا تھا' بھاری فورس تعینات کر دی گئی تھی۔ ان تمام پلوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے اپنے مخبر کے بتائے ہوئے ایک پل سے' جس پر کوئی فورس تعینات

نہیں تھی' ان لوگوں نے نہر کو عبور کیا۔ راستے میں ایک بڑے گاؤں کے قریب سے گزرے جہاں ایک بینڈ دیسی دھنیں بجا رہا تھا۔ ایک شخص کے اطلاع دینے پر کہ ایک مالدار شخص کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے' سلطانہ نے اس سے گاؤں کا راستہ بتانے کے لیے کہا۔

گاؤں کے ایک کھلے میدان کے درمیان برات اور ایک ہزار مہمان جمع تھے۔ تیز روشنی والے ہنڈوں کی روشنی میں سلطانہ کو دیکھ کر مجمع پر سناٹا چھا گیا' لیکن اس نے سب کو مخاطب کر کے یقین دلایا کہ اگر وہ خاموش بیٹھے رہے تو ان کو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے' پھر اس نے گاؤں کے مکھیا اور دولہا کے باپ کو بلایا اور ان سے کہا کہ چونکہ تحفہ حاصل کرنے کا مناسب موقع ہے' اس لیے مکھیا اپنی نئی خریدی ہوئی بندوق اس کے لیے اور دس ہزار روپیہ اس کے گروہ کے لیے دے۔ بندوق اور روپیہ جلد از جلد اس کو پیش کیا گیا اور سلطانہ مجمع کو شب بخیر کہہ کر گاؤں سے باہر چلا گیا۔ یہ تو دوسرے دن پتہ چلا کہ سلطانہ کا نائب "پہلوان" دلہن کو اغوا کر کے لے گیا۔ سلطانہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ پہلوان کو سخت تنبیہہ کی گئی اور لڑکی کو واپس کر دیا۔ اس حرکت سے جو دلہن کو تکلیف پہنچی تھی' اس کے عوض مناسب تحفہ بھی اس کے ہمراہ معذرت کے ساتھ بھیجا۔

گوالے کے پیر کے شدید زخمی کرنے کے واقعہ کے بعد سلطانہ کچھ عرصے تک ہمارے نواح میں رہا۔ وہ اپنی رہائش بکثرت بدلتا رہا' جس کے نشانات شکار کے دوران اکثر دکھائی دیتے رہے۔ اس لیے مجھ کو برا نگیختہ کرنے والا تجربہ ہوا۔ ایک دن شام کو میں نے دو جنگلوں کے درمیانی راستے میں ایک اچھا تیندوا مارا۔ یہ جگہ میرے گھر سے پانچ میل تھی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کسی مزدور کو لا کر اس کو اٹھوا سکوں۔ چنانچہ میں نے اسی جگہ اس کی کھال اتاری اور گھر روانہ ہوگیا۔ گھر پہنچ کر یاد آیا کہ میں اپنا چاقو وہیں بھول آیا۔ دوسرے دن علی الصبح میں چاقو لینے گیا اور جب اس مقام پر پہنچا جہاں چاقو چھوڑا تھا' مجھ کو گھنے جنگل میں چھوٹے چھوٹے حصوں میں آگ جلتی دکھائی دی جو پگڈنڈی سے کچھ دور تھی۔ سلطانہ کی موجودگی کی اطلاع متواتر آ رہی تھی۔ چنانچہ فوری طور پر میں نے تحقیقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ شبنم کی وجہ سے سوکھے

پتے بھیگ گئے تھے' اس لیے بغیر آہٹ کے ان پر چلنا ممکن تھا۔ جتنی بھی چھپنے کی جگہ مل سکی' میں نے آڑ لے کر آگ کا جائزہ لیا۔ آگ ایک کھوکھلے حصے میں جل رہی تھی اور اس کے اردگرد بیس آدمی بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ ان کے قریب ایک درخت کے سہارے بندوقیں لگی ہوئی تھیں' جن کی نالیں آگ کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ سلطانہ وہاں موجود نہیں تھا حالانکہ میں نے اس وقت تک اس کو دیکھا نہیں تھا' لیکن اس کا حلیہ جو مجھ کو بتایا گیا تھا' وہ ایک دبلا پتلا خوبصورت جوان تھا اور زیادہ تر نیم فوجی خاکی وردی پہنتا تھا۔ بظاہر یہ سلطانہ کے گروہ کا ایک حصہ تھا۔ اب میں کیا کر سکتا تھا' کالا ڈھنگی کا بوڑھا ہیڈ کانسٹیبل اور اسی کی عمر کے دو سپاہی میرے کیا کام آ سکتے تھے۔ سب سے بڑا پولیس فورس کا اجتماع ہلدوانی میں تھا جو پندرہ میل دور تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ دوسرا قدم کیا اٹھاؤں کہ ان اشخاص میں سے ایک نے کہا "اب چلنا چاہیے"۔ اس اندیشے کی وجہ سے کہ اگر میں پیچھے جاتا ہوں تو شاید مجھ کو دیکھ لیں اور اس کے نتائج خطرناک ہوں' جلدی جلدی میں قدم بڑھاتا ان اشخاص اور بندوقوں کے درمیان جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس حرکت سے دائرے میں بیٹھے لوگ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں جس جگہ کھڑا تھا' وہ کچھ اونچا تھا۔ جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلا شخص جو ہوش میں آیا' کہنے لگا "کچھ نہیں"۔ مزید سوالات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ کوئلہ جلانے کا کام کرتے تھے' بریلی سے آئے تھے اور راستہ بھول گئے تھے۔ مڑ کر میں نے درخت سے لگی ہوئی بندوقوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بندوقیں نہیں تھیں بلکہ کلہاڑیاں تھیں جن کے پھل کثیر استعمال سے چمک رہے تھے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میرے پیر شبنم کی وجہ سے بھیگ گئے ہیں اور ٹھنڈے ہیں۔ آگ تاپنے کے لیے میں بھی اس دائرہ میں شامل ہوگیا۔ میں نے خود ان کو اپنے سگریٹ پلائے' تھوڑی دیر باتیں کیں' ان کو راستہ بتایا' اپنا چاقو لیا اور واپس آگیا۔

حالت غور و فکر میں مصنوعی خیالات طرح طرح سے رونما ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیر کے مارے ہوئے سانبر کے برابر میں زمین پر بیٹھا تھا' مجھے محسوس ہوا کہ شیر آ رہا ہے اور نزدیک آ رہا ہے' لیکن فاصلہ اتنا ہی ہے۔ جب قوت برداشت جواب

دے چکی تو بندوق چلانے کی تیاری کر کے جیسے ہی گردن موڑ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک ٹڈا میرے سر کے اوپر درخت کی ایک سوکھی پتی کتر رہا تھا۔ ایک اور مرتبہ سورج ڈھلتے وقت میں شیر کے اپنے مارے ہوئے شکار پر واپس آنے کے انتظار میں بیٹھا کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک بہت بڑا جانور دکھائی دیا اور جیسے ہی میں رائفل سنبھال کر چلانے کو تیار ہوا تو معلوم ہوا کہ میری آنکھوں سے کچھ انچ دور ایک تنکے پر ایک چیونٹی رینگ رہی تھی۔ چونکہ میرے ذہن میں سلطانہ تھا تو آگ کی روشنی میں چمکیلی کلہاڑیاں مجھ کو بندوق کی نالیں دکھائی دیں۔ میں نے ان کی طرف پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا جب تک ان لوگوں نے یقین نہیں دلایا کہ وہ کوئلہ جلانے والے تھے۔

کامیاب منظم جماعت اور بہترین ذرائع نقل و حرکت کی وجہ سے فریڈی نے سلطانہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس دباؤ کو کم کرنے کے لیے ڈکیتوں کے سردار نے جگہ تبدیل کی اور پیلی بھیت کی مشرقی سرحد پر چلا گیا۔ اس دوران اس کے گروہ میں پکڑے جانے یا فرار ہونے کی وجہ سے کافی کمی ہو گئی تھی۔ یہاں وہ چند مہینے رہا اور گورکھپور تک ڈاکہ ڈال کر اپنے سونے کی مقدار میں اضافہ کرتا رہا۔ ہمارے جنگلات میں واپس آنے پر اس کو معلوم ہوا کہ رام پور ریاست کی ایک بے حد مالدار طوائف نے لچور کے مکھیا کے گھر سکونت اختیار کر لی ہے۔ یہ گاؤں ہمارے گاؤں سے سات میل کے فاصلے پر تھا۔

متوقع لوٹ مار کی وجہ سے مکھیا نے تیس اجارہ داروں کی اپنی حفاظت کے لیے ایک ٹولی بنائی۔ یہ لوگ مسلح نہیں تھے۔ جب سلطانہ پہنچا تو قبل اس کے کہ سلطانہ کا گروہ مکان کا محاصرہ کرے' طوائف مع زیورات پیچھے کے دروازے سے نکل کر رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ مکھیا اور اس کے محافظین کو احاطے کے اندر گھیرے میں لے لیا۔ جب ان لوگوں نے طوائف کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو سلطانہ نے حکم دیا کہ ان کو باندھ کر پٹائی کی جائے تاکہ ان کا حافظہ تازہ ہو۔ اس حکم دینے پر ایک اجارہ دار نے سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ اس کا یا اس کے ساتھیوں کا جو چاہے حشر بنایا جائے لیکن سلطانہ کو مکھیا کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں کہ اس کو

باندھ کر پیٹا جائے۔ اس شخص کو خاموش رہنے کی تنبیہہ کی گئی لیکن جیسے ہی ایک ڈاکو رسہ لے کر مکھیا کی طرف بڑھا' وہ شخص قریب سے ایک بانس کھینچ کر ڈکیت کی طرف مارنے بڑھا۔ ایک ڈکیت نے اس کے سینے پر گولی مار دی۔ اس خوف سے کہ گولی چلنے کی آواز سن کر قرب و جوار کے دیہات کے لوگ' جن کے پاس اسلحہ تھا' چوکنے ہو جائیں گے' سلطانہ تیزی سے واپس ہوا اور ساتھ ہی مکھیا کا نیا گھوڑا بھی لے گیا۔

اس بہادر مزارع کے قتل کا حال مجھے دوسرے دن معلوم ہوا۔ میں نے ایک شخص کو لمبور روانہ کیا تاکہ وہ دریافت کر کے آئے کہ مرحوم نے کتنے ورثاء چھوڑے اور ایک کھلا خط قرب و جوار کے دیہات کے تمام مکھیوں کے نام روانہ کیا' یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا وہ مرحوم کی بیوی بچوں کے لیے چندہ دینے پر آمادہ ہیں۔ میری اس تجویز کا ردعمل میری توقعات سے کہیں زیادہ فیاضانہ تھا' کیونکہ غریب عام طور پر زیادہ مخیر ہوتے ہیں۔ لیکن چندہ اکٹھا نہ ہوسکا کیونکہ جس نے اپنی جان اپنے آقا پر قربان کی تھی' وہ بیس سال پہلے نیپال سے آیا تھا اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کے نہ تو بچے تھے اور نہ بیوی۔

اس حادثہ کے بعد' جو ابھی بیان کیا ہے' میرا خیال تھا کہ شاید فریڈی' سلطانہ اور اس کے گروہ کی گرفتاری کے سلسلے میں مجھے مدعو کریں گے۔ یہی ہوا۔ ایک مہینہ بعد میں فریڈی کے ساتھ ہردوار کے صدر کیمپ میں شامل ہوگیا۔ ونڈھم نے اٹھارہ سال مرزا پور میں بحیثیت کلکٹر قیام کے دوران دس کول اور دس بھنیا مرزا پور کے جنگلوں میں رہنے والے قبیلوں میں سے ملازم رکھے تھے جو ان کو شیر کے شکار میں مدد دیتے تھے۔ ان میں سے چار بہترین آدمی جو میرے پرانے دوست تھے' ونڈھم نے فریڈی کی تحویل میں دے دیئے' جو ہردوار میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ فریڈی کا منصوبہ یہ تھا کہ میں اور یہ چار اشخاص سلطانہ کا کھوج لگائیں اور جب اس میں کامیابی ہو جائے تو ان کی فورس کو ایسے مناسب مقام پر لے جاؤں جہاں سے سلطانہ پر حملہ کر سکیں۔ یہ کارروائی رات کو کرنا تھی' لیکن سلطانہ بے چین تھا' غالباً خوف زدہ ہونے کی وجہ سے یا ممکن ہے کہ اس کو فریڈی کے اس منصوبے کی اطلاع پہلے سے مل گئی ہو۔ بہرحال وہ کسی ایک جگہ ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا اور رات کے وقت اپنے گروہ کو

دور دراز مقامات پر لے جاتا تھا۔

موسم بے حد گرم تھا۔ آخرکار بیکاری سے تنگ آکر میرے اور ان چار اشخاص کے درمیان ایک اجلاس ہوا جس کے نتیجے میں رات کے کھانے کے بعد جب فریڈی برآمدے کے ایک ٹھنڈے حصے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے' جہاں کسی اور کا ہماری گفتگو سننے کا امکان نہیں تھا' میں نے یہ تجویز پیش کی کہ فریڈی یہ مشہور کر دیں کہ ونڈھم نے شیر کے شکار کی غرض سے اپنے آدمی واپس بلا لیے ہیں جہاں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ فریڈی ہمارے واسطے ہلدوانی تک کے ٹکٹ خریدیں اور ہم لوگوں کو ہردوار سٹیشن آکر رات کی ٹرین سے روانہ کر دیں۔ جو پہلا سٹیشن آئے' اس پر میں مع اپنی رائفل اور وہ چار اشخاص' جن کو فریڈی نے اسلحہ فراہم کیا تھا' ٹرین سے اتر جائیں گے۔ اس کے بعد ہم آزاد ہوں گے کہ جیسے بھی ممکن ہو سلطانہ کو زندہ یا مردہ لائیں۔

میری اس گفتگو سننے کے بعد فریڈی کافی دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ ان کا وزن بیس سٹون چار پاؤنڈ تھا اور کھانے کے بعد نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ سوئے نہیں تھے کیونکہ اچانک سیدھے ہو کر کہنے لگے "نہیں' میں آپ لوگوں کی زندگی کا ذمہ دار ہوں اور ایسی دیوانی تجویز پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا"۔ ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' اس لیے دوسرے دن صبح میں اور وہ چار اشخاص اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ ایسی تجویز پیش کرنا میری غلطی تھی اور فریڈی کا اس کو رد کرنا حق بجانب تھا' اس لیے کہ میرا یا ان چار اشخاص کا کوئی سرکاری درجہ تو تھا نہیں اور اگر کوئی حادثہ سلطانہ کی گرفتاری کے سلسلے میں پیش آجاتا تو اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ویسے سلطانہ یا ہماری جان کو کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہم سلطانہ کو زندہ نہ پکڑ سکے تو پھر پکڑیں گے ہی نہیں۔ جہاں تک ہماری زندگی کا تعلق تھا' اس کو بچانے کے ہم اہل تھے۔

تین مہینے بعد' جب کہ شدید بارش ہو رہی تھی' فریڈی نے محکمہ جنگلات کے ہربرٹ اور اینڈرسن' ترائی اور بھاکر کے سپرنٹنڈنٹ اور مجھے ہردوار میں ان کے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ فریڈی نے سلطانہ کے مستقل

ٹھکانے کا پتہ چلا لیا ہے جو نجیب آباد کے جنگلوں میں ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس کے کیمپ کا محاصرہ کر لیں تاکہ وہ گھیرے سے نکل بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس مہم میں ہربرٹ ایک مشہور پولو کے کھلاڑی کے سپرد پچاس پولیس کے سوار دیے جانے والے تھے جن کا کام سلطانہ کو فرار ہونے سے روکنا تھا۔ مجھے اور اینڈرسن کو اس علاقے کا محاصرہ کرنے میں فریڈی کی مدد کرنا تھی۔

فریڈی کو اس مدت میں سلطانہ کی ذہانت اور ذرائع مخبری کے بارے میں کوئی شبہات نہیں رہے تھے اور سوائے فریڈی کے دو نائبوں اور ہم تینوں کے کسی کو اس متجوزہ دوش کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ہر شام پولیس فورس کو پوری طرح مسلح کر کے لمبے مارچ کے لیے بھیجا جاتا تھا' اسی طرح ہم چاروں بھی لمبے مارچ کے لیے جاتے اور شام کو ڈاک بنگلے میں واپس آ جاتے' جہاں ہم مقیم تھے۔ مقررہ رات کو بجائے ریل کے پھاٹک سے جانے کے' پولیس کی جماعت ریل کے گودام سے گزر کر ریل بغلی پٹڑی پر کھڑے ڈبوں' جن کے پیچھے بریک کا ڈبہ اور آگے انجن لگا تھا اور ڈبوں کے دروازے کھلے اور سٹیشن سے کچھ آگے کھڑے تھے' بیٹھ گئے۔ ہمارے پہنچنے پر آخری ڈبے کا دروازہ بند کیا جا رہا تھا۔ جیسے ہی ہم گارڈ کے ڈبے میں سوار ہوئے' بغیر سیٹی دیے ٹرین روانہ ہو گئی۔ ہماری اس مہم کو مشکوک نہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی حتیٰ کہ پولیس لائن میں جوانوں کا کھانا معمول کے مطابق بنایا گیا اور ہمارے کھانے کی میز بھی روزمرہ کی طرح لگائی گئی۔ ہم سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹہ بعد روانہ ہوئے تھے۔ رات کے نو بجے ٹرین دو سٹیشنوں کے درمیان جنگل کے بیچ کھڑی ہو گئی۔ ایک ڈبے سے دوسرے ڈبہ کو اطلاع دے کر خاموشی سے جملہ پولیس فورس کو اتار لیا گیا اور ٹرین روانہ ہو گئی۔

فریڈی کے تین سو آدمیوں کی جماعت میں سے پچاس سوار' جو ہربرٹ کے تحت دیے جانے والے تھے' ایک رات پہلے بھیج دیے گئے تھے اور ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ لمبا چکر لگا کر اس جگہ پہنچ جائیں جہاں ان کے گھوڑے ان کے انتظار میں موجود ملیں گے۔ فریڈی کی دو سو پچاس آدمیوں کی جماعت انؓ کے اور اینڈرسن کے ساتھ آگے اور میں ان کے پیچھے منزل کی طرف روانہ ہوئے' جس کا فاصلہ قریب بیس

میل تھا۔ ہربرٹ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانی رسالے میں تھے اور فرانس میں جنگ لڑ چکے تھے۔ دن بھر گھرے بادل چھائے رہے اور جب ہم ٹرین چھوڑ کر پیدل روانہ ہوئے تو موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ پہلے ہمیں شمال کی طرف ایک میل جانا تھا' اس کے بعد مشرق کی جانب دو میل' پھر شمال کی طرف ایک میل' اس کے بعد مغرب کی طرف دو میل اور آخر میں پھر شمال کی طرف۔ مجھے معلوم تھا کہ بار بار سمت بدلنے کا مقصد یہ تھا کہ راستے میں پڑنے والے گاؤں سے بچ کر نکلیں کیونکہ ان میں سلطانہ کے مخبر رہتے تھے۔ اس مہم کو حکمت عملی کے ساتھ کامیاب بنانے کا ثبوت یہ تھا کہ سفر کے دوران ایک بھی آوارہ کتا' جو دنیا کے بہترین رکھوالی کرنے والے ہوتے ہیں' اس جماعت کو دیکھ کر نہیں بھونکا۔ میں گھٹنوں تک بڑی دقت سے بارش' کیچڑ اور دو سو پچاس اشخاص کی جماعت' جو میرے آگے تھی اور چلنے سے گڑھے چھوڑتے جا رہے تھے' ہر دو قدم پر گھٹنوں تک کیچڑ سے نکلتا اور پھسلتا جا رہا تھا۔ کئی میل تک تو ہمیں سر سے اونچی گھاس میں چلنا پڑا۔ چکنی زمین اور اپنی آنکھوں کو اس نوکیلی گھاس سے بچانے کے لیے متواتر ایک ہاتھ استعمال کرنے کی وجہ سے چلنا اور بھی دشوار تھا۔ فریڈی کی بیس سٹون اور چار پاؤنڈ کی توانائی پر میں اکثر تعجب کیا کرتا تھا لیکن اتنا نہیں جتنا اس رات ہوا۔ حالانکہ وہ میرے مقابلے میں پختہ زمین پر چل رہے تھے اور میں دلدل میں' لیکن پھر بھی ان کا وزن مجھ سے نو پاؤنڈ زیادہ تھا اور بغیر کسی جگہ رکے متواتر چلتے رہے۔

ہم رات کے نو بجے روانہ ہوئے تھے۔ دو بجے رات میں نے فریڈی کے پاس یہ دریافت کرنے ایک پیغام بھیجا کہ آیا ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ ایک گھنٹہ پہلے ہم شمال کی طرف روانہ ہوئے تھے لیکن جا مشرق کی طرف رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ کپتان صاحب کہہ رہے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں' پھر دو گھنٹے بعد جب ہم گھنے جنگل' خاردار جھاڑیوں اور اونچی گھاس سے نکل کر جا رہے تھے۔ میں نے فریڈی کے پاس اطلاع بھیجی کہ وہ فورس کو روک دیں' میں ان سے ملنے آ رہا ہوں۔ روانہ ہونے سے قبل جملہ فورس کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی تھی' چنانچہ جب میں فریڈی سے ملنے آگے جا رہا تھا تو لوگ خاموش تھے

اور یا تو وہ بھیگی زمین پر بیٹھے تھے یا درختوں پر ہاتھ ٹکائے جھکے کھڑے تھے۔

فریڈی' اینڈرسن اور ان کے چار رہنما آگے کھڑے تھے۔ فریڈی نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی غلطی ہو گئی۔ میں نے جواب دیا کہ ملازمین تو ٹھیک ہیں لیکن باقی ہر چیز غلط ہے کیونکہ ہم اتنی دیر سے ایک دائرہ میں گھوم رہے ہیں۔ عمر کا اتنا حصہ جنگلوں میں گزارنے کے بعد جہاں گم ہو جانا آسان ہے' میں نے قوت سمت شناسی پیدا کر لی ہے جو دن اور رات میں یکساں کام کرتی ہے۔ ہماری سمت بدلنے کا احساس جب ہم روانہ ہوئے تھے' مجھ پر اتنا ہی عیاں تھا جتنا دو گھنٹے بعد جب ہم نے شمال سے مشرق کی جانب چلنا شروع کیا۔ علاوہ اس کے ایک گھنٹہ پہلے مجھے ایک سیمل کے درخت کے نزدیک سے گزرنا یاد تھا جس پر چیل کا ایک گھونسلا تھا اور جب دوسری مرتبہ میں نے فریڈی کے پاس فورس رکوانے کے لیے آدمی بھیجا تھا' اس وقت پھر ہم اسی درخت کے نیچے کھڑے تھے۔

ان چار رہنماؤں میں سے دو بھانتو تھے' جن کا تعلق سلطانہ کے گروہ سے تھا اور اور چند دن پہلے ہردوار کے بازار میں ماخوذ کیے گئے تھے اور انہی کی نشاندہی پر اس دوش کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ اشخاص کم و بیش دو سال سلطانہ کے ساتھ شامل رہے تھے اور اس رات کے کارنامے پر ان کو معاف کر دینے کا یقین دلایا گیا تھا' بقیہ دو گڈریے تھے جن کی ساری عمر اسی جنگل میں مویشی چراتے گزر گئی تھی اور سلطانہ کے لیے دودھ فراہم کرتے تھے۔ ان چاروں اشخاص نے راستہ بھٹک جانے سے انکار کیا اور زیادہ دباؤ ڈالنے پر کہنے لگے کہ اگر ہم کو پہاڑ دکھائی دے جائیں تو پولیس کی جماعت کو زیادہ بہتر طریقے پر رہنمائی کر سکتے ہیں۔ پہاڑوں کا دکھائی دینا جو اندازاً تیس میل دور تھے' تاریک رات تھی اور کہر درختوں پر چھایا ہوا تھا' ناممکن تھا چنانچہ جائزہ لینے کا یہ پہلا موقع تھا جو فریڈی کی کوششوں پر پانی پھیرے جا رہا تھا اور اس کا بدترین پہلو سلطانہ کو ہمارے اوپر ہنسنے کا موقع دینا تھا۔

ہمارا مقصد تو سلطانہ کے کیمپ پر اچانک حملہ کرنا تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ طلوع آفتاب سے پہلے اتنے قریب پہنچ جائیں کہ حملہ آسانی سے کر سکیں اور اندھیرا بھی ہو۔ رہنماؤں نے ہمیں بتایا تھا کہ سلطانہ کے

ٹھکانے پر دن میں پہنچنا ممکن نہیں تھا کیونکہ جس سمت سے ہم حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے' وہاں اونچے درخت پر بنے ہوئے مچان سے گروہ کے دو اشخاص ایک وسیع علاقے کی متواتر دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔

ہمارے رہنماؤں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ راستہ بھول گئے تھے۔ اندھیرا چھٹنے کو صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم سلطانہ کے ٹھکانے سے کتنے فاصلے پر تھے اور وہ کس سمت ہوگا۔ ہر منٹ جو گزر رہا تھا' اچانک حملے کے امکانات ختم ہوتے جا رہے تھے۔ اس پس و پیش کی حالت میں ایک کامیابی کی صورت میرے ذہن میں آئی۔ میں نے ان چار اشخاص میں سے دریافت کیا کہ آیا ان کے ذہن میں جس مقام سے ہم روانہ ہوئے' کوئی ایسا مویشیوں کا جانا پہچانا راستہ یا چشمہ ہے جہاں سے وہ صحیح راستے کا تعین کر سکیں۔ ان کے یہ کہنے پر کہ کیمپ سے ایک میل دور جنوب میں ایک بیل گاڑی کا راستہ ہے' میں نے فریڈی سے آگے چلنے کی اجازت چاہی۔ میں کافی تیز چلا اور مجھے یقین ہے کہ جملہ فورس جو میرے پیچھے تھے' ان کو صحیح اندازہ ہوگا کہ جس سمت میں جا رہا تھا' وہ اسی ریلوے لائن پر پہنچ جائے گی جہاں سے ہم سات گھنٹے پہلے روانہ ہوئے تھے۔

بارش تھم گئی تھی۔ تازہ ہوا کی وجہ سے بادل چھٹ گئے تھے اور مشرق میں سورج کی روشنی نمودار ہونا شروع ہوئی تھی کہ اچانک میرا پیر بیل گاڑی کے راستے پر پڑ کر لڑکھڑا گیا۔ یہی وہ غیر استعمال شدہ بیل گاڑی کا راستہ تھا جس کا تذکرہ ان چار اشخاص نے کیا تھا اور اس کو دیکھ کر جو ان کے چہروں پر خوشی نمایاں ہوئی' اس نے میری اس بات کی تصدیق کی کہ ان کا راستے سے بھٹک جانا قصداً نہ تھا۔ ان اشخاص نے پھر رہنمائی شروع کی۔ ایک میل تک تو بیل گاڑی کے راستے چلتے رہے' پھر ایک مقام آیا جہاں اس راستے کو جنگل سے آنے والا ایک راستہ کاٹتا تھا۔ آدھ میل اس راستے پر چل کر ایک گہرا لیکن کم رفتار چشمہ آیا جس کی چوڑائی قریب تیس فٹ ہوگی۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ جنگل کا راستہ اس کو نہیں کاٹ رہا تھا کیونکہ میں ترائی کے چشموں سے بے حد خائف ہوں۔ ان کے کناروں اور ان کی گہرائیوں میں اکثر بڑے بڑے اژدہے میں نے دیکھے ہیں۔ راستہ چشمے کے داہنے کنارے پر چلتا رہا۔

پولیس کے جوان سر سے اونچی گھاس میں چند سو گز چلنے کے بعد ست پڑ گئے۔ جس انداز سے وہ بائیں طرف دیکھتے جا رہے تھے' میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مچان ان کو دکھائی دینے لگا ہے کیونکہ اب دن نکل آیا تھا اور سورج کی شعاعیں درختوں کے اوپری حصے پر پڑ رہی تھیں۔ ان میں جو شخص سب سے آگے تھا' وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ بقیہ ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا اور ہم کو ہاتھ کے اشارے سے آگے آنے کے لیے کہا۔

پولیس کی جماعت کو رکنے اور بیٹھنے کا اشارہ دے کر فریڈی' میں اور اینڈرسن گھسٹتے ہوئے سب سے آگے والے شخص کے پاس پہنچے۔ اس کے برابر لیٹ کر گھاس کے درمیان سے اس کے اشارے کی جانب ہمیں ایک مچان نظر آیا جو ایک بڑے درخت کے سرے پر زمین سے کوئی چالیس فٹ اونچا بنا ہوا تھا۔ دو آدمی' جن پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں' اس پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک حقہ پی رہا تھا' جس کا داہنا کندھا ہماری طرف تھا اور دوسرا کمر کے بل پیر پر پیر رکھے لیٹا تھا۔ درخت جس پر مچان بنا تھا' گھاس اور جنگل کے کنارے تھا اور ایک وسیع میدان کو یہ اشخاص حد نظر تک دیکھ سکتے تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ سلطانہ کا ٹھکانہ اس درخت سے تین سو گز گھنے جنگل کے اندر ہے۔

جہاں ہم لیٹے تھے' وہاں سے چند فٹ کے فاصلے پر بیس گز چوڑی ہری گھاس کی ایک پٹی تھی' جو ہمارے داہنے ہاتھ پر چشمے سے شروع ہو کر کافی دور تک کھلے میدان تک چلی گئی تھی۔ بظاہر یہ مناسب ہوتا کہ پہلے ہم پیچھے ہٹتے' چشمے کو عبور کرتے اور دوبارہ سلطانہ کے ٹھکانے کے قریب جا کر پھر اس کو پار کرتے' لیکن رہنماؤں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا' اس لیے کہ اول تو چشمہ کافی گہرا ہے' دوسرے یہ کہ چشمے کے اس پار دلدل ہے۔ صرف ایک ہی غیر یقینی طریقہ رہ گیا تھا' وہ یہ کہ پوری فورس کو نہایت احتیاط سے اس گھاس کی پٹی سے گزاریں تاکہ مچان پر بیٹھے گروہ کے ان دو اشخاص کی نظر سے محفوظ رہیں کیونکہ ان میں سے کوئی ایک کسی وقت گھوم کر ہماری طرف دیکھ سکتا تھا۔

فریڈی کے پاس سرکاری ریوالور تھا' اینڈرسن نہتا تھے اور پوری فورس میں صرف میرے پاس رائفل تھی۔ پولیس فورس کے پاس ہاتھ سے بھرنے والی بارہ بور کی

بندوقیں تھیں، جن میں ہرن مارنے کے چھرے کے کارتوس استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کی موثر مار ساٹھ سے لے کر اسی گز تھی۔ میں اس جماعت میں واحد شخص تھا جو اس مقام سے مچان پر بیٹھے اشخاص سے نمٹ سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ رائفل چلنے کی آواز سلطانہ کے ٹھکانے تک سنائی دیتی، لیکن ہمارے ساتھ جو دو بھانتو تھے، ان کی یہ رائے تھی کہ اگر یہ دو اشخاص سلطانہ کے ٹھکانے پر نہ پہنچ پائے تو سلطانہ دوسرے آدمی بھیج کر وجہ معلوم کرائے گا۔ جس دوران یہ کارروائی ہو رہی ہوگی، اس وقت سلطانہ کے ٹھکانے کا محاصرہ کرنے کا بہترین موقع ہوگا۔

مچان پر جو دو اشخاص موجود تھے، وہ دونوں قاتل اور مجرمان اشتہاری تھے۔ میں اپنی رائفل سے ایک کے ہاتھ سے حقہ اور دوسرے لیٹے ہوئے شخص کے جوتے کی ایڑی بغیر ان کو جسمانی نقصان پہنچائے اڑا سکتا تھا، لیکن ایسے موسم میں ان پر گولی چلانا میرے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ میں نے فریڈی سے کہا کہ مجھے تو ان لوگوں کی گھات میں جانے کی اجازت دی جائے جو بہت آسان تھی۔ اس لیے کہ لمبی گھاس اور گھنے درختوں کا جنگل جو مچان والے درخت تک پھیلا تھا اور تمام رات بارش ہونے کی وجہ سے شرابور تھے، میں مع ان دونوں اشخاص کے مچان پر قابض ہو سکتا تھا، اسی دوران فریڈی مع اپنی جماعت کے اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ پہلے تو فریڈی نے اس تجویز پر پس و پیش کیا، اس لیے کہ دونوں ڈکیت مسلح تھے اور ہاتھ بڑھا کر اپنی بندوقیں اٹھا سکتے تھے، لیکن بعد میں اجازت دے دی۔ میں بغیر کسی تاخیر کے روانہ ہوگیا، اس لیے کہ بھانتوؤں نے کہا کہ ان ڈاکوؤں کی ڈیوٹی تبدیل ہونے کا وقت قریب تھا۔

میں نے اندازاً ایک تہائی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اپنے پیچھے آہٹ سنی اور دیکھا کہ اینڈرسن تیزی سے میری طرف آ رہے ہیں۔ فریڈی نے اینڈرسن سے کیا بات کی اور اینڈرسن نے فریڈی سے کیا کہا، مجھے علم نہیں۔ یہ دونوں میرے بہت اچھے دوست تھے۔ اینڈرسن نے میرے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ یہ تو اینڈرسن نے تسلیم کیا کہ وہ بغیر کسی آہٹ کے جنگل میں نہیں چل سکتا تھا اور اس وجہ سے ڈکیتوں کا ہمارے آنے کی آواز سننے کے امکانات تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دو اشخاص جو مچان پر بیٹھے ڈکیتوں کی

ڈیوٹی بدلنے آ رہے تھے' ان سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ درخت کے نیچے بھی مزید گارڈ موجود ہوں۔ باوجود اس کے کہ اینڈرسن مسلح نہیں تھے اور غیر محفوظ تھے' پھر بھی کسی حالت میں مجھ کو اکیلا جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ جب انسان کسی بات کا تہیہ کر لیتا ہے تو خچر سے زیادہ ضدی ہو جاتا ہے۔ بے حد مایوسی کے عالم میں' میں نے فریڈی کی جانب واپس ہونا شروع کیا تاکہ ان کی مدد حاصل کر سکوں' لیکن (بعد میں معلوم ہوا کہ فریڈی کو اینڈرسن کے بھیجنے کی غلطی کا احساس ہو چکا تھا' اس لیے کہ بھانتوؤں نے ان کو بتا دیا تھا کہ ڈکیتوں کا نشانہ بہت اچھا تھا۔) جیسے ہی فریڈی نے ہمیں واپس آتے دیکھا' فورس کو ہاتھ کے اشارے سے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

پچاس سے زیادہ فورس کے آدمیوں نے میدان کا کھلا حصہ پار کر لیا تھا اور ہم جو سب سے آگے تھے' مچان سے قریب دو سو گز رہ گئے تھے کہ اچانک ایک پرجوش سپاہی نے مچان دیکھ کر اس پر اپنی بندوق چلا دی۔ بندوق کا چلنا تھا کہ بجلی کی طرح دونوں ڈکیت مچان سے اترے اور نیچے بندھے گھوڑوں پر سوار ہو کر سلطانہ کے کیمپ روانہ ہو گئے۔ اب خاموش رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فریڈی نے بہ آواز بلند' جو لاؤڈ سپیکر کی آواز سے کم نہ تھی' فورس کو سلطانہ کے کیمپ پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا' لیکن جب تک ہم وہاں پہنچے' کیمپ ویران ہو چکا تھا۔

سلطانہ کا ٹھکانہ ایک چھوٹے ٹیلے پر تھا' جس پر تین خیمے اور گھاس کی ایک جھونپڑی تھی' جو باورچی خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ایک خیمہ میں جنس رکھتے تھے' جس میں آٹا' دال' شکر' چاول کی بوریاں اور گھی کے کنستر بھرے تھے اور ایک طرف ہزاروں بارہ بور کے کارتوسوں کے بکسوں کے ڈھیر اور خیمہ کے سہارے خول کے اندر گیارہ بندوقیں لگی تھیں۔ باقی دو خیمے سونے کے استعمال میں لاتے تھے' جس میں کمبلوں اور کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ باورچی خانے کے نزدیک شاخوں پر تین صاف کیے ہوئے بکرے لٹکے تھے۔

اطلاع دینے ان دو ڈکیتوں کے کیمپ آنے پر افراتفری کے عالم میں یہ ممکن تھا کہ گروہ کے چند افراد نیم برہنہ حالت میں خیموں کے گرد لمبی گھاس میں پناہ لینے بیٹھ

گئے ہوں' چنانچہ اپنے آدمیوں کی لمبی لائن بنا کر ان کو حکم دیا گیا کہ جس طرف ہربرٹ اپنے پچاس سواروں کے ہمراہ ڈکیتوں کو فرار ہونے سے روکنے کے لیے موجود تھے' درمیانی حصے کی اچھی طرح تلاشی لی جائے۔ جس وقت لائن بنانے کا کام جاری تھا' میں نے ٹیلے کا جائزہ لیا۔ مجھے دس یا بارہ ننگے پیر اشخاص کے نشانات نزدیک نالے پر دکھائی دیے۔ میں نے فریڈی کو رائے دی کہ ان نشانات کا کھوج لگایا جائے کہ کہاں تک جاتے ہیں۔ نالہ پندرہ فٹ چوڑا اور پانچ فٹ گہرا تھا۔ میں' فریڈی اور اینڈرسن اس نالے کے برابر دو سو گز گئے ہوں گے کہ ایک بجری کا ٹکڑا ملا' جس میں پیروں کے نشانات غائب ہوگئے۔ اس ٹکڑے کے آگے چل کر نالہ چوڑا ہوگیا اور اس کے بائیں کنارے پر' جہاں ہم کھڑے تھے' ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا' جس کی موٹی جڑیں زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔ بیشمار جڑوں کے علاوہ موٹی شاخیں بھی زمین تک لٹکی تھیں اور میرے نزدیک چھپنے کی نہایت مناسب جگہ ہوسکتی تھی۔ چنانچہ نالے کے کنارے پر جا کر' جس کی اونچائی میری ٹھوڑی تک تھی' میں نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ ہاتھ جمانے کے لیے کنارے پر کوئی مناسب جگہ نہیں تھی' اس لیے ہر مرتبہ نالے کی دیوار پر پیر جمانے کے لیے پیر سے گڑھا بناتا تو کچی مٹی ہونے کی وجہ سے دیوار ٹوٹ جاتی تھی۔ میں آگے جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا' جہاں نالہ چوڑا ہو کر زمین کی سطح سے ملتا تھا کہ اچانک سلطانہ کے کیمپ کی جانب سے بندوقیں چلنے کی بوچھاڑ اور شور سنائی دیا۔ ہم جس طرف سے نالے میں آئے تھے' تیزی سے واپس ہوئے اور کیمپ کے نزدیک پہنچ کر دیکھا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل کے سینے پر گولی لگی تھی اور اسی کے نزدیک ایک ڈکیت لنگی باندھے پڑا تھا' جس کے دونوں پیر گولیوں نے زخمی تھے۔ حوالدار ایک درخت کے تنے سے کمر لگائے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی قمیص کے بٹن کھلے تھے اور بائیں سینے کے سرپستان پر خون کی ایک بوند تھی۔ فریڈی نے فوراً پانی کی بوتل اس کے منہ پر لگائی لیکن حوالدار نے یہ کہتے ہوئے اس کو ہٹا دیا کہ وہ شراب ہے' میں اس کو نہیں پی سکتا۔ جب اصرار کیا گیا تو وہ کہنے لگا کہ تمام عمر میں نے اس چیز سے پرہیز کیا' اب میں اپنے خدا کے حضور اپنے ہونٹوں پر شراب لگا کر نہیں جا سکتا۔ مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی ہے اور پانی چاہیے۔ اس کا بھائی اس کے نزدیک کھڑا تھا۔

کسی نے اس کو ہیلمٹ دی اور وہ بھاگتا ہوا اس چشمے پر گیا جس کی وجہ سے ہمارے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوئی تھی۔ اس میں سے گدلا پانی بھر کر لایا جو مجروح حوالدار نے پیا۔ اس کے سینے پر ایک چھرا لگا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو کھال کے نیچے اس کی موجودگی کا پتہ نہ چلا۔ میں نے کہا "حوالدار صاحب! دل مضبوط رکھیں' نجیب آباد کا ڈاکٹر آپ کو ٹھیک کر دے گا"۔ میری طرف مسکراتے ہوئے کہنے لگا "صاحب! میں تو دل مضبوط رکھوں گا لیکن کوئی ڈاکٹر مجھ کو بچا نہیں سکتا"۔ ڈکیت کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اور اس نے بوتل خالی کر دی۔ اس کے بہت قریب سے بارہ نمبر کی بندوق کے چھرے لگے تھے۔

سلطانہ کے کیمپ سے بانس اور دری وغیرہ قسم کی چیزیں فراہم کر کے دو اسٹریچر بنائے گئے اور مجروحین کو ان پر لٹایا گیا۔ ان کو لے جانے کے لیے لوگوں نے بلا لحاظ اس کے کہ ان میں سے ایک نیچ ذات کا ڈکیت اور دوسرا اعلیٰ نسب پولیس کا افسر تھا' اپنی خدمات پیش کیں اور روانہ ہوگئے۔ دونوں اسٹریچرز کے ساتھ زائد اشخاص بھی بھاگتے ہوئے جا رہے تھے جو وقفے وقفے سے اسٹریچر لے جانے والوں کو تبدیل کرتے جاتے۔ جنگلوں میں ہوتے ہوئے نجیب آباد لے جانا تھا' جس کا فاصلہ بارہ میل تھا۔ ڈکیت تو کثرت سے خون نکل جانے کی وجہ سے راستے ہی میں ختم ہوگیا اور حوالدار ہسپتال داخل ہونے کے چند منٹ بعد انتقال کر گیا۔

دوش ملتوی کی گئی۔ ہربرٹ کوئی نمایاں کام انجام نہیں دے سکے۔ ان کی موجودگی کی ڈکیتوں کو اطلاع ہوگئی تھی' اس لیے بھاگتے وقت ان کی طرف گئے ہی نہیں۔

احتیاط سے ترتیب دی ہوئی اس دوش کا خلاصہ یہ ہوا کہ جس کی ناکامیابی کا کوئی خاص شخص مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ سلطانہ اپنا کل اثاثہ ماسوائے چند بندوقوں کے اور دو مردہ اشخاص پیچھے چھوڑ گیا۔ ان میں سے ایک شخص نے تو قید سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور اپنے لواحقین کو نجیب آباد کے قلعہ میں روتا چھوڑ گیا اور دوسرا شخص وہ حوالدار تھا' جو ہر دلعزیز تھا' سب کی نظروں میں اس کی عزت تھی اور اس کی بیوہ کی مناسب طریقے پر دیکھ بھال کی جائے گی۔ اس نے اپنے ایمان کو مضبوطی سے تھامے رکھا کیونکہ اگر وہ

شراب کے دو گھونٹ پی لیتا تو آپریشن کے وقت تک زندہ رہ سکتا تھا۔

تین دن کے بعد فریڈی کو سلطانہ کا بھیجا ہوا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اسلحہ کی کمی کی وجہ سے فریڈی کو اس دوش کی ضرورت پیش آئی تھی۔ آئندہ سے اگر ایسی مجبوری ہو تو فریڈی اس کو بتا دیں اور وہ بخوشی ان کی مدد کرے گا۔

سلطانہ کو اسلحہ کی فراہمی فریڈی کی دکھتی رگ تھی۔ باوجود اس کے کہ سخت احکامات اس سلسلے میں جاری کر دیے گئے تھے' لیکن تمام لائسنس یافتہ اشخاص' جن کے پاس اسلحہ تھا اور جن علاقوں میں سلطانہ گھومتا تھا' ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ حکومت کے احکامات کو نظرانداز کریں' بجائے اس کے کہ سلطانہ کو ناخوش کر کے اپنی شامت بلائیں اور قتل و لوٹ مار کا سامنا کرنا پڑے' اس لیے اسلحہ کی پیشکش بے معنی نہیں تھی اور سپیشل ڈکیتی پولیس کے سربراہ کے اوپر اس سے زیادہ ضرب کیا ہو سکتی تھی۔

سلطانہ کے چھپنے کی جگہ ختم ہونے کے بعد وہ دیوانوں کی طرح ترائی اور بھابر کے حدود میں چکر لگاتا رہا اور اس کے گروہ کی تعداد بھی صرف چالیس رہ گئی۔ سب مسلح تھے' اس لیے کہ اس وقفے میں سلطانہ نے چھوڑے ہوئے ہتھیار اور کارتوسوں کی تعداد پوری کر لی تھی۔ فریڈی نے سوچا کہ اب سلطانہ کا خود کو حوالے کر دینے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ فریڈی نے گورنمنٹ سے اجازت مانگی کہ ان کو سلطانہ سے دوبدو گفتگو کرنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت اس شرط پر ملی کہ نتائج کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ چنانچہ سلطانہ کو مدعو کیا گیا اور اس سے کہلوایا کہ جب اور جہاں اس کی طبیعت چاہے' فریڈی ملنے کو تیار ہیں۔ سلطانہ نے دعوت قبول کرتے ہوئے جگہ' تاریخ اور وقت مقرر کیا اور شرط یہ تھی کہ فریڈی اور سلطانہ دونوں تنہا اور نہتے ہوں گے۔ مقررہ دن ایک کھلے میدان میں ایک طرف سے فریڈی اور دوسری طرف سے سلطانہ برآمد ہوئے۔ میدان کے درمیان میں صرف ایک درخت تھا' جہاں ان دونوں کی دوستانہ ماحول میں ملاقات ہوئی جس کی مشرق کے رہنے والوں کو امید ہو سکتی تھی۔ دونوں درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ فریڈی کو تو حکومت کی مدد' خوش مزاجی اور توانائی حاصل تھی اور سلطانہ کے پاس چستی اور اپنے مارے جانے کا انعام۔ سلطانہ نے

دستور کے مطابق ایک تربوز پیش کیا جس کو بخوشی قبول کرتے ہوئے بلا تامل، ساتھ بیٹھ کر کھانے کے لیے آمادہ ہو گئے' لیکن یہ مجلس ناکام رہی' اس لیے کہ سلطانہ نے فریڈی کی خود کو غیر مشروط طریقے سے حاضر کر دینے کی تجویز رد کر دی۔ یہ موقع تھا جب کہ سلطانہ نے فریڈی کو بلاوجہ خطرہ مول نہ لینے کی رائے دی۔ اس نے کہا کہ جس روز دوش دی گئی' سلطانہ مع اپنے دس ساتھیوں کے' جو پوری طرح مسلح تھے' برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا فریڈی اور دو اور انگریزوں کو نالے کے اندر سے درخت کی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ صاحب جو نالے کے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا' کامیاب ہو جاتا تو آپ تینوں کو جان سے مارنا ضروری ہو جاتا۔

اب ہلکے اور بھاری پہلوانوں کی آخری کشتی کا مظاہرہ ہونا تھا' جس کو دیکھنے کے لیے فریڈی نے مجھے اور ویڈھم کو شامل ہونے کے لیے ہردوار آنے کی دعوت دی۔ سلطانہ اور اس کے بیزار اور تھکے گروہ کے ساتھیوں نے اب نجیب آباد کے جنگلوں کے درمیان ایک مویشیوں کے باڑے میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اور فریڈی کا منصوبہ یہ تھا کہ پولیس فورس کو دریائے گنگا میں کشتیوں کے ذریعہ کسی مناسب مقام تک لے جا کر مویشیوں کے باڑے کا محاصرہ کر لیا جائے۔ یہ کارروائی پچھلی مرتبہ کی طرح رات کے وقت ہونی تھی لیکن اس مرتبہ پورا چاند نکلنے پر۔

معینہ دن جملہ فورس مع میرے' فریڈی اور فریڈی کے چچازاد بھائی کے' دس کشتیوں میں سوار ہوئے اور اس تنہا مقام سے گنگا کے داہنے کنارے ہردوار سے چند میل دور تک چلتے رہے۔ میں سب سے اگلی کشتی میں تھا۔ جب تک ہم داہنے کنارے سے بائیں کنارے پر آ کر ایک نالے میں داخل ہوئے' سب خیریت رہی۔ اس نالے سے گزرنے کا میری زندگی میں سب سے زیادہ ہیبت ناک اور تلخ تجربہ ہوا۔ چند سو گز تک تو کشتیاں پانی کی نہایت ہموار اور چاند کی روشنی میں چمکتی ہوئی سطح پر چلتی رہیں' جس پر نہ تو کوئی لہر تھی اور نہ درختوں کا عکس' جس سے نگاہ مبذول ہوتی۔ رفتہ رفتہ یہ نالا پتلا ہوتا گیا اور کشتی کی رفتار تیز ہوتی گئی اور ساتھ ہی ہمیں دور سے تیز بہاؤ والے پانی کی آواز سنائی دی۔ میں نے اکثر گنگا کے نالوں میں مچھلی کا شکار کھیلا ہے' جہاں یہ اصل دریا کے بہاؤ سے ملتے ہیں اور مچھلیاں ان نالوں میں آ جاتی ہیں۔

میں ان کشتیوں کے ملاحوں کی جرات پر حیران تھا' جو اپنی زندگی اور اپنی کشتیوں کو طغیانی والے پانی میں ڈالنے کے لیے تیزی سے قریب پہنچ رہے تھے۔ میری کشتی منجملہ اور نو کشتیوں کے کھلی' سامان لے جانے والی تھی' جو گنگا کے کھلے پانی میں استعمال کے لیے مناسب تھی۔ لیکن یہاں تو نہایت تنگ اور تند نالے میں سے گزر رہے تھے جہاں ان بے ڈول کشتیوں کا سنبھالنا سخت دشوار تھا اور جن کے زیر آب بھاری پتھروں سے پیندے ٹکرانے سے نہ صرف بھیانک آواز آتی تھی' بلکہ ہر مرتبہ ان کے پاش پاش ہو جانے کا احتمال ہوتا تھا۔ کشتیوں کے مالک چپو چلانے والوں کو متواتر یہ ہدایت دے رہے تھے کہ کشتیوں کو نالے کے پتھریلے کنارے سے بچا کر درمیان میں رکھنے کی کوشش کریں ورنہ غرق ہو جائیں گی۔ یہ کہنے سے میری پریشانی میں کوئی کمی نہیں ہوئی' اس لیے کہ کشتیاں رفتہ رفتہ ایک طرف بہاؤ کے ساتھ جا رہی تھیں اور پتھروں سے ٹکرا کر غرق ہو جانے کا کسی وقت بھی امکان تھا' لیکن بدخوابی ہمیشہ قائم نہیں رہتی' حالانکہ اس دن والی کافی دیر رہی کیونکہ ہمیں بیس میل جانا تھا اور بے حد خطرناک پانی میں ہو کر۔ اس پریشانی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ملاحوں میں سے ایک شخص ایک لمبا رسہ لے کر کنارے پر کودا اور اس کو ایک درخت کے تنے سے باندھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کشتیاں ہمارے برابر سے گزرتی رہیں اور اس طرح درخت کے تنوں سے ان کو باندھا گیا۔ اس طرح دس کشتیاں بخیریت منزل پر پہنچیں۔

پولیس کی جماعت کو ایک ریتیلے ساحل پر اتارا گیا اور کشتیوں کے پتھروں سے ٹکرانے سے جھٹکے لگنے لگے اور کشتیوں سے رگڑ لگنے کی وجہ سے جو ملازمین زخمی ہوئے' ان کی مرہم پٹی کرنے کے بعد کشتی بانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ دریا کے بہاؤ پر پانچ میل جانے کے بعد مزید احکامات کا انتظار کریں۔ ہم ایک قطار میں بدترین اونچی اور نوکیلی گھاس میں آدھ میل چلتے رہے۔ گھاس دس یا بارہ فٹ اونچی تھی اور شبنم اور کہر کی وجہ سے جھکی ہوئی تھی۔ جب تک اس سے باہر نکلے' سر سے پیر تک شرابور تھے۔ آخرکار جب ہم دور پہنچے تو وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے پانی کا سامنا کرنا پڑا' جس کو ہم گنگا کا پرانا ساحل سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ داہنے اور بائیں طرف نزدیک تر راستہ

معلوم کرنے کے لیے ٹولیاں بھیجی گئیں۔ داہنے سمت جانے والی ٹولی پہلے واپس آئی اور بتایا کہ ہم جس مقام پر کھڑے تھے' اس سے پون میل دور یہ جھیل پتلی ہو گئی ہے اور جس نالے سے ہم آئے تھے' وہاں پہنچ کر پانی بہت تیز بہہ رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد دوسری ٹولی واپس آئی اور بتایا کہ خلیج کے اوپری حصے میں تند دریا بہہ رہا ہے اور راستہ نایاب ہے۔ یہ بات اب صاف ظاہر تھی کہ کشتی بانوں نے دانستہ یا نادانستہ ہم کو ایک جزیرے میں پھنسا دیا تھا۔

کشتیوں کے جانے کے بعد' جبکہ دن نکلنے میں تھوڑی سی دیر باقی رہ گئی تھی' یہ ضروری تھا کہ کوئی تدبیر کی جائے۔ چنانچہ ہم پانی کے پھیلاؤ کے وسیع تر حصے کی طرف یہ معلوم کرنے روانہ ہوئے کہ جہاں دو نالے اور یہ پانی ملتا تھا کوئی ایسی جگہ ہو سکتی تھی جہاں سے ہم اس کو عبور کر سکیں۔ جہاں پانی کا بہاؤ تنگ ہوتا تھا اور چشمے کا پانی بہاؤ کی طرف کھنچتا تھا' اس جگہ سے عبور کرنا ممکن تھا۔ اس کے آگے چل کر پانی بیس فٹ گہرا ہو جاتا تھا اور اس کے نیچے سیلابی کیفیت تھی' جبکہ ہم میں سے بیشتر تند پانی کے بہاؤ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کس مقام سے دریا پار کر سکتے ہیں۔ وینڈھم اپنے کپڑے اتارنے میں مصروف تھے۔ جب میں نے ان کو سمجھایا کہ ایسا کرنا بیکار ہے' اس لیے کہ وہ سر سے پیر تک بھیگے ہوئے ہیں' تو وینڈھم کہنے لگے کہ ان کو کپڑوں سے زیادہ جان عزیز ہے۔ جب وہ برہنہ ہو گئے تو کل کپڑے اپنی قمیص میں باندھے۔ اور اس گٹھریا کو اپنے سر پر رکھ کر ایک جوان سپاہی کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے کہ میرے ساتھ چلو۔ وہ جوان ایسا حیران ہوا کہ پوری جماعت میں سے کمشنر صاحب نے صرف اس کو اپنے ساتھ ڈوبنے کا شرف بخشا۔ وہ بیچارا بغیر کچھ کہے بغلگیر ہو کر کمشنر کے ساتھ پانی میں داخل ہو گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ جس وقت وہ دریا پار کر رہے تھے ہم میں سے کسی نے سانس بھی لی ہو۔ کبھی پانی ان کی کمر تک اور کبھی بغل تک پہنچتا اور کہیں یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی بغیر پیر اکھڑے اور بہہ کر نیچے سیلاب اور بھنور والے پانی میں گرنے سے بچ سکیں گے جہاں بہترین تیراک کے بھی پیر نہیں جم سکتے تھے۔ نہایت محتاط طریقے پر یہ دونوں بہادر' جن میں سے ایک پوری جماعت میں سب سے

زیادہ کم عمر تھا اور دوسرا سب سے زیادہ سن رسیدہ' موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جب دوسرے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو جملہ فورس کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اگر یہ کارنامہ ہردوار میں انجام دیتے جہاں بولنے یا شور کرنے پر پابندی نہ ہوتی تو یقیناً باآواز بلند خراج تحسین پیش کرتے۔ جہاں سے دو اشخاص گزر سکتے تھے وہاں سے تین سو بھی جا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر ایک لائن بنائی گئی اور اگر بہاؤ کی وجہ سے کسی کا پیر پھسلتا تو پوری لائن اس کو سنبھال لیتی۔ اس طرح جملہ فورس دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس مقام پر فریڈی کے ایک نہایت معتبر مخبر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے نکلتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بہت دیر ہوگئی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اتنی بڑی جماعت کھلے حصے اور جنگل کے درمیان جاتے ہوئے بچ سکے۔ اس کا واحد تدارک یہ تھا کہ جزیرے پر واپس جائیں۔ چنانچہ ہم واپس ہوئے لیکن اس مرتبہ یہ کام اتنا مشکل نہ تھا جتنا کہ آتے وقت۔

دوبارہ اسی لمبی اور نوکیلی گھاس میں واپس پہنچ گئے۔ سب سے پہلا مسئلہ کپڑوں کا سکھانا تھا۔ چونکہ دھوپ تیز ہوگئی تھی اس لیے کپڑے بہت جلد خشک ہوگئے۔ بدن میں بھی گرمی آ گئی۔ بدن بھی خشک ہوگیا۔ فریڈی نے اپنے کشادہ تھیلے میں سے بھنی مرغی اور ڈبل روٹی نکالی جو ہم نے بھوک اور تھکان کی وجہ سے خوب سیر ہو کر کھائی۔ جنگلوں میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت سونے کی عادت ہوگئی ہے۔ چنانچہ ایک خشک اور سایہ دار مقام پر میں غافل سوتا رہا۔ سہ پہر کے وقت بے پناہ چھینکوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ میرے تینوں ساتھی یعنی فریڈی' ویبڈھم اور فریڈی کے چچازاد بھائی زکام' حرارت اور بخار میں مبتلا ہیں جس کی وجہ گھاس تھی۔ جس گھاس میں ہم تھے وہ کلغی نما تھی۔ صبح جاتے وقت چونکہ وہ بھیگی تھی اس لیے کلغی کے ملنے سے اس کا رواں نہیں گرا لیکن کھانے کے وقت تک گھاس خشک ہوگئی تھی اور اس کے اندر سونے کے لیے جگہ تلاش کرنے کی فکر میں پھرنے کی وجہ سے اس کا رواں ناک میں چلا گیا جس کی وجہ سے ان تینوں کو بخار ہوگیا۔ ہندوستانیوں کو اس قسم کا بخار نہیں ہوتا اور مجھے بھی کبھی نہیں ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس مرض میں مبتلا لوگوں کو دیکھا تھا اور ان کو دیکھ کر مجھے تشویش

ہوئی۔ فریڈی کے عزیز پر' جو بنگال میں چائے کے کھیتوں میں کام کرتے تھے' سب سے زیادہ اثر تھا۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں' پانی جاری تھا اور سوجن کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فریڈی دیکھ سکتے تھے مگر ان کی چھینکیں نہیں رکتی تھیں اور جب چھینکتے تو زمین ہل جاتی تھی۔ وینڈھم ایک پرانے' مضبوط اور پوری ملازمت جدوجہد میں گزارنے والے افسر اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ان پر کوئی اثر نہیں تھا لیکن ناک اور آنکھوں سے متواتر پانی جاری ہونے کی وجہ سے دستی رومال اپنے چہرے سے ہٹا نہیں سکتے تھے۔ جن مشکلات سے ہم گزر چکے تھے' جن میں سفینوں کا بحر تلاطم سے بچ کر نکل آنا اور جھٹکوں سے بدن کی چول چول ڈھیلی ہو جانا شامل تھے' کیا کم تھے۔ اب معاملہ انتہا پر پہنچ رہا تھا۔ ان تینوں ساتھیوں کو' جن کے نابینا ہونے کے امکانات تھے' اپنے ساتھ ہردوار لے کر جانا اور اپنے پیچھے تین سو اشخاص کی نگرانی کرنے کے خیال سے جو سرد لہر میرے جسم میں دوڑی' وہ اس سے کہیں زیادہ تھی جو آتے وقت برف جیسے سرد پانی کو عبور کرتے وقت محسوس ہوئی تھی۔ جوں جوں شام ہوتی گئی' ان کی حالت بہتر ہونے لگی جس کی وجہ سے مجھے اطمینان ہوا۔ جس وقت ہم تیسری مرتبہ دریا پار کر رہے تھے' فریڈی اور وینڈھم ٹھیک ہوچکے تھے اور فریڈی کے عزیز اس درجہ دیکھنے کے قابل ہوگئے تھے کہ ان کا ہاتھ پکڑ کر پتھروں سے بچانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

فریڈی کا مخبر اور رہبر ہمارا انتظار کر رہے تھے اور ہم کو ایک کھلے میدان میں سے گزار کر دریا کے ایک خشک حصے میں لے کر گئے جس کی چوڑائی اندازاً سو گز ہوگی۔ چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں اتنا ہی صاف دکھائی دے رہا تھا جتنا سورج کی روشنی میں۔ ایک مقام پر گھومتے ہوئے ہمارا ایک ہاتھی سے آمنا سامنا ہوگیا۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ اس نواح میں ایک بدمعاش ہاتھی رہتا تھا' چنانچہ اس کو بھی دیکھ لیا۔ اس کے دانت چاندنی میں چمک رہے تھے' کان پھیلے تھے اور وقفے وقفے سے چنگھاڑتا تھا۔ مخبر نے اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ یہ ہاتھی اپنی بدمزاجی کے لیے مشہور تھا۔ کئی آدمی مار چکا تھا اور ہماری فورس کے کئی اشخاص کو اس کا مار دینا یقینی تھا۔ ابتداء میں تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید رہبر کی پیشین گوئی صحیح ہو کیونکہ چند

قدم وہ اپنی سونڈ اٹھا کر چلا' اس کے بعد ایک دم گھوم کر چنگھاڑتے ہوئے دریا کے کنارے بھاگتا جنگل میں غائب ہوگیا۔ ایک میل تک دریا کے تیز بہاؤ والے کنارے پر چل کر ہم جنگل کے اس راستے پر پہنچے جو دو جنگلوں کے درمیان آگ لگنے کی صورت میں ایک جنگل سے دوسرے جنگل کو محفوظ رکھنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اس راستے پر چلنا نہایت خوشگوار تھا کیونکہ ہم چھوٹی گھاس پر چل رہے تھے اور چاند کی روشنی پتے پتے کو روشن کر کے ایسا منظر پیش کر رہی تھی کہ تمام پریشانیاں بھول گئے۔ جیسے ہی ہم جلی ہوئی گھاس کے ایک ٹکڑے پر پہنچے' جہاں سوکھے ہوئے درخت کی چوٹی پر بیٹھا رات کی خاموش فضا میں ایک مور شور مچا کر خطرے کا انتباہ کر رہا تھا' دو تیندوے جنگل سے نکل کر اس راستے پر آئے' ہمیں دیکھا اور خوبصورت انداز میں زقند بھر کر درختوں کے سایہ میں نظر سے اوجھل ہوگئے۔ ہاتھی کے آنے کا مقصد صرف تجسس تھا' نہ کہ کوئی نقصان پہنچانا۔ اس کے بعد اہلیان صحرا کو خطرے کی موجودگی کا مور کا انتباہ' پھر دو تیندووں کا دکھائی دینا اور تاریک سایوں میں روپوش ہو جانا' یہ تمام علامات ظاہر کرتی تھیں کہ میں اس زمین پر تھا جس کے چپے چپے سے واقف اور والہانہ لگاؤ رکھتا تھا۔

ہمارا مخبر اس راستے کو چھوڑ کر' جو مشرق سے مغرب کی طرف جاتا تھا' پہلے شمال کی طرف ایک میل یا اس سے زیادہ گیا۔ راستے میں خاردار جھاڑیاں اور گھنے درخت ملے۔ اس کے بعد ہم ایک چھوٹے چشمے پر پہنچے جس کے کنارے پر ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا۔ ہمیں اس درخت کے نیچے بیٹھنے اور انتظار کرنے کا مشورہ دے کر وہ اپنے بھائی سے ملنے مویشیوں کے باڑے چلا گیا۔ ہمیں کافی دیر اور تکلیف دہ انتظار کرنا پڑا۔ بھوک کی شدت ناقابل برداشت تھی' اس لیے کہ ہم نے مرغی اور ڈبل روٹی کے بعد کچھ نہیں کھایا تھا اور آدھی رات ہوچکی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اپنے ساتھیوں میں صرف میں سگریٹ پیتا تھا اور میرے سگریٹ ختم ہوگئے تھے۔ مخبر سورج طلوع ہونے سے پہلے واپس آیا اور بتایا کہ سلطانہ کے گروہ میں صرف نو اشخاص باقی رہ گئے ہیں۔ وہ گزشتہ شام مویشیوں کا باڑہ چھوڑ کر ہردوار کی طرف ڈاکہ ڈالنے گیا ہے اور اسی رات یا اگلے دن اس کی واپسی کے امکانات تھے۔ مخبر نے ہم کو

رائے دی کہ اس درخت کو چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل نہ ہوں' اس لیے کہ یہ سلطانہ کا علاقہ ہے۔ پھر وہ فورس کے کھانے کا انتظام کرنے روانہ ہو گیا۔

ایک اور اکتا دینے والا دن گزرا ــــــ وینڈھم کا ہمارے ساتھ یہ آخری دن تھا' اس لیے کہ کماؤں کے کمشنر ہونے کے علاوہ وہ ٹیڑھی ریاست کے پولٹیکل ایجنٹ بھی تھے اور دو دن بعد وہاں کے مہاراجہ سے نریندر نگر میں ملاقات کرنے والے تھے۔ رات گئے ایک بیل گاڑی آئی جس میں گھاس لدی تھی۔ گھاس کے نیچے سے چند بوریاں بھنے چنوں اور چالیس پونڈ گڑ اتارا گیا۔ یہ مقدار میں کم لیکن خوش آئند کھانا جملہ فورس میں تقسیم کیا گیا۔ مخبر نے صاحب کو یاد رکھا۔ روانہ ہونے سے پہلے ایک کپڑے میں بندھی چند روٹیاں نکال کر فریڈی کو پیش کیں۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ہم سب زمین پر کمر کے بل لیٹ گئے۔ باتوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ ہمارے ذہن میں ہردوار کے ملائم بستر اور گرم کھانوں کا خیال گھوم رہا تھا۔ اچانک مجھے درخت سے چند سو گز پر آواز آئی کہ ایک تیندوہ چیتل مار رہا ہے۔ یہ پیٹ بھر کر کھانے کا نادر موقع تھا' اس لیے کہ میرے حصے کی چپاتی نے بجائے بھوک کم کرنے کے اضافہ کر دیا تھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور فریڈی سے ان کی کھکری مانگی۔ فریڈی نے پوچھا "خیر تو ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ جس چیتل کو تیندوے نے مارا ہے' اس کی پچھلی ٹانگیں کاٹ کر لاؤں گا۔ کہنے لگے کہ تم کس چیتل اور کون سے تیندوے کی بات کر رہے ہو۔ چیتل کی آواز تو سنائی دی تھی لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ چیتل سلطانہ کے گروہ کے آدمیوں کو' جو شاید ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں' دیکھ کر بوکھلا گیا ہو۔ اگر میرا خیال صحیح تھا کہ تیندوے نے شکار مارا ہے' جس کا فریڈی کو شبہ تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں چیتل کو تیندوے سے کس طرح چھڑاؤں گا' جبکہ سرکاری مسکٹ استعمال نہیں کر سکتا (اس مرتبہ اپنی رائفل ساتھ نہیں لایا تھا' اس لیے کہ مجھے علم نہیں تھا کہ کس استعمال میں لائی جائے گی) اس لیے کہ مویشیوں کا باڑہ بہت قریب تھا۔ فریڈی نے میرے ارادے کو احمقانہ قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔ چنانچہ پشیمان ہو کر خالی پیٹ پھر لیٹ گیا۔ میں ایسے آدمیوں کو' جن کو جنگلی جانوروں اور ان کی بولیوں سے واقفیت نہ ہو' کس طرح یقین دلا سکتا تھا کہ ہرن انسانوں سے خائف

نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے ہی ایک ساتھی کو تیندوے کے ہاتھوں لقمہ اجل بنتے دیکھ رہا تھا اور یہ کہ تیندوے سے اس کے شکار یا جتنا گوشت مجھے ضرورت تھی' چھین کر لانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

رات خیریت سے گزری اور علی الصبح میں اور وینڈھم ہردوار کے لیے سفر پر پیدل روانہ ہوئے۔ ہم نے گنگا کو بھیم گوڈا کے بند سے عبور کیا اور بند کے ڈاک بنگلے میں جلدی سے دوپہر کا کھانا کھا کر شام کو دور تک پھیلے ہوئے پانی میں مچھلی کا شکار کھیلا جو عرصے تک یاد رہے گا۔

دوسرے دن صبح جب وینڈھم مہاراجہ سے ملنے نریندر نگر روانہ ہونے والے تھے اور میں کچھ اشیائے خوردنی اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے احباب کے لیے اکٹھی کر رہا تھا' ایک ہرکارے کے ذریعے اطلاع موصول ہوئی کہ فریڈی نے سلطانہ کو گرفتار کر لیا ہے۔

سلطانہ گزشتہ شام مویشیوں کے باڑے واپس آ گیا تھا۔ جب فورس نے باڑے کا محاصرہ کر لیا تو فریڈی گھٹنوں کے بل چل کر گوالوں کی بڑی جھونپڑی تک پہنچے اور ایک شخص کو چادر لپیٹے ایک چارپائی پر سوتے دیکھ کر اس پر بیٹھ گئے۔ بیس سٹون اور چار پاؤنڈ وزن کے نیچے دب کر سلطانہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر سکا اور اپنا یہ دعویٰ کہ زندہ گرفتار نہیں کیا جا سکے گا' پورا نہ کر سکا۔

چھ ڈکیت جو دوش کے وقت جھونپڑی میں موجود تھے' مع سلطانہ کے چار تو وہیں گرفتار ہو گئے اور باقی دو' بابو اور پہلوان' جو سلطانہ کے نائب تھے' فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے حالانکہ ان پر گولیاں چلائی گئیں۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ سلطانہ نے کتنی آدمیوں کا قتل کیا ہو گا' لیکن مقدمہ چلتے وقت اس کے خلاف خاص الزام اس کے کسی گروہ کے ہاتھوں لچور کے کھیا کے ملازم کا قتل تھا۔

سلطانہ جس وقت پھانسی پانے والوں کی کوٹھڑی میں بند تھا' اس نے فریڈی کو بلوا کر نصیحت کی کہ نجیب آباد کے قلعہ میں مقید اس کی بیوی' بیٹے اور اس کے بے حد عزیز کتے کی اچھی طرح دیکھ بھال رکھی جائے۔ کتے کو تو فریڈی نے پال لیا اور جو

فریڈی کے مزاج سے واقف ہوں گے' ان کو معلوم ہوگا کہ سلطانہ کی بیوی اور بیٹے کی کس درجہ دیکھ بھال رکھی ہوگی۔

چند مہینے بعد فریڈی کو ترقی دے کر ڈی۔ آئی۔ جی بنا دیا گیا۔ وہ ہندوستان کی پولیس کے سب سے کم عمر افسر تھے' جن کو شہنشاہ برطانیہ نے سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے نوازا۔ فریڈی مراد آباد کی سالانہ ہفتہ پولیس کی پریڈ اور جشن میں شرکت کر رہے تھے۔ اس جشن کے دوران ایک ڈنر تھا' جس میں پورے صوبے کے اعلیٰ پولیس افسران مدعو تھے۔ کھانے کے دوران ایک کھانا کھلانے والے ملازم نے فریڈی کے کان میں کہا کہ ان کا اردلی بات کرنا چاہتا ہے۔ یہ اردلی سلطانہ کی گرفتاری کی مہم کے زمانے میں فریڈی کے ساتھ رہا تھا۔ اس اردلی کی شام کی چھٹی تھی' اس لیے تفریح کی غرض سے وہ مراد آباد ریلوے سٹیشن گیا تھا۔ اس کی موجودگی میں ایک ٹرین آئی۔ اطمینان سے وہ مسافروں کو اترتے دیکھ رہا تھا کہ اس کے سامنے والے کمپارٹمنٹ سے دو اشخاص اترے۔ ان میں سے ایک شخص نے دوسرے سے کچھ کہا' جس نے فوراً اپنے منہ پر کپڑا لپیٹ لیا۔ اسی اثناء میں اردلی نے مشاہدہ کیا کہ اس شخص کی ناک میں روئی لگی ہے۔ اردلی ان کو غور سے دیکھتا رہا۔ سامان ان اشخاص کے پاس زیادہ تھا۔ جب یہ لوگ آرام سے ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے تو اردلی جلدی سے ایک یکہ پکڑ کر فریڈی کو اطلاع دینے روانہ ہوگیا۔

جب سلطانہ کے دو نائب پہلوان اور بابو مویشیوں کے باڑے سے پولیس کا محاصرہ توڑ کر بھاگے تھے تو ان کے اوپر فائر کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد یہ شخص نجیب آباد کے ایک ہسپتال میں اس بہانے سے کہ اس کی ناک پر کتے نے کاٹ لیا تھا' علاج کرانے گیا۔ جس کمپاؤنڈر نے اس کی مرہم پٹی کی تھی' پولیس کو اطلاع دیتے وقت اپنے اس شبہ کا اظہار کیا کہ وہ چھرا لگا تھا نہ کہ کتے نے کاٹا تھا' لہٰذا جملہ پولیس ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس کی ناک پر زخم ہو۔ خاص طور پر اس لیے کہ سلطانہ کے گروہ میں سب سے زیادہ قتل بابو اور پہلوان نے کیے تھے۔

فریڈی اردلی کی بات سن کر فوراً اپنی کار میں بیٹھ کر طوفان کی طرح سٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ فریڈی جب عجلت میں گاڑی چلاتے تو ان کو نہ تو ٹریفک دکھائی

دیتا نہ موڑ۔ سٹیشن پہنچ کر تمام ایسی جگہ' جہاں سے ان لوگوں کے بھاگنے کے امکانات تھے' گارڈ تعینات کر دیے۔ اس کے بعد ان دونوں اشخاص کے پاس جا کر پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ وہ سوداگر تھے' جو بریلی سے پنجاب جا رہے تھے۔ فریڈی نے دریافت کیا کہ پھر ایسی ٹرین میں کیوں بیٹھے ہو جو تمہیں مراد آباد اترنا پڑا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ بریلی کے سٹیشن پر دو ٹرینیں کھڑی تھیں' ہمیں غلط گاڑی پر بٹھا دیا۔ جب فریڈی کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں بھوکے تھے اور دوسری ٹرین میں بیٹھنے کے لیے اگلے دن صبح تک انتظار کرنا پڑے گا' تو ان دونوں کو اپنے ہمراہ مہمان کی حیثیت سے چلنے کے لیے کہا۔ پہلے تو یہ لوگ ہچکچائے' اس کے بعد یہ کہہ کر چلنے پر آمادہ ہوگئے کہ "جیسے صاحب کی مرضی"۔

فریڈی ان دونوں کا اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر روانہ ہوگئے اور راستے میں پوچھ گچھ جاری رکھی اور دونوں معقول جواب دیتے رہے۔ پھر ان لوگوں نے فریڈی سے پوچھا کہ آیا یہ دستور ہے کہ صاحب لوگ رات کو سٹیشن آ کر لوگوں کو اس طرح اپنے ساتھ بٹھا کر لے جائیں' چاہے ان کا سٹیشن پر چھوڑا ہوا سامان جس کا جی چاہے چوری کر کے لے جائے۔ فریڈی کو معلوم تھا کہ جب تک باقاعدہ وارنٹ گرفتاری حاصل نہ کر لیا جائے' ان کی اس حرکت کے سخت نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اگر ان دونوں کے گروہ کے پرانے ساتھی' جو مراد آباد میں سزائیں بھگت رہے تھے' ان کو شناخت نہ کر پائے۔ اسی شش و پنج میں کار' جس بنگلے میں پولیس کے جشن کے سلسلے میں ٹھہرے تھے' پہنچ گئی۔

کتوں کو فریڈی سے بے حد انس ہو جاتا تھا' اسی طرح سلطانہ کے کتے کو بھی ہوگیا تھا۔ گزشتہ مہینوں میں تو اس دیسی کتے نے فریڈی سے بہت پیار کیا لیکن جب کار آ کر ٹھہری اور یہ تینوں کار سے باہر نکلے تو کتا تیز دوڑتا بنگلے سے باہر آیا۔ پہلے تو حیرت زدہ ہوا' اس کے بعد ان ڈکیتوں سے بے پناہ محبت کا اظہار کرنے لگا جو ایک کتا کر سکتا ہے۔ فریڈی اور یہ دونوں اشخاص ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ڈکیت کتے کو پیار کر کے کہنے لگے کہ اس معتبر گواہ کے سامنے ہم تسلیم کرتے ہیں "ینگ صاحب" کہ ہم وہی ہیں جن کی آپ کو تلاش تھی۔

معاشرہ کو مجرموں سے حفاظت کی توقع ہوتی ہے۔ سلطانہ بھی مجرم تھا' اس پر قانون رائج الوقت کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ جرم ثابت ہوا اور پھانسی دے دی گئی' لیکن اس کی تعریف میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس پستہ قد انسان نے تین سال تک حکومت کی طاقت کا دلیری سے مقابلہ کیا اور اپنی شجاعت کا لوہا منوا کر ان لوگوں کے دلوں میں' جو جیل میں رہنے کے دوران اس کی حفاظت کر رہے تھے' ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔

کاش انصاف کا تقاضا ہوتا کہ اس کو سرعام ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر نہ گھمایا جاتا تاکہ وہ لوگ جو اس کے نام سے کانپتے تھے جب وہ آزاد تھا' اب اس کو لعنت ملامت کریں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اس کو اتنی سخت سزا بھی نہ دی جاتی' محض اس وجہ سے کہ پیدائش کے وقت سے اس پر مجرم ہونے کی مہر لگا دی گئی تھی اور یہ کہ جب اس کے پاس طاقت تھی تو کبھی کسی غریب کو نہیں ستایا اور جب میں نے اس کا کھوج برگد کے درخت تک لگایا تھا تو اس نے میری اور میرے دوستوں کی جان بخش دی اور آخر میں جب وہ فریڈی سے ملنے گیا تو اس کے ہاتھ میں چاقو بھی نہیں تھا' نہ پستول تھا' بلکہ اس کے ہاتھ میں تربوز تھا۔

(جم کاربیٹ: ص ۴۷ - ۱۰۰)

پھولن دیوی

فروری ۱۹۸۳ء میں ہندوستان کی مشہور ڈاکو پھولن دیوی نے ایک سرکاری تقریب میں ہتھیار ڈال دیے۔ پھولن دیوی کی بحیثیت ڈاکو کے پورے ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں شہرت ہوچکی تھی اور اس شہرت نے اس کی زندگی کے گرد پراسرار رومانی کہانیوں کا ایک حلقہ بنا دیا تھا۔ اس کے بارے میں اخبارات میں جو خبریں چھپیں' ان میں دو رجحانات تھے: ایک تو روایتی رجحان کہ ڈاکو چونکہ قانون کے مجرم ہوتے ہیں' لہٰذا ان کو معاشرہ کا دشمن سمجھنا چاہیے اور ان کی نہ تو عزت کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کے ساتھ بحیثیت انسان کے برتاؤ کرنا چاہیے۔ عورت ہونے کی حیثیت سے اس کی ذات کے ساتھ جنسی تعلقات کو خاص اہمیت دی گئی اور اس کے بارے میں ایسی باتیں چھاپی گئیں کہ جس سے عورت کے بارے میں جو مرد کا تصور ہے' وہ مجروح ہو اور وہ لوگوں کی نظروں میں گر جائے۔

پھولن دیوی کے بارے میں "مالاسین" نے جو کتاب لکھی ہے' اس میں اس نے ہندوستان کے اہم اخبارات و رسائل کے وہ تراشے دیے ہیں کہ جو مشہور صحافیوں نے اس کے بارے میں لکھے ہیں۔ مثلاً اس کے ہتھیار ڈالنے کی رسم کے موقع پر "ٹائمز آف انڈیا" کے رپورٹر نے اس کے بارے میں لکھا کہ "وہ سیاہ رنگ' چھوٹے قد کی ڈاکوؤں کی ملکہ ہے جو کہ آسانی سے مچھلی مارکیٹ کے ہجوم میں غائب ہوسکتی ہے"۔ ایک اخبار نے لکھا کہ "بہت زیادہ سیاہ فام' چھوٹے قد کی' سپاٹ سینے والی اور بدتمیز"۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھولن دیوی کو جب ڈاکوؤں کی ملکہ کہا

گیا تھا تو اخبار والے اسے سفید رنگ کی' دراز قد' خوبصورت اور دل ربا حسینہ کے روپ میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ جب تک پھولن دیوی ان کی نظروں سے دور رہی' اس کے بارے میں رومانوی تصورات ان کے ذہنوں میں رہے' لیکن جب وہ حقیقت میں ان کے سامنے آئی' تو اس معمولی نقش و نگار کی عورت کو دیکھ کر انہیں افسوس ہوا کیونکہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ کارنامے صرف اعلیٰ ذات و طبقہ کے لوگوں سے ہوتے ہیں کہ جو جسمانی طور پر بھی خوبصورت ہوتے ہیں' اس لیے "ٹائمز آف انڈیا" کے رپورٹر نے بڑے دکھ کے ساتھ لکھا کہ جب پھولن دیوی کے اردگرد سے تصورات کو ہٹایا گیا تو وہ سیدھی سادی اور معمولی عورت نکلی۔

جیل میں رہتے ہوئے پھولن دیوی کے بارے میں جو خبریں چھپتی رہیں' ان میں اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ وہ جنسی طور پر آزاد خیال ہے اور اس کی جنسی خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتی ہیں مثلاً بلٹز کے نمائندے نے لکھا کہ: "پھولن دیوی اس بارے میں مشہور ہے کہ اس کی جنسی خواہشات کی کبھی تسکین نہیں ہوتی' اس لیے وہ اس بات پر بضد رہتی ہے کہ اسے اپنے مرد ڈاکو ساتھیوں کے ساتھ رکھا جائے"۔

ڈاکوؤں کے بارے میں لکھنے والے عام طور سے ان کا تذکرہ درمیان میں سے شروع کرتے ہیں یعنی جب وہ ڈاکو بنے' لیکن اس حصہ کو بھلا دیا جاتا ہے کہ وہ ڈاکو کیوں بنے؟ اور کیا وجہ تھی کہ انہوں نے قتل و غارت گری کے راستے کو اختیار کیا؟ کیونکہ اگر ڈاکوؤں کی ابتدائی تاریخ کو دیکھا جائے تو اس میں معاشرہ مجرم نظر آتا ہے' کہ جہاں ذات پات' اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق ہے' پولیس کے مظالم ہیں' عدالت میں انصاف کی کمی ہے اور کمزور کے ساتھ ظالموں کی سختیاں اور مظالم ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر غربت ہے جو کچلے ہوئے انسانوں کو مسلسل محرومیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال خود پھولن دیوی کی کہانی ہے کہ جس میں اس باپ کی زمین پر اس کے رشتہ دار قبضہ کر لیتے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جاتی ہے جو اس سے عمر میں بیس سال بڑا ہے اور پھر دشمنی کی بنا پر اسے ڈاکوؤں کے ذریعے اغوا کرایا جاتا ہے' اس کے بعد سے ریپ کا ایک سلسلہ

شروع ہوتا ہے' یہاں تک کہ ۲۲ سال کی عمر میں وہ گینگ ریپ سے دوچار ہوتی ہے' اور آخر یہی حالات اسے ڈاکو بناتے ہیں۔

مدھیہ پردیش میں چمبل کی وادی ڈاکوؤں کے لیے مشہور ہے۔ اب تک جن ڈاکوؤں کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں' اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے اکثریت معاشرہ کی ناانصافیوں کا شکار تھے اور اس لیے یہ لوگ اپنے لیے ڈاکو کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ خود کو باغی کہتے تھے' جو اس لحاظ سے صحیح تھا کہ انہوں نے سماج اور اس کی روایات کے خلاف بغاوت کی تھی اور باغی ہونے کی حیثیت سے ان کا اولین ردعمل انتقام کا ہوتا تھا۔ ان لوگوں سے انتقام جن کے مظالم کا یہ شکار ہوئے تھے' اور اس معاشرہ سے جو انہیں انصاف نہیں دے سکا۔

ڈاکوؤں کی زندگی اس طرح قانون کے خلاف بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور ان کا مقابلہ قانون کے محافظ ہونے کی صورت میں پولیس سے پڑتا ہے۔ ڈاکو اور پولیس' دو متضاد ادارے' ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ پولیس خود کو قانون کا محافظ کہتی ہے' مگر پولیس اور لوگوں کے درمیان میں جو رشتہ ہے' اور جس طرح سے لوگ پولیس کے ہاتھوں زیادتیوں کا شکار ہوتے ہیں' اس میں ان کے دلوں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی' خصوصیت سے دیہاتی علاقوں میں جہاں پولیس زمینداروں' چودھریوں اور اعلیٰ ذات والوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے اور عام دیہاتیوں' کسانوں اور لوگوں کو کچل کر رکھتی ہے۔ ایسے ماحول میں باغی اور ڈاکو ان کے ہیرو بن جاتے ہیں اور ان کی قانون سے خلاف ورزی' ان کے دلوں کی آواز بن جاتی ہے۔ وہ ڈاکوؤں کی شکل میں اپنی محرومیوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو دیکھتے ہیں' اس لیے ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔

چمبل کی وادی کیوں ڈاکوؤں یا باغیوں کا گڑھ بنی؟ اس کے بارے میں جے پرکاش نرائن نے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

"چمبل کی وادی میں باغیوں کی روایات کئی صدیوں سے چلی آ رہی ہیں' اس علاقے کے تومار اور بہادریہ راجپوتوں کی دہلی کے سلاطین کے ہاتھوں مسلسل شکستیں اور بعد میں مغلوں اور مرہٹوں کی افواج کے مقابلے

میں ہزیمتیں اٹھانا' اس نے انہیں ایسے باغیوں میں بدل دیا جو ہمیشہ حکومت کے خلاف ہوتے ہیں اور اس طرح باغیانہ روایات کو زندہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جغرافیائی اور معاشی صورت حال نے باغیانہ خیالات کو پیدا کرنے میں مدد دی ہے اور ان میں رابن ہڈ کی روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کی تازہ مثال مشہور ڈاکو مان سنگھ کی ہے۔ وہ امیروں سے جو بھی دولت لوٹتا تھا' اس کا زیادہ حصہ غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ وہ اکثر علاقوں میں سکولوں کو مالی مدد دیتا تھا اور اس لیے غریب مدد کے لیے اس کی جانب دیکھتے تھے اور اسے اپنا سرپرست مانتے ہوئے "راجہ" کہتے تھے۔ یہ روایت شاید زیادہ عرصہ نہ رہے' مگر اس کی یادیں لوگوں کے دلوں میں برقرار رہیں گی۔

ان میں سے بہت سے لوگ کہ جو ہتھیار ڈال رہے ہیں' میں کہوں گا کہ ۷۵ فیصد وہ لوگ ہیں کہ جو خود یا ان کے خاندان سماجی اور معاشی ناانصافیوں کا شکار ہوئے ہیں اور معمولی ریونیو افسر اور پولیس کے ہاتھوں بے عزتی برداشت کی ہے۔ چونکہ یہ لوگ غصے والے ہوتے ہیں' اس لیے ان سے یہ ناانصافی اور ظلم برداشت نہیں ہوئے اور انہوں نے پہاڑوں میں پناہ لے کر بغاوت کر دی۔ ان کے ابتدائی جرائم میں سے ناانصافی کے خلاف آواز ہے اور اس لیے وہ خود کو باغی کہتے ہیں۔

اس لیے یہ محض لا اور آرڈر کا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ سماجی' معاشی اور نفسیاتی مسئلہ بھی ہے اور اس بات کو سرکاری حلقوں میں تسلیم بھی کیا جاتا ہے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پہلو کو نظرانداز کر کے صرف لا اور آرڈر کو فوقیت دی جاتی ہے۔ بہرحال اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک سماجی اور معاشی وجوہات کو دور نہیں کیا جائے گا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکلے گا"۔

(مالا سین : ص ۱۹۶)

❂

مالا سین کی کتاب "India's Bandit Queen" "ہندوستان کی ڈاکو ملکہ" کے مندرجہ اقتباسات سے پھولن دیوی کے بارے میں پتہ چلے گا کہ وہ کیسے ڈاکو بنی اور چمبل کی وادی اس وقت کن کن ڈاکوؤں کے گروہوں کا مرکز تھی۔

——— (۱) ———

پھولن دیوی کو اس حالت میں گھر سے گھسیٹ کر نکالا گیا کہ وہ پاؤں میں جوتے تک نہیں پہن سکی اور اس کے ننگے پیر کیچڑ میں دھنس کر رہ گئے' اس کے لیے اس حالت میں چلنا دوبھر تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ رسی سے باندھ دیے تھے اور رات کے اندھیرے میں وہ بمشکل چلنے کے قابل تھی' مگر اس پر مجبور تھی کہ اپنے اغوا کرنے والوں کی طرح تیز چلے۔ اس حالت میں گرتے پڑتے اس نے کوشش کی کہ خود کو قابو میں رکھے اور توازن کو بگڑنے نہ دے' مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی اور جب ایک مرتبہ اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک جھاڑی کا سہارا لیا تو کانٹے اس کی ہتھیلیوں میں گھس گئے۔ عام طور پر دریا پر جانے کے لیے وہ جو راستہ اختیار کرتی تھی' وہ کھیتوں میں سے ہو کر جاتا تھا' لیکن ڈاکوؤں نے اس کے بجائے اس راستہ کو اختیار کیا کہ جہاں لائن سے کانٹوں بھری جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ راستہ بھر وہ خاموش رہے۔

بابو سنگھ گوجر (ڈاکوؤں کا سردار) آگے آگے چل رہا تھا اور باقی قطار میں اس کے پیچھے تھے۔ کبھی کبھی کوئی اسے دھکا دے کر جلدی چلنے کا اشارہ دیتا' ساتھ میں چلتے ہوئے اسے رائفل کے بٹ سے یا ہاتھ سے ٹھوکا دیا جاتا تھا تاکہ اسے احساس رہے کہ وہ ایک قیدی ہے اور اسے گرفتار کرنے والوں کو اس پر کوئی ترس نہیں آ رہا۔

...... کوئی ۳۵ یا ۴۰ کلومیٹر چلنے کے بعد وہ سب آرام کی غرض سے رک گئے۔ اس موقع پر اس نے روتے ہوئے، گڑگڑا کر بابو سنگھ گوجر سے درخواست کی کہ اسے رہا کر دے، لیکن اس نے جواب میں اس کی ٹانگوں پر رائفل ماری، اور غصے سے اس کے چہرے پر تھپڑ مارے، پھر وہ اپنے ساتھیوں سے چاقو مانگنے لگا تاکہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر پھولن پر کچھ ایسا تاثر ہوا کہ اس نے رونا چھوڑ دیا اور اسے محسوس ہوا کہ اس میں برداشت کرنے کی اندرونی قوت آ گئی ہے۔

ڈاکوؤں میں سے ایک، جس کا دوسرا نمبر تھا، اس کی آنکھوں میں پھولن نے ہمدردی کی جھلک دیکھی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اسے یہ سب کچھ پسند نہیں آ رہا...... ڈاکو ہر روز اپنا کیمپ بدلتے رہتے تھے۔ کبھی وہ اپنے ساتھ کھانے کا سامان لے کر چلتے تھے اور کبھی وہ کسی چھوٹے سے گاؤں میں اپنے ہمدردوں یا مخبروں کے گھروں میں کھانا کھاتے تھے۔ جب کبھی ڈاکو گاؤں میں جاتے تھے تو پھولن دیوی کو باہر دو پہریداروں کی نگرانی میں چھوڑ جاتے تھے۔ رات کو سوتے ہوئے، بابو سنگھ گوجر کے لیے پلاسٹک کی شیٹ جھاڑیوں کے اوپر ڈال دی جاتی تھی، جبکہ بقایا لوگ کھلے میدان میں سوتے تھے۔ ابتدائی دو دنوں میں جھاڑیوں میں پڑے پلاسٹک کے پردے کے نیچے بابو سنگھ گوجر نے پھولن دیوی کو بے آبرو کیا اور پھر اسے دھکا دے کر کھلے میدان میں کر دیا کہ جہاں وہ سوئے۔ اس سلوک کے باوجود پھولن دیوی نہ تو روئی اور نہ چیخی چلائی۔

دوسرے دن کی رات کو بابو سنگھ گوجر نشہ کی حالت میں تھا۔ اس نے اسے گھسیٹ کر اپنے آدمیوں سے کہا کہ کوئی ہے کہ جو آج اس شودر عورت کے ساتھ مزے کرے۔ اس موقع پر وکرم ملاح آگے بڑھا اور اس نے اپنے سردار سے کہا کہ وہ خود پر قابو رکھے اور ساتھ میں دوسروں سے کہا کہ وہ اپنے سردار کی اس معاملہ میں تقلید نہ کریں۔ اگرچہ اس مداخلت پر بابو سنگھ گوجر کو غصہ تو بہت آیا، مگر اس نے خود پر قابو پایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس گروہ میں وکرم ملاح کے بہت سے ہمدرد ہیں۔ اس نے پھولن دیوی کو دھکا دے کر ایک طرف کیا اور خود جھاڑی میں بیٹھ کر شراب پینے لگا۔

دوسرے دن بابو سنگھ گوجر اور وکرم ملاح میں جھگڑا ہوا۔ بابو سنگھ کہنے لگا:
"میرے بغیر تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس سے پہلے تم قلی کی طرح سامان اٹھاتے تھے اور معمولی کاموں کے لیے دوڑتے تھے' یہ میں ہوں کہ جس نے تمہیں اس پوزیشن میں کر دیا ہے"۔

ابتداء میں ملاح نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا' جس کی وجہ سے بابو سنگھ اور طیش میں آگیا اور اس نے کہا کہ اگرچہ اس نے اس سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ آٹھ دن تک اس عورت کو اسی طرح چھوڑے رکھے گا' مگر آج کی رات اسے عورت کی ضرورت ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ کیسے ملاح کتا اس کا راستہ روکے گا۔ اس پر وکرم نے اس سے کہا:

"ٹھاکر صاحب' اس عورت کو گالیاں دینے کی کیا ضرورت ہے' وہ پہلے ہی سے بہت خوف زدہ ہے"۔

"خوف زدہ" ...... "گالیاں" ...... بابو سنگھ نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "ملاح میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں تاکہ تم یاد رکھو کہ یہ گروہ ٹھاکر کے آدمیوں کا ہے' کوئی مچھلی پکڑنے والوں کا نہیں ہے"۔

وہ اپنے ۳۰۳ ماؤزر سے وکرم ملاح پر فائر کرنا چاہتا تھا کہ وکرم نے اسے گولی مار کر ختم کر دیا۔ دو آدمیوں نے' جو بابو سنگھ کے رشتہ دار تھے' مزاحمت کی کوشش کی' مگر انہیں بھی گولی مار کر ختم کر دیا گیا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر پھولن دیوی پر سکتہ طاری ہوگیا۔ تین مردہ آدمی اس کے سامنے خون میں لت پت پڑے تھے۔ بعد میں اس نے کہا کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کی عزت لوٹ آئی ہے۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مرد نے اس کے سامنے عورت کی عزت کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے وکرم ملاح کے قدموں کو چھوا۔

کچھ لمحوں کے لیے تو خاموشی رہی' مگر اس کے بعد بھارت سنگھ اور مادھو سنگھ' جو وکرم کے ساتھیوں میں سے تھے' آگے بڑھے اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے نعرہ لگایا "جے جے' وکرم ملاح کی جے"۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اس نعرہ میں

شریک ہوگئے اور وکرم ملاح بغیر جھگڑے کے ان کا سردار بن گیا اور پھولن دیوی اس کی مسٹریس۔

(ص ۷۰ - ۷۵)

—— (۲) ——

یہ واقعہ پھولن دیوی کی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی لے کر آیا اور وہ بھی گروہ کی ایک رکن بن گئی۔ اس کے کچھ دن بعد گروہ ایک گاؤں کی طرف گیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو وکرم ملاح نے میگافون کے ذریعے گاؤں کے لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا "ہم غریبوں کے ہمدرد ہیں اور امیروں کے جانی دشمن۔ ہم یہاں پر تم لوگوں کو کچھ دینے آئے ہیں' لینے نہیں لہٰذا ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں"۔ اس موقع پر گروہ کے کچھ جوشیلے اور نوجوان لوگوں نے ہوا میں فائر کیے۔ جب یہ لوگ گاؤں میں داخل ہونے لگے تو اس نے ایک مرتبہ پھر اعلان کیا "ہم پولیس والے نہیں ہیں' ہم تمہاری طرح کے غریب لوگ ہیں۔ تمہیں ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔

میگافون پر اعلان اور فائرنگ کی آواز سن کر سب سے پہلے آنے والے گاؤں کے بچے تھے۔ پھولن دیوی ڈاکوؤں کے درمیان میں اس طرح چل رہی تھی جیسے وہ ان میں سے ایک ہے اور کنکھیوں سے اپنے نئے سردار کو دیکھ رہی تھی' جو سجیلا اور ہر دلعزیز تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ' معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے باتیں اور بچوں سے مذاق کرتا ہوا۔ راستے میں اس نے ایک بچی کو اوپر اٹھا لیا' جو اس بے تکلفی پر خوش ہوگئی۔

گاؤں میں سب سے پہلے بڑی عمر کے لوگوں میں جو نظر آئے' وہ دو بوڑھی عورتیں تھیں جو ایک چارپائی پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں اور آنے والوں کو بڑے تجسس سے دیکھ رہی تھیں۔ وکرم ملاح نے جیسے ہی انہیں دیکھا' وہ فوراً ان کی جانب گیا اور ہاتھ جوڑ کر انہیں نمستے کیا اور روایتی طور پر ان کے پیروں کو چھوا۔ اس کے بعد بھارات سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ انہیں پیسے دو۔ ان دونوں عورتوں سے بڑے عاجزانہ طور پر مخاطب ہو کر بولا "مہربانی کر کے ہماری یہ بھینٹ قبول کریں' یہ آپ کے

بیٹوں کی طرف سے ہے"۔

بھارات نے نوٹوں کا ایک بنڈل انہیں دیا۔ اس پر عورتوں نے اصرار کیا کہ وہ ان کے مہمان رہیں۔ فوراً خاندان کی جوان عورتوں نے ہر ایک کے لیے چائے بنائی' آنے والے لوگوں کے لیے چارپائیاں لائی گئیں اور پھولن دیوی نے دیکھا کہ تقریباً آدھا گاؤں ان کے اردگرد جمع ہوگیا ہے' جو سب کے سب اپنے درمیان میں باغیوں کو دیکھ کر خوش بھی تھے اور متجسس بھی۔

اس دن گاؤں میں وکرم ملاح سب سے اہم شخصیت تھا۔ اس نے رائفل سے کارتوس نکال کر بچوں کو دے دی تاکہ وہ اس سے کھیلیں۔ اس نے لوگوں سے پانی' زمین' فصلوں اور کھاد کے مسائل پر گفتگو کی۔ وہ گاؤں کے مندر میں گیا' جو کہ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی' جس کی چونے سے قلعی کر دی گئی تھی۔ وہاں اس نے وشنو کی مورتی کے گلے میں سونے کا ہار ڈال دیا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان دلہن کو لایا گیا۔ اسے بھی وکرم نے سونے کا ایک ہار دیا۔ پورے گاؤں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میلہ ہو۔ بوڑھے' جوان اور بچے وکرم کو گھیرے میں لیے ہوئے گاؤں کی گلیوں میں پھر رہے تھے......

ڈاکوؤں کے تمام گروہوں نے اس بات کا ہمیشہ سے خیال رکھا ہے کہ وہ جن علاقوں میں رہتے ہیں' وہاں کے گاؤں والوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو ہمیشہ بہتر اور خوشگوار رکھیں اور ان کی مدد و حمایت پر بھروسہ کریں کیونکہ اس کے بغیر ان کے لیے زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اس علاقے کا مشہور ڈاکو مان سنگھ' جو ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا تھا' وہ اس کی سب سے اچھی مثال ہے' جو کہ پرانی اور نئی روایات کو ملاتا ہے۔ اس کا باپ ایک کسان تھا اور ساتھ میں سود پر روپیہ بھی دیتا تھا۔ یہ یو۔ پی میں ڈسٹرکٹ آگرہ میں کھیرلا ٹھور نامی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے باغیوں کے گروہوں سے تعلقات تھے اور یہ ان کے ساتھ بزنس کیا کرتا تھا' لیکن یہ سب کچھ اس قدر خفیہ طور پر ہوتا تھا کہ حکومت کے کارندے اپنی کوششوں کے باوجود اس کے خلاف شواہد جمع نہ کر سکے۔ اس زمانے میں باغیوں کے یہ گروہ انگریزوں کے خلاف بھی مزاحمت کرتے تھے اور اس وجہ سے کسانوں میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات

تھے اور وہ ان کی پوری طرح سے مدد کرتے تھے۔ اس خاندان کا تعلق تومر راجپوتوں سے تھا کہ جنہوں نے مغلوں کے خلاف لڑائیاں لڑی تھیں' ان کے لیے انگریزی حکومت محض ایک نام کی تبدیلی تھی۔

سودی کاروبار کرنے کی وجہ سے مان سنگھ کا باپ بہاری سنگھ گاؤں میں بڑا بااثر تھا' مگر لوگ اس سے نفرت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے' خاص طور پر وہ لوگ جو اس کے قرضدار ہوتے تھے۔ گاؤں کے برہمن زمینداروں نے' جو اس کے مقابلے میں خود کو کم طاقت ور پاتے تھے' یہ منصوبہ بنایا کہ کسی طرح سے بہاری سنگھ کو سزا دی جائے اور خود اپنی طاقت کو بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اس کے دشمنوں سے ملاپ کیا اور کوشش کی کہ برطانوی حکومت کو بھی اس میں شامل کر لے' جو کہ پہلے ہی سے اس کی دولت جمع کرنے کے ذرائع کی تفتیش کر رہے تھے۔

بات اس وقت بڑھ گئی جبکہ برہمن زمینداروں نے گاؤں کے بڑھئی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کا نام چھدا تھا اور کچھ دن پہلے ہی ڈاکوؤں نے ذاتی دشمنی کی وجہ سے اس کے گھر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بہاری سنگھ پر الزام لگایا کہ یہ اس ڈاکہ میں شریک تھا۔ پہلے تو اس بات کی کوشش کی گئی کہ چھدا کو جھوٹے بیان دینے سے روکا جائے' مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی' لٰہذا ردعمل کے طور پر ۳۰ جولائی ۱۹۲۸ء میں' مان سنگھ نے اپنے باپ کی عزت کا دفاع کرتے ہوئے چھدا کے ایک رشتہ دار پر حملہ کر دیا' جس کے بعد سے گاؤں کے برہمنوں اور ٹھاکروں میں ایک جنگ شروع ہو گئی' جس میں بہت سے مارے گئے' مکانات جلائے گئے' غلے کے گوداموں کو لوٹا گیا' یہاں تک کہ حکومت نے دخل اندازی کی اور مان سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کو عدالت سے عمرقید کی سزا ہوئی۔ اس وقت اس کے چار بیٹے تھے' جنہیں جھگڑوں میں ملوث ہونے کی بنا پر غائب کرا دیا گیا تھا۔

جب ۱۹۳۹ء میں مان سنگھ سنٹرل جیل آگرہ سے رہا ہوا تو اس وقت تک اس کے دو لڑکے گاؤں کے جھگڑوں کی وجہ سے مارے جا چکے تھے اور دو لڑکوں نے گھاٹیوں میں پناہ لے لی تھی اور وہ اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ اپنی ماں کے پاس بھی نہیں آتے تھے۔ مان سنگھ انتقام چاہتا تھا اور اس کی بیوی نے اس کی اس سلسلہ میں ہمت افزائی

کی' کیونکہ اس کی قید کے دوران میں وہ گاؤں کے برہمنوں کے ہاتھوں بڑے پریشان ہوئے تھے' لہٰذا مان سنگھ نے فیصلہ کیا کہ اپنے دو لڑکوں کے ساتھ اپنے دشمنوں کو سبق پڑھائے اور اس پر اس نے عمل بھی کیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۵ء تک کے عرصے میں' جبکہ وہ ایک پولیس مقابلہ میں مارا گیا' اس نے پوری چمبل کی وادی میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ اس نے نہ صرف برہمنوں کا صفایا کر دیا بلکہ انہیں بھی نہیں چھوڑا جن کا ان کے ساتھ ذرا بھی تعلق تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے' گاؤں کو لوٹا گیا اور فصلوں کو جلا دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں اس علاقے سے برہمنوں کا تسلط ختم ہو گیا۔

اس کے بعد سے ٹھاکروں کے گروہوں نے برہمنوں کی حیثیت کو ختم کر دیا' بالکل اسی طرح سے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں وکرم ملاح اور اس کی طرح کے ڈاکوؤں نے ٹھاکروں کی طاقت توڑ کر شودر ذات کے لوگوں کے اثر کو قائم کیا۔ یہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ سماج کی سب سے نچلی ذات کے لوگوں نے سٹین گن ہاتھ میں لی اور اپنی عزت کا دفاع کیا۔

انڈین پولیس جرنل میں مان سنگھ کے بارے میں جو رپورٹ ہے' اس میں کہا گیا ہے کہ:

> "۱۹۴۷ء کی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مان سنگھ بلاخوف و خطر اپنے گاؤں میں واپس آ گیا۔ یقیناً یہ ایک ایسے آدمی کی واپسی تھی کہ اپنی طاقت کی وجہ سے لوگوں کو خوف میں رکھتا تھا اور اس لیے لوگ بلا جھجک اس کی اطاعت کرتے تھے۔ اس عرصے میں اس کا باپ مرچکا تھا اور اس نے اپنے لڑکے نواب سنگھ کے ساتھ مل کر اپنے خفیہ اڈے سے خاندانی معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اپنی اس دولت سے کہ جو اس نے لوٹ سے حاصل کی تھی' گاؤں میں ایک اونچے ٹیلے پر اپنا شاندار مکان بنوایا اور اپنے دبنگ پن کی وجہ سے اس نے گاؤں میں اپنا اونچا مقام پیدا کر لیا۔ گاؤں کے لوگ اسے اپنا دوست سمجھتے تھے اور اپنا رہنما مانتے ہوئے اپنے جھگڑوں کے فیصلے اسی سے کراتے تھے۔ غریب لوگ اس سے

فیاضانہ طور پر فیض یاب ہوتے تھے۔ اس کی فیاضی اور سخاوت کی شہرت دور و نزدیک کے تمام علاقوں میں پھیل چکی تھی۔

لوگ فخر سے اس کے بارے میں ان کہانیوں کو بیان کرتے تھے کہ جس میں اس نے لوگوں کے ساتھ نیکی کی تھی۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ مخبروں اور پولیس والوں کو اسی وقت قتل کر دیتا تھا' جب وہ اس کا پیچھا کرتے تھے۔ وہ انہی لوگوں کو لوٹتا تھا جن کے پاس فالتو پیسہ ہوتا تھا۔ وہ برہمنوں کی عزت کرتا تھا اور ان کی دعائیں لیتا تھا اور زمینداروں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ رفاہی کاموں میں چندہ دیں۔ اس کے مداح اس بات کو کہا کرتے تھے کہ وہ ڈاکوؤں کی شریفانہ خوبیوں کی نمائندگی کرتا ہے اور ان پر عمل بھی کرتا ہے۔

اس کے پاس ریونیو' کسٹم اور محکمہ تعلیم کے لوگ بلاخوف و خطر آیا کرتے تھے۔ وہ شادی کی ان تقریبات میں شرکت کرتا تھا کہ جن میں کئی سو مہمان ہوا کرتے تھے۔ وہ کسی خراب عادت میں مبتلا نہیں تھا۔ لوگ جس وجہ سے اس سے متاثر تھے' وہ اس کا مذہبی ہونا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ جس میں وہ پوجا نہ کرتا ہو۔ وہ یقیناً دیوتاؤں کا ماننے والا تھا' مگر وہ اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ ڈاکہ ڈالنا خدا سے بغاوت ہے"۔

وکرم ملاح کے بارے میں پھولن دیوی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ

وکرم کے لیے پولیس کا ذکر انتہائی نفرت کا باعث تھا اور وہ جب بھی پولیس کو دیکھتا تھا تو اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور چیتے کی طرح ان پر حملہ کرتا تھا۔ چار پانچ گھنٹے کی لڑائی کے بعد جب وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ان پر فتح نہیں پا سکتا تو اس وقت وہ بھاگنے کا اشارہ کرتا تھا۔ اس طرح سے ہم تقریباً ۲۰ کوس کے قریب رات میں بھاگتے تھے۔ اسی طرح جب کبھی بھی ہمیں پولیس حملہ کا شک ہوتا تھا تو ہم مسلسل بھاگتے رہتے تھے۔ وکرم بڑا چالاک تھا' وہ رات میں تین جگہ ڈاکے مارتا تھا اور پولیس کو خوب بیوقوف بناتا تھا۔ وہ پولیس کو وارننگ کے خطوط لکھا کرتا تھا جس میں لکھا ہوتا تھا کہ

"بیوقوفو! اگر تم نے اپنی ماؤں کا دودھ پیا ہے تو کھلے میدان میں آؤ۔ تم غریب اور معصوم لوگوں کو کیوں پریشان کرتے ہو' انہیں کیوں اذیت دیتے ہو اور جیل میں ڈالتے ہو۔ اگر مارنا ہے تو ہمیں مارو کیونکہ ہم وہ مجرم ہیں کہ جن کی تمہیں تلاش ہے"۔

وہ عورتوں کی عزت کرتا تھا اور جہاں کہیں کسی عورت کو دیکھتا تو رک کر اس کے پیروں کو چھوتا۔ کبھی وہ انہیں روپیہ بھی دیتا اور اپنے ساتھیوں سے بھی انہیں دلواتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ وہ وکرم ملاح مستانہ ہے' اور جب تک وہ زندہ ہے' علاقے کی عورتیں آزادی کے ساتھ ادھر سے ادھر آ جا سکتی ہیں۔ کسی کی یہ جرات نہیں ہو سکتی کہ انہیں ذرا بھی نقصان پہنچائے۔ اس کی ذات بذات خود قانون تھی۔

اس کا دستور تھا کہ وہ گاؤں میں جا کر لوگوں کے جھگڑوں کا تصفیہ کرتا تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو مشورہ دیتا تھا کہ انہیں پولیس کے پاس جا کر کوئی شکایت نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ ان کی شکایت پر کوئی بھی کان نہیں دھرے گا۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتا تھا' گاؤں کے لوگ اس کو قبول کرتے تھے۔

(ص ۷۷ - ۸۴)

------ (۳) ------

وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا اور کافی وقت لگا کر وہ مجھے یہ سکھاتا رہا کہ کس طرح سے فائر کرنا چاہیے اور کیسے بھاگنا چاہیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب پولیس تعاقب میں ہو تو دوڑنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ ہم بڑے اچھے اور پرسکون ماحول میں رہ رہے تھے۔ ہمارے درمیان نہ تو کوئی جھگڑا ہوا اور نہ گروہ میں رشک و جلن کے واقعات ہوئے۔ وہ ہمیشہ میری ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ جب ہم گھاٹیوں میں بھوکے اور پیاسے سفر میں ہوتے تھے تو وہ مجھے سب سے پہلے پانی دیا کرتا تھا۔ وہ اصرار کرتا تھا کہ میں سب سے پہلے کھانا کھاؤں۔ جب وہ اپنے کپڑے دھوتا تھا تو ساتھ میں میرے کپڑے بھی دھوتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ میرے بالوں کو گوندھنے میں مدد دیا کرتا تھا۔

جب کبھی ہمارا پولیس سے مقابلہ ہوتا تھا تو وکرم میرا ہاتھ پکڑ کر تسلی دیا کرتا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور مجھے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد زور سے پولیس کو گالیاں دیتے ہوئے کہتا تھا "پولیس کے کتو! یاد رکھو' وکرم ملاح اکیلا نہیں ہے' میرے ساتھ پتلی بائی کی دوسری جنم والی ہے' لہٰذا تم کیوں موت کے منہ میں آتے ہو"۔

پتلی بائی ڈکیتی کی تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور اور قابل احترام شخصیت رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پولیس' سیاستدان اور صحافی تمام اسے "ڈاکوؤں کی ملکہ" کہا کرتے تھے اور ملک کی آزادی کے فوراً بعد اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے لوگوں کو اس میں کافی دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ مسلمان طوائفوں کے ایک گھرانہ میں آگرہ میں پیدا ہوئی تھی۔ ابتداء میں اس کی شہرت ناچنے والی کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کی ماں اصغری کا بزنس بڑا منافع والا تھا۔ وہ روایتی طور پر ناچنے والی لڑکیوں کے ساتھ کوٹھے پر بیٹھتی تھی۔ ان میں پتلی سب سے اچھی تھی' جس کی وجہ سے ملک کے دور دراز کے علاقوں سے لوگ آتے تھے۔ اس کی ماں نے پتلی کی ناچ اور گانے کی بڑی اچھی تربیت کی تھی اور مشہور موسیقار استادوں اور گروؤں نے اسے ان فنون میں ماہر کر دیا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کی شہرت اس قدر ہوئی کہ زمینداروں اور گاؤں کے امیر لوگوں نے اسے تقریبات پر بلانا شروع کر دیا' جہاں وہ ان کے مہمانوں کو تفریح فراہم کرتی تھی۔

ایک مرتبہ اسے دھولپور ریاست میں ایک دولت مند زمیندار نے اپنے لڑکے کی شادی پر دعوت دی۔ یہ ایک شاندار دعوت تھی' جس میں شرکت کرنے کے لیے کئی سو مہمان قریبی گاؤں سے آئے۔ دعوت کی تقریبات رات بھر صبح ہونے تک جاری رہیں اور مہمانوں نے خوب شراب پی اور خوب روپیہ لٹایا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ پتلی پر اس قدر روپیہ لٹایا گیا کہ حقیقتاً وہ نوٹوں پر رقص کرتی رہی۔

پھر اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ نشہ میں مست مہمان جان بچانے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے کیونکہ اکثر شادیوں میں زیورات اور روپیہ لوٹنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں...... اور حقیقت

بھی یہی تھی کہ یہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ تھا' جس کا سردار ایک مسلمان سلطان نامی تھا۔ یہ اپنے زمانے کا بدنام ترین گروہ تھا۔ اگرچہ پتلی کو پتہ نہیں تھا مگر یہ اس کا رقص ایک مرتبہ آگرہ میں دیکھ چکا تھا اور اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوا ہے' سلطان ایک ایسا شخص تھا جو کہ بڑا پراسرار اور پیچیدہ تھا اور جو عورتوں کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ برائی کی جڑ ہیں اور ہمیشہ اپنے ساتھ بدقسمتی لاتی ہیں۔ اگرچہ اس نے اپنی خواہشات کو دبائے رکھا تھا' مگر جب اس نے پتلی کو دیکھا تو اس پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور اسے اس خیال ہی سے تکلیف ہونے لگی کہ اس کا تعلق روز کسی نہ کسی نئے آدمی سے ہوتا ہے' اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ پتلی صرف اس کی ہوگی۔ جب اس نے سنا کہ وہ دھولپور میں شادی میں شریک ہونے آ رہی ہے تو اسی وقت اس نے اسے اغوا کرنے کا ارادہ کر لیا۔

پتلی اور سلطان کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ وہ کم از کم دو مرتبہ بھاگ کر اپنی ماں کے پاس آئی مگر جلد ہی یہاں کی زندگی سے بور ہو کر وہ دوبارہ سلطان کے پاس چلی گئی۔ اس کے ہاں سلطان سے ایک لڑکی ہوئی' جس کا نام اس نے 'تنو' رکھا اور اسے اپنی نانی کے پاس آگرہ بھیج دیا کیونکہ بچی کے ساتھ گھاٹیوں میں زندگی گزارنا بڑا مشکل تھا۔

سلطان پولیس کے ساتھ ایک مقابلے میں مارا گیا اور پتلی' کلیان سنگھ سے' جو کالا کے نام سے مشہور تھا' مل گئی۔ اس میں وہ شروع ہی سے دلچسپی لیتی تھی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں کالا اور پتلی کا گروہ چمبل کی وادی کا' مان سنگھ کے بعد' سب سے مشہور گروہ بن گیا..... جلد ہی پتلی کی شہرت "ڈاکوؤں کی ملکہ" کی حیثیت سے ہو گئی اور اس کی زندگی ہی میں اس کے بارے میں بہت سے قصے لوگوں میں مشہور تھے' جن میں اس کی مہموں کا ذکر تھا' اس کی بہادری کے بارے میں تھا' یہاں تک کہ اس کے بارے میں بہت سے گیت لکھے گئے۔ گاؤں والے' جنہوں نے اسے دیکھا تھا' بڑے فخر سے اس کا تذکرہ کرتے تھے اور اس کی ایک ایک بات کو بیان کرتے تھے۔ وہ اسے عقیدت سے "کالی دیوی کا دوسرا جنم" کہتے تھے.....

۲۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو پتلی کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جب کہ وہ پولیس سے بچنے کے لیے دریائے کنوری کو عبور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت وہ ۲۹ سال کی تھی۔ اس کے مردہ جسم کو گھسیٹ کر دریا کے بائیں کنارے پر لایا گیا۔ اس جگہ پر اب تک لوگ پوجا کرتے ہیں۔

(ص ۸۸ - ۹۱)

------ (۴) ------

اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں کہ وکرم ملاح کی موت کے بعد (جسے اس کے ساتھی سری رام نے قتل کر دیا تھا) پھولن دیوی کے اوپر کیا بیتی...... ایک امریکی صحافی جون براڈشا نے اسکوائر میں ایک رپورٹ لکھی تھی کہ

"گروہ بھاگ کر دریائے جمنا کے کنارے پر گیا کہ جہاں ان کی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان میں بیٹھتے ہوئے پھولن دیوی کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وکرم وہاں موجود نہیں ہے۔ اس نے واپس ساحل پر جانا چاہا' مگر سری رام نے پتوار سے مار کر اسے نیچے گرا دیا اور کہنے لگا کہ اس نے وکرم کو قتل کر دیا ہے' کیونکہ وہ اس کم ذات اور نچلے درجے کے ماہی گیر سے احکامات سن سن کر تنگ آ گیا تھا اور تمہیں اس لیے نہیں مارا گیا کہ میرا بھائی لالا رام تمہیں اپنے لیے چاہتا ہے"۔

وہ رات کے اندھیرے میں کئی میل تک چلے' یہاں تک کہ بھائی نامی ایک گاؤں میں پہنچ کر رک گئے۔ یہاں انہوں نے پھولن دیوی کو ایک تنگ اور گندی کوٹھڑی میں قید کر دیا۔ پہلی رات کو وہ سکڑی ہوئی زمین پر پڑی وکرم کے لیے روتی رہی۔ آدھی رات کے قریب دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا' جسے وہ نہیں پہچان سکی۔ پہلے تو اس نے اس کی پٹائی کی اور پھر اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ پھولن چیخی چلائی' اسے مارا پیٹا' لیکن وہ اس کے مقابلے میں بہت طاقتور تھا' اس لیے اس نے زبردستی اس کو ریپ کیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے لمبے چوڑے ٹھاکر آتے گئے اور اس کو ریپ کرتے گئے' یہاں تک کہ پھولن دیوی بے ہوش ہو گئی۔ تین ہفتے

تک پھولن دیوی کو برابر ریپ کیا گیا' یہ سب کچھ اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔۔۔۔ اس دوران اسے وقت کا کوئی احساس نہیں رہا۔ جب ایک بار دروازہ کھلا اور تیز روشنی اندر آئی تو اس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں' جنہیں اس نے اپنے بازو سے چھپا لیا۔ اس وقت کسی نے آواز دے کر اسے باہر آنے کو کہا۔ اس نے دیکھا کہ باہر سری رام' لالا رام اور ٹھاکروں کا ایک گروپ دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ دور و نزدیک کسی عورت کا نام و نشان نہیں تھا۔ سری رام نے پھولن کو حکم دیا کہ وہ کنویں سے ان کے لیے پانی لائے۔ جب اس نے انکار کیا تو اس نے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس کو بری طرح سے مارا پیٹا۔ جب وہ لنگڑاتی ہوئی کنویں تک گئی تو سری رام اور ٹھاکر زور زور سے ہنسنے لگے اور اس کا مذاق اڑانے لگے۔ اس کے بعد اس کو برہنگی کی حالت میں گھسیٹ کر دوبارہ کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

اپنی قید کے ۲۳ دن بعد' پھولن نے دروازے پر دستک کی آواز سنی اور قریبی گاؤں کا پجاری سنتوش پنڈت خاموشی سے اندر آیا۔ یہ دونوں پرانے دوست تھے۔ اس نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے۔ یہ بات گاؤں میں سب کو معلوم ہے' لیکن میں اب تک تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ دونوں بھائی صبح گاؤں سے چلے گئے ہیں اور اس وقت تمام لوگ سو رہے ہیں' لہٰذا آؤ میں تمہیں اس قید سے نکالتا ہوں"۔ پھولن بری طرح سے رونے لگی۔ پجاری اسے باہر لایا۔ "وہ اتنی ہلکی تھی جیسے کہ وہ صرف پروں اور ہڈیوں کی بنی ہو" بعد میں پجاری نے کہا۔ اس کے بعد وہ اسے بیل گاڑی میں بٹھا کر پاندری گاؤں لے گیا کیونکہ یہاں پھولن کے بہت سے جاننے والے تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ اس کی تیمار داری بھی کریں گے اور اس کی حفاظت بھی۔

(ص ۱۲۰ - ۱۲۶)

——— (۵) ———

(یہاں سے بھاگ کر پھولن دیوی نے ایک مسلمان ڈاکو بابا مستقیم سے مدد چاہی۔ اس نے اس کو سہارا دیا اور اس کا تعارف اپنے گروہ کے ایک شخص مان سنگھ سے کر

دیا' بعد میں دونوں نے مل کر علیحدہ سے اپنا گروہ بنا لیا۔) مان سنگھ اور پھولن دیوی کی ملاقات ۱۹۸۰ء کے آخر میں ہوئی۔ اس نے فوراً ہی یہ پیشکش کر دی کہ وہ پھولن کے ساتھ مل کر کام کرنے پر تیار ہے' گروہ کی سرداری مشترک ہوگی۔ مان سنگھ ڈاکہ زنی کے دوران اس نتیجے پر پہنچا کہ اغوا برائے تاوان اور شاہراہوں پر تجارتی ٹرکوں کو لوٹنا زیادہ منافع بخش کاروبار ہے۔ گاؤں پر حملہ عام طور پر بطور انتقام کیا جاتا ہے' تاکہ مخبروں کو یا خاص لوگوں کو سزا دی جائے۔ اس میں روپے پیسے کی لوٹ کا مقصد نہیں ہوتا' اگرچہ حملے کی صورت میں زیورات' سونا اور کچھ نقدی امیر گھرانوں سے ضرور مل جاتی ہے۔

مان سنگھ پھولن دیوی کی نشانہ بازی سے بڑا متاثر ہوا اور اس کو ۳۰۳ کی ماؤزر دی' جس سے اس نے ایک جنگلی مرغابی کو نشانہ بنایا اور پہلے ہی شاٹ میں اسے مار گرایا۔ مان سنگھ سبزی خور تھا اور گوشت نہیں کھاتا تھا مگر دوسروں پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بڑا خاموش اور متین شخص تھا۔ وکرم ملاح سے بالکل مختلف۔ جتنا پھولن دیوی اس کی طرف کھنچتی تھی' اسی قدر وہ اس سے دور ہوتا تھا۔ اس کا سلوک پھولن سے ایک پارٹنر کا تھا' وہ اسے اپنی عورت نہیں سمجھتا تھا۔

پھولن کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا...... مان سنگھ ہمیشہ اس کی رائے کا احترام کرتا تھا' اس سے معاملات پر بحث کرتا تھا اور کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے ضرور مشورہ کرتا تھا۔ وہ اس کے فیصلے کی قدر کرتا تھا مگر اپنے تجربے پر بھی بھروسہ کرتا تھا۔ اس طرح سے دونوں کا ساتھ خوشگوار تھا...... پھولن دیوی کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی' اسی وجہ سے دونوں نے فیصلہ کیا کہ بیہماؤ گاؤں والوں کو سزا دی جائے' کیونکہ اسی گاؤں کے نزدیک وکرم ملاح کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ گاؤں کے کس حصے میں ٹھاکر رہتے ہیں اور کس میں غریب......

دسمبر ۱۹۸۰ء کی ایک رات میں انہوں نے گاؤں پر حملہ کیا۔ انہوں نے ۹۰ گھروں کو لوٹا۔ اس موقع پر پھولن نے کسی رحمدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے مردوں اور عورتوں کو ایک جگہ جمع کیا' اپنی رائفل کے بٹ سے انہیں مارا اور یہ دھمکی دی کہ وہ ان کے بچوں کو قتل کر دے گی۔ اس طرح سے وہ اس خوف سے لطف اندوز ہوتا

چاہتی تھی جو ٹھاکروں کی آنکھوں میں تھا۔ بقایا گاؤں والوں سے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ "حرامزادو ٹھاکرو" اس نے نفرت سے کہا۔ اس نے مردوں کے چہروں پر تھوکا اور عورتوں کے تھپڑ مارے۔ پھر اس نے سنگھ بھائیوں کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور انہیں وارننگ دی کہ اب اگر انہوں نے ان کو پناہ دی تو وہ ان کے گھروں کو آگ لگا دے گی۔ جب وہ گاؤں سے پیسہ' سونا' چاندی اور زیورات لے کر جا رہے تھے' تو اس نے مان سنگھ سے میگافون لے کر چیخ کر کہا "سور ٹھاکرو' یاد رکھو' تم پھولن دیوی کو بیوقوف نہیں بنا سکتے ہو' وکرم کی جے"۔

(ص ۱۴۰ - ۱۴۳)

------ (٦) ------

۱۴ فروری ۱۹۸۱ء کی بات ہے کہ جب ۲۲ ٹھاکروں کو گولی ماری گئی۔ ان میں سے بیس مر گئے اور دو زندہ بچ گئے۔ ان ۲۲ ٹھاکروں کو دریائے جمنا کے کنارے ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں۔ اس کے بعد پیچھے سے انہیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ گولیوں کی گونج سے پورا گاؤں لرز اٹھا' جبکہ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کے دروازوں پر ہجوم کیے کھڑے رہے۔ دریا کے کنارے مرنے والوں میں سری رام اور لالہ رام شامل نہیں تھے......

مان سنگھ نے پولیس کو جو بیان دیا' اس میں اس نے کہا کہ

"وکرم سنگھ' جس کے ساتھ پھولن دیوی رہ چکی ہے' اسے بھائی گاؤں کے ٹھاکروں نے قتل کیا تھا۔ اس کے قتل کا انتقام لینے کے لیے ہم نے بھائی کا قتل عام کیا۔ اس وقت رام اوتار کا گروہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس میں ۱۹ آدمی تھے' جبکہ ہمارے ۷ لوگ تھے۔ اس وقت گاؤں میں پنچایت ہو رہی تھی۔ یہ گاؤں سری رام اور لالہ رام کو پناہ دیا کرتا تھا۔ اس محلہ میں ہم نے ۱۸ یا ۱۹ ٹھاکروں کو قتل کی۔ اس کے بعد میں مزید اس جھگڑے میں نہیں پڑا اور ہیمرپور کے جنگلوں میں بھاگ گیا"۔

اس واقعہ کی وجہ سے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اتر پردیش کے تمام

ٹھاکروں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ امیر اور خوش حال کسان ہونے کی وجہ سے پوری ریاست میں لوگوں کے ووٹوں پر ان کا بڑا اثر تھا' اس لیے اندرا گاندھی ان کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ پھولن دیوی پر قومی اور بین الاقوامی اخباروں اور رسالوں میں لاتعداد مضامین چھپے...... ٹائمز آف انڈیا کے رپورٹر نے موقع واردات پر جا کر لوگوں سے بیان لیا۔ کرشنا سوارپ جو کہ قتل ہونے سے بچنے والوں میں سے ایک تھا' اس نے بیان دیا کہ

"ڈاکوؤں کی ملکہ پھولن دیوی خاکی جین پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ہاتھ میں میگافون تھا' جس کے ذریعے اس نے گاؤں والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے باہر آ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اس نے کہا کہ وہ اس خاندان کو تباہ و برباد کر دے گی' جس نے کہ اس کے مخالف گروہ سری رام کو پناہ دی ہو یا اسے کھانا کھلایا ہو......"

پھولن دیوی نے یرغمالیوں کو حکم دیا کہ وہ ایک مٹی کی دیوار کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائیں۔ بیس منٹ کے اندر اندر یہ سب مر چکے تھے۔ ان میں سے چار' جن کے گولیاں لگی تھیں' انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ اس جرم کے عینی شاہد یہی تھے۔

ظاہراً اس واقعہ کے بارے میں مکمل معلومات کسی کے پاس نہیں۔ ایم جے اکبر کے ماہانہ رسالہ "سنڈے" میں اس کے بارے میں یہ رپورٹ چھپی:

"وہ جینز پہنتی ہے' اسٹین گن لے کر چلتی ہے' جس کو وہ انتہائی مہارت کے ساتھ بغیر کسی رحم کے استعمال کرتی ہے۔ اس کا تعلق نچلی ذات سے ہے اور وہ اونچی ذات کے ٹھاکروں سے نفرت کرتی ہے کیونکہ انہوں نے اس کو اور اس کے خاندان برادری پر بڑے مظالم کیے ہیں۔ اس کو اغوا کیا گیا اور دو ٹھاکر ڈاکوؤں نے اسے مسلسل ریپ کیا۔ اس کے ڈاکو بننے کی کہانی یہ ہے کہ اسے اس کے شوہر نے ذلیل کر کے چھوڑ دیا' معاشرہ نے بھی خوار کیا۔ آج یہ سب سے زیادہ طاقتور ڈاکو ہے' جس سے کہ اتر پردیش میں ہر کوئی ڈرتا ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ ٹھاکروں اور سماج دونوں سے انتقام لے......"

(ص ۱۵۰-۱۵۶)

——— (۷) ———

ہتھیار ڈالنے کے بعد پھولن دیوی نے ۱۹۸۳ء میں ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

- س: کیا تمہیں خوف کا احساس ہوا ہے؟

- ج: میں ہر روز خوف کی حالت میں رہی۔ میں اس رات کے خوف کو بھی نہیں بھول سکتی ہوں جب مجھے وکرم اور بابو سنگھ نے اغوا کیا تھا اور وہ مجھے قتل کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ جنگل میں رہتے ہوئے دو مرتبہ میں سخت خوف زدہ ہوئی تھی۔ ایک رات میں سو رہی تھی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کوئی کسی چیز سے میرے چہرے پر ضرب لگا رہا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ ایک چیتے کی دم تھی۔ وہ ڈر کر بھاگ گیا۔ دوسری مرتبہ میں ڈیرے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز میری رانوں کے درمیان رینگ رہی ہو۔ پہلے میرا خیال ہوا کہ شاید کوئی ہمارا ساتھی میرے ساتھ مذاق کر رہا ہو اور اس نے کوئی رسی میرے نیچے پھینک دی ہو' پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ سانپ تھا۔ میں نے جلدی سے اسے پکڑا اور دور پھینک دیا۔ میں نے اسے برے شگون کے طور پر لیا۔ اس کے بعد ہم سب نے بندوقیں اٹھائیں اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دس منٹ بعد ہم نے اس جگہ چکاچوند کرنے والی روشنی دیکھی۔ پولیس ہماری تلاش میں وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ خدا نے ہمیں خود کو بچانے کا اشارہ دیا تھا۔

- س: گھاٹیوں میں زندگی کس قسم کی ہوتی تھی؟

- ج: میرے پاس اس قسم کے الفاظ نہیں کہ اسے بیان کر سکوں' کیونکہ بہت کم لوگ ہوں گے جو اسے سمجھ سکیں گے۔ اگر کوئی اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو اسے وہاں رہنا ہوگا۔ ہم روز ۱۲ سے ۱۵ کوس تک چلنے کے عادی تھے' اسی طرح ہمارے کھانے اور سونے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب ہم بھوکے ہوتے تھے تو ہم کسی گاؤں میں مع اپنی لاٹھیوں کے جاتے تھے اور وہاں سے چار دن کے لیے کھانا لے

آتے تھے۔ کبھی کبھی ہم جو کچھ لیتے تھے اس کے پیسے بھی دیتے تھے۔ ہم کھلے میدان میں سونے کے عادی تھے اور بارش میں بھی ہم اسی طرح سوتے تھے۔ ہم اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ صرف رات کا کھانا کھایا جائے' کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے اوپر گدھوں کو منڈلاتے دیکھ کر پولیس ہمارا پتہ چلا لے گی۔ اس طرح ہم آگ جلانے کے معاملے میں احتیاط کرتے تھے اور رات کو شعلوں کو دھیما رکھتے تھے۔

● - س : کیا سخت زندگی کی وجہ سے یا پولیس کے دباؤ کی وجہ سے تم نے ہتھیار ڈالے؟

✿ - ج : میں نے کہا نا کہ میں پولیس سے نہیں ڈرتی۔ زندگی سخت تھی' لیکن یہ تو ہمیشہ ہی سے سخت رہی ہے۔

● - س : تم بڑی تلخ لگتی ہو۔

✿ - ج : آج میں ایک مجرم ہوں کہ جسے پھانسی پر چڑھایا جا سکتا ہے' لیکن اس بات کو کیا کہا جائے گا کہ جب مجھے اغوا کیا گیا اور ریپ کیا گیا' اس وقت پولیس کہاں تھی؟ جس دن مجھے اغوا کیا گیا' اس دن میں پولیس سٹیشن گئی تھی کہ میری حفاظت کی جائے' لیکن آج پولیس والے تو افسر ہیں اور پھولن دیوی قاتل ہے۔

● - س : تم نے کتنے جرائم کیے ہیں؟

✿ - ج : مجھے یاد نہیں۔ مجھے پتہ نہیں کہ میں نے کتنے لوگوں کو اغوا کیا اور کتنی ڈکیتیاں کیں۔

● - س : تم دو سال سے کہاں تھیں؟

✿ - ج : میں رکھسول میں تھی۔ تقریباً سات سے دس دن جھانسی اور نیپال کی سرحد کے تمام ضلعوں میں گزارے۔ میں یو۔ پی کے ان تمام ضلعوں میں رہی ہوں جہاں کہ جمنا بہتی ہے۔ میں نے کافی وقت جمنا کی گھاٹیوں میں سفر کرتے ہوئے گزارا ہے۔ پولیس کے ذمے میرے کئی جوتے ہیں۔

● - س : اس لیے کہ تم برابر بھاگتی رہیں!

✿ - ج : نہیں' اس لیے کہ میں نے کافی جوتے اپنے پیچھے چھوڑے۔ یہ میری عادت تھی کہ میں جب کبھی بیٹھتی تھی' جوتوں کو وہیں چھوڑ دیتی تھی۔ میں ایک دیہاتی

عورت ہوں اور جوتے میرے چلنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ میں انہیں صرف کانٹوں سے بچنے کے لیے پہنتی تھی۔ جب کبھی پولیس ہمارا گھیراؤ کرتی تھی' میں اپنے جوتوں کو چھوڑ کر ان کے خلاف پوزیشن لیتی تھی۔ کبھی کبھی میں نے سوچا کہ میں اپنے جوتے واپس لے آؤں' مگر پھر اس خیال سے باز رہی اور میں نے کہا چلو' پولیس کو پھولن دیوی کے جوتے پہن لینے دو۔

◖ -س: تم اپنے جوتے کہاں سے لیتی تھیں؟

✿ -ج: گاؤں سے' میں جوتے مانگتی تھی اور لوگ مجھے دے دیتے تھے۔

◖ -س: کیا یہ بھیک مانگنا تو نہیں تھا۔

✿ -ج: ڈاکو اور فقیر ایک ہی ہوتے ہیں۔

(ص ۲۳-۲۴)

✿

سندھ کے ڈاکو

سندھ میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ڈاکوؤں کی سرگرمیاں زور و شور کے ساتھ ابھریں۔ اگرچہ ڈاکوؤں کی یہ سرگرمیاں سندھ کی تاریخ میں پرانی ہیں' مگر اس بار ان ڈاکوؤں کی کارروائیاں اور ان کا اس طرح سے وجود میں آنا بالکل مختلف تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عام طور سے ڈاکو کی شخصیت کے پس منظر میں معاشرہ کی ناانصافیاں اور ظلم ہوتے تھے اور جب وہ انصاف سے مایوس ہو جاتا تھا تو وہ ایسا انتقام ڈاکو بن کر لیا کرتا تھا' مگر موجودہ دور میں سندھ کے ڈاکوؤں کا تعلق معاشرہ کی ناانصافی سے نہیں بلکہ سیاست سے ہے کیونکہ ان میں سے اکثر بڑے بڑے ڈاکوؤں کو سندھ کے زمینداروں اور سجادہ نشینوں کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اس لیے یہ روایتی ڈاکوؤں سے مختلف ہیں کیونکہ روایتی ڈاکو بڑے بڑے زمینداروں کے خلاف ہوتے تھے' انہیں لوٹتے تھے' ان کا قتل کرتے تھے اور ان کے گھروں کو آگ لگاتے تھے' مگر اس کے برعکس سندھ کے ڈاکوؤں نے سندھ کے وڈیروں کے ساتھ مل کر' چھوٹے زمینداروں کو کہ جو اپنی پوری طرح سے حفاظت نہیں کر سکتے تھے' لوٹا یا انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے یا ڈاکوؤں کے مطالبات ماننے کے لیے کسی بڑے زمیندار کے سایہ میں آ جائیں۔ چنانچہ اس صورت حال نے چھوٹے زمینداروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بڑے زمینداروں کی خدمت کریں۔ اس نے ان کی سیاسی و سماجی قوت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ سندھ میں ڈاکوؤں کی کارروائیوں میں کہیں بھی کسی بڑے زمیندار کے مفادات کو بالکل نہیں چھیڑا گیا اور نہ ہی ان سے تاوان وصول کیا گیا۔

دوسرا گروہ جو ڈاکوؤں کا شکار بنا' وہ چھوٹے شہروں میں رہنے والے متوسط طبقے کے لوگ تھے' جن میں ڈاکٹر' چھوٹے تاجر اور کاروباری لوگ تھے۔ اس کے بعد حکومت کے ملازمین تھے اور آخر میں حکومت کے کارخانے یا مختلف کمپنیاں تھیں جو ٹھیکوں پر مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ ان تمام لوگوں کو ڈاکوؤں سے اس وجہ سے پناہ نہیں ملی کہ پولیس اور حکومت کے اہلکار ان کی ملازمت میں تھے اور ڈاکو انہیں مدد کے بدلے میں خطیر رقم دیا کرتے تھے۔

وڈیروں کے علاوہ ان ڈاکوؤں کو ان طالب علموں کی جانب سے بھی مدد ملی کہ جن کا تعلق مختلف قومی تحریکوں سے تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے بعد سندھ کے متوسط طبقے اور طالب علموں میں سخت مایوسی پھیلی ہوئی تھی اور فوجی حکومت کے خلاف ان کے جذبات نفرت سے بھرے ہوئے تھے' اس لیے وہ ہر اس تحریک کی مدد کرنا چاہتے تھے کہ جو حکومت کو کمزور کرے' چونکہ ڈاکوؤں نے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے حکومت کی اتھارٹی کو چیلنج کیا تھا' اس لیے قومی تحریکوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوگئی تھیں اور وہ حکومت کی ناکامی اور ڈاکوؤں کی کارروائیوں پر خوش ہوتے تھے' اس لیے سندھ یونیورسٹی کا انٹرنیشنل ہاسٹل عرصے تک ان ڈاکوؤں کی پناہ گاہ تھا' جہاں وہ طالب علم رہنماؤں کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔

سندھ کے سیاسی حالات اور فوجی حکومت کی مخالفت کی وجہ سے ڈاکو ہیرو بن کر ابھرے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب پیرو چانڈیو مارا گیا' تو اس کی تجہیز و تکفین کے وقت اس کی لاش پر روایتی طور پر بڑی تعداد میں اجرکیں ڈال کر اس سے عقیدت کا اظہار کیا گیا۔

اب یہ بات بھی واضح ہو کر آگئی ہے کہ سندھ کے بڑے وڈیروں نے ڈاکوؤں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا۔ جب کبھی انہیں حکومت پر دباؤ ڈالنا ہوتا تھا تو وہ ان کے ذریعے صوبہ میں بدامنی کی فضا پیدا کر دیتے تھے۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حکومت کی مختلف ایجنسیوں نے بھی انہیں استعمال کر کے اپنے مقاصد کو پورا کیا۔

اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خاص مواقع پر ان کی سرگرمیاں بڑھ جاتی

تھیں، مثلاً ٹرینوں پر حملے، شہروں میں ڈاکے اور فیکٹریوں پر حملے یا انتخابات کے موقع پر امن و امان کی صورت حال کو بگاڑنا، جیسے ۱۹۸۸ء میں حیدر آباد شہر کے قتل عام میں مشہور ڈاکو جانو آرائیں کا ملوث ہونا وغیرہ۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن تھا کہ جب وڈیروں اور خفیہ ایجنسی والوں کے ان سے روابط ہوں اور وہ ان سے اپنی پارٹی کی شرائط پر جرائم کراتے ہوں۔ اس کی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس طرح سے صوبہ کی صورت حال خراب رہے گی اور امن و امان بحال کرنے والے اداروں کی صوبہ میں موجودگی کا جواز رہے گا۔

اس لیے اگرچہ ڈاکوؤں کے خلاف مختلف آپریشن وقتاً" فوقتاً" کیے جاتے رہے، جن میں فوج، پولیس اور رینجرز کو استعمال کیا گیا، ان میں انتہائی اعلیٰ قسم کے ہتھیار استعمال کیے گئے۔ ہیلی کاپٹروں کو لایا گیا اور جنگلوں کو کاٹنے کے منصوبے بنائے گئے مگر یہ تمام آپریشن ہربار بری طرح ناکام رہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو شاید ان کے خاتمے کی سنجیدگی سے کوشش ہی نہیں کی گئی اور یہ تمام آپریشن محض دکھاوے کے تھے، دوسرے یہ کہ پولیس اور دوسرے حکومتی ادارے ڈاکوؤں کے تنخواہ دار تھے اور انہیں آپریشن کی تمام کارروائیوں سے مطلع رکھتے تھے، اس لیے اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ حفاظتی تدابیر اختیار کر لیتے تھے اور محفوظ مقامات پر منتقل ہو جاتے تھے۔

پولیس اور ڈاکوؤں کے تعاون کی خبریں اکثر اخباروں میں آتی رہتی تھیں مثلاً یہ خبر کہ مشہور ڈاکو محب شیدی حج کرنے گیا اور واپسی پر کراچی میں اسے استقبالیہ دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں کے ڈاکوؤں کے ساتھ روابط تھے، اس کی ایک مثال سکھر جیل سے ڈاکوؤں کا فرار بھی ہے۔ اس سلسلے میں بھی یہ افواہیں پھیلیں کہ ڈاکوؤں نے بڑی بڑی رقمیں حکومت کے عہدیداروں کو دیں اور جیل توڑ کر فرار ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کی وجہ سے صوبہ سندھ کو معاشی و سماجی نقصانات ہوئے۔ ایک تو اس کی وجہ سے اندرون سندھ میں لسانی تضادات ابھرے، کیونکہ جو غیر سندھی زمیندار اور کاشت کار تھے، انہوں نے خود کو

ڈاکوؤں کے مقابلے میں بے بس پایا۔ اکثر نے زمینیں سستی فروخت کر دیں' کچھ نے کھیتی باڑی ترک کر دی اور اس انتظار میں رہے کہ حالات ٹھیک ہوں تو دوبارہ سے کام شروع کریں۔ زراعتی پیداوار پر اس طرح سے اثر پڑا کہ جن لوگوں نے ڈاکوؤں کے مطالبات ماننے سے انکار کیا' ان کے کھیت جلا دیے گئے۔ ان کے ہاری عدم تحفظ کی وجہ سے بھاگ کر محفوظ جگہوں پر چلے گئے۔

ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے تجارتی سرگرمیوں اور کاروبار پر بھی اثر پڑا۔ لوگوں نے شہروں سے دیہاتوں اور قصبوں میں جانا بند کر دیا۔ اس طرح دیہاتی خوف کے عالم میں باہر نہ نکلتے تھے۔ غیر ملکی' جو کئی منصوبوں پر کام کر رہے تھے' ان کے اغوا کی وجہ سے یہ تمام منصوبے متاثر ہوئے اور غیر ملکیوں نے سیر و تفریح کی غرض سے اندرون سندھ جانا چھوڑ دیا۔

موجودہ فوجی آپریشن کی وجہ سے ڈاکوؤں کی سرگرمیاں کچھ کم ہوئی ہیں' مگر ختم نہیں ہوئیں' اس لیے اگر سیاسی حالات بدلتے ہیں تو ڈاکوؤں کے یہ گروہ' جو پورے سندھ میں پھیلے ہوئے ہیں' پھر سے متحرک ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ پولیس مقابلے میں نامی گرامی ڈاکو مارے جا چکے ہیں مگر یہ اس افسانوی کردار کی طرح ہے کہ جب ایک کو قتل کرو تو اس کے خون سے اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے خاتمے کے لیے سندھ کے سیاسی حالات کو بہتر بنانا اور وڈیرہ شاہی کے تسلط کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اس کے امکانات اس لیے نظر نہیں آتے ہیں کہ جمہوری دور میں یہی لوگ اقتدار میں آ جاتے ہیں اور پھر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے یہ ڈاکوؤں کو استعمال کرتے ہیں۔

سندھ کے ڈاکوؤں کے بارے میں یہ اقتباسات حیدر آباد سے شائع شدہ رسالے "تحریر و تصویر" سے لیے گئے ہیں' جس کے ایڈیٹر ظہیر احمد ہیں اور رسالہ جون/ جولائی ۱۹۹۳ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔ اگرچہ ان اقتباسات میں ایڈیٹر کے اپنے خیالات بھی آ گئے ہیں' مگر ساتھ میں حقائق بھی سامنے آئے ہیں۔ اس پر انحصار کی وجہ یہ ہے کہ اب تک سندھ کے ڈاکوؤں پر کوئی مستند تحریر سامنے نہیں آئی ہے' صرف اخباری بیانات' خبروں اور کالم نگاروں کے تجزیوں کے ذریعے ان کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

(۱)

سندھ میں ڈاکوؤں کی سرگرمیاں

سندھ میں حکومت' انتظامیہ' پولیس اور پریس کی غیرذمہ داری حد درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے اور بہت سے مسائل اسی غیرذمہ داری کے سبب جنم لیتے ہیں۔ پریس نے جس طرح افواہوں کو خبر بنانے اور خبر نگاروں نے خیالات کو امرواقعہ کے طور پر پیش کرنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے' اس نے سب کو مات کر دیا ہے۔ سندھی پریس میں یہ "خوبی" سب سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ جام صادق دشمنی ان کی قدر مشترک ہے۔ اگرچہ مشترکہ قدریں اور بھی ہیں' لیکن ان میں کسی نہ کسی مقام پر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ۲۵ مئی کو "خادم وطن" نے شہ سرخی میں مغوی چینی انجینئروں کی خبر شائع کی اور سردار سلطان احمد چانڈیو کو ان مغویوں کی رہائی کا ذریعہ بتایا' لیکن ۲۷ مئی کے اخبارات میں کراچی سے سلطان چانڈیو کی پریس کانفرنس شائع ہوئی' جس میں انہوں نے "ڈاکوؤں سے مذاکرات" میں نہ صرف اپنی ناکامی کا اعتراف کیا بلکہ پولیس اور انتظامیہ پر غیرذمہ داری کا الزام بھی لگایا۔ اسی حوالے سے مجھے پریس کی غیرذمہ داری کا خیال آیا' جس نے پولیس اور انتظامیہ کو مات کر دیا ہے۔

۲۵ مئی کو "خادم وطن" نے شہ سرخی میں لکھا: "۱۱ مئی کو ٹلٹی ضلع دادو سے اغوا ہونے والے تین چینی انجینئروں کو طویل مذاکرات کے بعد آج ۱۴ ویں دن سنیچر کو رہائی مل گئی۔ کیٹی جتوئی سے نواب سلطان چانڈیو انہیں لے کر کراچی روانہ ہوگئے۔ کیٹی جتوئی میں سلطان چانڈیو پریس کانفرنس کرنے والے تھے اور دادو سے صحافیوں کی ایک ٹیم وہاں گئی تھی' مگر پریس کانفرنس ملتوی کر دی گئی"۔ اخبار نے یہ بھی لکھا تھا کہ مسٹر ڈائی' مسٹر زو اور مسٹر لی کو لطیف چانڈیو نے اغوا کیا تھا اور اپنے ٹولے کے سردار لائق چانڈیو کے سپرد کر دیا تھا۔ لائق چانڈیو نے اپنے قبیلے کے سردار نواب سلطان احمد چانڈیو کے حکم پر مغویوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق لطیف چانڈیو کو ۳۰ لاکھ روپے ادا کیے گئے۔

اس خبر میں جو یقین اور اعتماد تھا' وہ ایک دن بعد ہی ہوا میں اڑ گیا' البتہ قیاس آرائی پر مبنی اس خبر اور بعد ازاں سلطان چانڈیو کی پریس کانفرنس سے ایک بات پھر اسٹیبلش ہوئی کہ ہمارے سیاست دانوں کے ڈاکوؤں سے رابطے ہیں اور وہ جب چاہیں مقامات مقررہ پر "مذاکرات" کر سکتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء کی "تحریک بحالی بھٹو خاندان" کے بعد یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ ڈاکوؤں سے ہماری انتظامیہ کے اعلیٰ افسران بھی سیاست دانوں کی طرح سلسلہ جنبانی رکھتے ہیں اور جب ان کی عزت اور نوکری پر بن جائے تو وہ ڈاکو بھائیوں کو پیغام دے سکتے ہیں کہ خدا کے واسطے خیال کرو اور اپنی حد میں رہو۔

سلطان چانڈیو نے کیٹی جتوئی کے ایئر کنڈیشنڈ ریسٹ ہاؤس میں' جہاں شکار وغیرہ کے موقع پر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی بھی قیام کرتے ہیں' ڈاکوؤں کی پر تکلف رہائش اور آسائش کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ ان کے پاس ٹیلی فون کی سہولت تک ہے۔ درحقیقت یہ معاملہ صرف کیٹی جتوئی تک محدود نہیں' اکثر وڈیروں کی "گمنام اوطاقیں" اور کچے کے علاقے میں شکار اور کاشت کے لیے موجود "رہائش گاہیں" ایسے ہی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔

ایک حیران کن بات یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ سندھ نے سلطان چانڈیو کی پریس کانفرنس کے جواب میں کہا ہے کہ "وہ جھوٹ بولتے ہیں' میں نے انہیں ڈاکوؤں سے مذاکرات کے لیے نہیں بھیجا تھا"۔

اگر جام صادق سچ کہتے ہیں' تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیٹی جتوئی تک جانے کے لیے سلطان چانڈیو کو ہیلی کاپٹر کس نے دیا؟

لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والے ہر دور کے کامیاب سیاست دان سردار چانڈیو اگر ڈاکو لائق چانڈیو کو مذاکرات کے لیے بلوا سکتے ہیں' تو کیا وہ اسے ڈاکو بننے سے نہیں روک سکتے تھے!

۱۱ مئی کو ڈاکوؤں کے ایک ٹولے نے جو ۲۵ افراد پر مشتمل تھا' واپڈا کے منصوبے پر کام کرنے والے تین انجینئروں لی چنگ' زوزنگ اور مسٹر ڈائی شی یو کو پچارو میں صبح ۹ بجے دادو سے بھان سعید آباد کی طرف آتے ہوئے اغوا کر لیا۔ ڈاکوؤں میں سے اکثر

پولیس کی وردی میں ملبوس تھے۔ ڈاکوؤں نے ڈرائیور خدا بخش کو حسب معمول خط دے کر رہا کر دیا' بعد ازاں جنگل سے انجینئروں کی گاڑی بھی پولیس کو مل گئی۔

اسی روز کنڈیارو کے نزدیک نیشنل بنک سکھر کے ریجنل ہیڈ کامل میمن کو جیپ میں سکھر سے نواب شاہ آتے ہوئے اغوا کیا گیا۔ اس روز اغوا اور ڈکیتی کی اور بھی کئی وارداتیں سندھ کے طول و عرض میں ہوئیں' لیکن چینی انجینئروں کے بعد نیشنل بنک کے ریجنل ہیڈ کا اغوا سب سے زیادہ اہم تھا۔

دوسرے دن وزیر اعظم نواز شریف نے گورنر ہاؤس کراچی میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کی صدارت کی اور چینی انجینئروں کے اغوا کے معاملات پر غور کیا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ چینی انجینئروں کو اغوا کرنے والے افراد کی نشاندہی ہو گئی ہے' انہیں جلد آزاد کرا لیا جائے گا۔ اخبارات میں یہ خبر بھی چھپی کہ غیر ملکی ماہرین نے اندرون سندھ جاری منصوبوں پر کام بند کر دیا ہے۔ تیسرے دن معلوم ہوا کہ وزیر اعلیٰ کے حکم پر ایس ایچ او سہون کو معطل کر دیا گیا ہے اور ڈی ایس پی کو وارننگ دی گئی ہے۔ اس سے قبل ایس ایچ او اڈیرو لعل کو بھی معطل کر دیا گیا تھا۔ اڈیرو لعل' حیدر آباد سے چند میل کے فاصلے پر ہے اور مین ریلوے لائن پر ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ ڈاکوؤں کے ایک ٹولے نے اس ریلوے سٹیشن پر دھاوا بول دیا تھا۔ اسی عرصے میں ۱۰ اور ۱۱ مئی کی شب نواب شاہ کے نزدیک مسافر ٹرین سپر ایکسپریس پر فائرنگ کی گئی تھی' جس کے نتیجے میں دو افراد ہلاک اور چھ زخمی ہو گئے تھے۔

۱۵ مئی کو روزنامہ "عبرت" نے خبر شائع کی کہ ۲۴ گھنٹے کے دوران سندھ میں ڈاکوؤں نے ۴۰ افراد کو اغوا کر لیا اور دو کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۱۸ مئی کو اسی اخبار نے یہ انکشاف کیا کہ دادو ضلع کی پولیس فورس میں موجود چانڈیو قبیلے کے افراد کو لائن حاضر کر دیا گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ جام صادق نے اس عرصے میں مسلسل کئی دن تک اسلام آباد میں "تین بڑوں" سے صلاح مشورے کیے۔ اسلام آباد سے دو مرتبہ خبر آئی کہ انہوں نے وہاں اپنا قیام بڑھا دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وزیر اعظم نواز شریف' صدر غلام اسحاق خان اور بری فوج کے سربراہ مرزا اسلم بیگ کے درمیان سندھ میں قیام امن کے لیے

متنفقہ قادر موٹے کی تلاش ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

۲۸ مئی کے سندھی اخبار میں چھپا کہ لائق چانڈیو نے حکومت کو وارننگ دی ہے کہ تین دن کے اندر اگر اس کے مطالبات نہ مانے گئے تو چینی انجینئروں کو قتل کر دیا جائے گا۔ پریس کلب دادو کو اس ڈاکو نے جو خط پوسٹ کیا' اس میں لکھا گیا ہے کہ چینی انجینئروں کے عوض قادر مگسی' جانو آرائیں' حسن چانڈیو اور غلام رسول کورائی کو رہا کیا جائے' ورنہ چینیوں کی لاشیں دادو مورو پل پر ملیں گی۔ یہ چاروں افراد' جن میں جئے سندھ کے لیڈر بھی ہیں اور مستند ڈاکو بھی' ۳۰ ستمبر کے سانحہ حیدر آباد میں ملوث ہیں۔

ایک اعلیٰ سرکاری افسر نے بتایا کہ سلطان چانڈیو کی ناکامی کی دو وجوہات ہیں: پہلی یہ کہ ڈاکو ضلع نواب شاہ کی ایک باا‌ثر شخصیت کے زیر اثر رہے ہیں اور ان ہی کے علاقے میں سرگرم ہیں' وہی ان کے دکھ سکھ کا خیال کرتے ہیں' تحفظ دلواتے ہیں اور کیٹی جتوئی میں آنے جانے اور رہنے سہنے کی اجازت دیتے ہیں' لہٰذا انہیں یہ منظور نہ تھا کہ سلطان چانڈیو محض چانڈیو سردار ہونے کے ناتے اس علاقے میں کامیاب اور باا‌ثر ہوں' ویسے بھی یہ شخصیت خود چانڈیو قبیلے کی طرح بلوچ ہے' چنانچہ انہوں نے لائق چانڈیو کو مذاکرات ناکام بنا دینے کی ہدایت دے دی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سلطان چانڈیو نے اپنے قبیلے کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا اور محض اپنی سیاست اور حاکمیت کے لیے اسے استعمال کیا' لہٰذا ان کا اثر و رسوخ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے اور غریب آدمی جب ڈاکو بن کر اپنے سردار کے سامنے بندوق لے کر بیٹھتا ہے تو وہ تمام تر احترام کے باوجود تلخ بات بھی کر سکتا ہے' لہٰذا سلطان چانڈیو سے کہا گیا کہ آپ چل کر آئے ہیں' تو ہم آپ کی عزت کے لیے ایک چینی دے سکتے ہیں' مگر بقیہ دو نہیں۔ یہ بات سلطان چانڈیو نے قبول نہیں کی۔ لطیف چانڈیو اپنے سردار کی عزت کے لیے تینوں مغویوں کو ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ بنیادی طور پر "مال" اسی کا تھا' لیکن لائق چانڈیو نے سخت رویہ اختیار کیا اور راضی بھی ہوا' تو صرف ایک چینی کی رہائی پر' تاکہ سلطان چانڈیو حکومت کو منہ دکھانے کے قابل ہو سکیں' مگر یہ زیادہ خطرناک بات تھی کیونکہ بعد ازاں اگر دو مغوی ہلاک کر دیے

جاتے تو سلطان چانڈیو کے لیے مشکل ہو جاتی۔

اعلیٰ افسر نے اس بات سے انکار کیا کہ ایس ایچ او سہون نے چینیوں کو اغوا کرایا' تاکہ وہ انہیں برآمد کر کے انعام اور ترقی پا سکے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ ایسی باتیں جعلی خطوط کے ذریعے خود پولیس میں موجود افراد پھیلا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں چینیوں کے اغوا میں بعض اعلیٰ عہدیدار ملوث ہوسکتے ہیں' لیکن کوئی چھوٹا افسر نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ سلطان چانڈیو کے لائق چانڈیو سے مذاکرات کے وقت پولیس کا رویہ بھی غیر مفاہمانہ تھا اور جس کی بنیادی وجہ تاوان کی بھاری رقم کا مطالبہ ہے۔

سلطان چانڈیو نے پریس کانفرنس خاصے غصے میں کی تھی' چنانچہ عام لوگوں کو بہت سے پیچ پڑھنے کو ملے۔ جام حکومت' جتوئی خاندان اور محکمہ پولیس کے ساتھ ساتھ ڈی آئی جی حیدر آباد بھی ان کی زد میں آئے۔ انہوں نے ڈی آئی جی پر الزام لگایا کہ ان کے ڈاکو لائق چانڈیو سے روابط ہیں اور ڈی آئی جی نے ان پر الزام لگایا کہ وہ پرانے پاپی ہیں۔

سندھ میں ڈاکوؤں نے اب اس راز کو پا لیا ہے کہ غیر ملکیوں کو اغوا کرنے سے نہ صرف زیادہ شہرت ملتی ہے' بلکہ بھاری رقم بھی وصول ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت اور اس کے حامی وڈیروں کو پیچھے دوڑایا جا سکتا ہے' چنانچہ سندھ میں جتنے منصوبوں پر غیر ملکی کام کر رہے ہیں یا نجی اور ملٹی نیشنل اداروں میں ملازم ہیں' ان کے لیے تشویش بڑھ گئی ہے۔

ڈاکوؤں کی ان کارروائیوں سے' جن میں غیر ملکی نشانہ بنے ہیں یا مزید اندیشہ ہے' بہت سے افراد ناخوش ہیں' کیونکہ اس طرح ان کے خیال میں سندھ کی ترقی طویل عرصے کے لیے رک جائے گی اور سندھ غیر ملکی معاونین کے لیے علاقہ غیر بن جائے گا۔

("تحریر و تصویر" ص ۳۹ - ۳۰)

------ (۲) ------

لائق چانڈیو کو اہم انکشافات کے بعد کیوں مارا گیا؟

بدنام ڈاکو لائق چانڈیو نے گرفتاری کے بعد تقریباً چار ماہ تک تفتیش کے دوران جب پولیس افسران' اعلیٰ حکام اور سیاست دانوں سے گہرے مراسم کا انکشاف کیا تو چینی انجینئروں کے اغوا کیس نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔

لائق چانڈیو نے' جو اکتوبر ۱۹۹۲ء میں پکڑا گیا تھا' فوجی حکام کو "اعتراف جرم" کے دوران بتایا کہ اس کے ایک ڈی آئی جی' چار ایس ایس پی اور آٹھ ڈی ایس پی صاحبان سے "خصوصی مراسم" تھے اور اس نے تاوان کی رقم وصول کرنے کے لیے سولہ پولیس انسپکٹروں کو اپنا ملازم رکھ چھوڑا تھا۔

لائق چانڈیو' جس کے سر کی قیمت ۳۵ لاکھ روپے تھی' اچانک کوئٹہ میں خیرپور پولیس پارٹی کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اسے ڈی ایس پی گمبٹ عبدالسمیع لغاری نے دیگر ۹ ڈاکوؤں کے ساتھ پکڑا تھا۔ اس نے خود کو شیر خان مگسی ظاہر کر کے پولیس کی دسترس سے نکلنا چاہا مگر ناکام رہا کیونکہ وہ شناخت کر لیا گیا تھا' حالانکہ گرفتاری کے وقت وہ زخمی تھا اور علاج کرانے ہی کوئٹہ گیا تھا۔

قبل ازیں ستمبر میں لائق چانڈیو کی گرفتاری کے لیے سابق وزیر ریلوے ظفر لغاری اور ان کے بھائی تنبر علی لغاری کے گھروں پر ایک اے ایس آئی کی نشاندہی کے بعد' جسے خود ڈاکوؤں سے تعلقات رکھنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا' چھاپے مارے گئے تھے اور دونوں بھائیوں کو اس خطرناک ڈاکو کو پناہ دینے اور علاج کرانے کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ لیکن لغاری برادران کے گھروں پر چھاپے میں لائق چانڈیو ہاتھ نہ آسکا اور وہ مبینہ طور پر بھاگ نکلنے میں کامیاب رہا۔

باخبر ذرائع کے مطابق ڈاکو لائق چانڈیو کے "اعتراف جرم" کی وڈیو فلم تیار کی گئی ہے' جس میں حیرت انگیز انکشافات ہیں اور بہت سے پولیس افسران "ڈاکو حمام" میں "ننگے" ہو گئے ہیں۔

جب چینی انجینئروں کو اغوا کیا گیا تھا تو حکومت نے ان کی رہائی کے لیے تین

کروڑ روپے تاوان ادا کیا تھا' مگر لائق چانڈیو کے مطابق اسے "سودے" میں ایک پیسہ بھی نہیں ملا تھا' بلکہ یہ رقم اعلیٰ افسران اور سیاست دانوں نے آپس میں بانٹ لی تھی اور بعض افسران نے تو اپنی "خدمات" کے عوض حکومت سے تعریفی اسناد اور ترقیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔

لائق چانڈیو نے بتایا کہ ایک بااثر شخص نے' جو سندھ میں اہم عہدے پر تھا' اسے چینی انجینئروں کو اغوا کرنے کے لیے کہا تھا۔ چنانچہ چینیوں کو پہلے ڈاکو لطیف چانڈیو نے اٹھایا اور لین دین کے لیے لائق چانڈیو کے سپرد کر دیا تھا' اس کے بعد پوری حکومت یرغمال نظر آنے لگی تھی۔

جام صادق کے دور میں لائق چانڈیو کی ہلاکت کا دعویٰ بھی ایک منصوبے کے تحت ڈرامے کے طور پر کیا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بالائی سندھ میں مسافر ٹرینوں پر فائرنگ بھی اس کے گروہ نے ایک بااثر سیاست دان کی ہدایت پر کی تھی۔

وزیر اعظم نواز شریف نے ڈاکوؤں سے "خصوصی مراسم" رکھنے والے پولیس افسروں اور اہلکاروں کے خلاف سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ لائق چانڈیو کے بیان اور فوجی حکام کی سفارش پر کیا' چنانچہ تین ایس پی صاحبان پیر محمد عباسی' میاں غفار اور اختر حسین جانوری کو فوری سماعت کی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم دیا گیا' قبل ازیں ان کے خلاف معمولی انداز سے مقدمات درج کیے گئے تھے۔ اسی ضمن میں ایس پی ٹھٹھہ نادر کھوسو اور ایس پی جیکب آباد دین محمد بلوچ کو بھی اسلام آباد رپورٹ کرنے کے لیے کہا گیا' مگر ۲۹ جنوری کی ایک خبر کے مطابق اعلیٰ پولیس افسران کے خلاف وزیر اعظم کے احکامات ہوا میں معلق ہیں۔

لائق چانڈیو کے بیان کے بعد چینی انجینئروں کے اغوا کیس میں سب سے اہم قدم سابق ایم پی اے سردار بہن خان لنڈ کے خلاف اٹھایا گیا۔ اس بااثر شخص نے پولیس افسران اور ڈاکوؤں کے درمیان "قابل اعتماد مرکزی کردار" کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ حکومت نے سردار بہن خان کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر ۳۰ لاکھ روپے انعام مقرر کیا ہے اور تاحال وہ مفرور ہے۔

لائق چانڈیو کے بارے میں چار ماہ سے زائد حراست کے بعد خبر دی گئی کہ وہ پیر

۲۲ فروری ۱۹۹۴ء کی شام کو اپنے ساتھی علی محمد چانڈیو کے ساتھ اس وقت مارا گیا جب اس نے خیرپور کے تھانے محمود چنا سے صوبھو ڈیرو جاتے ہوئے حراست سے فرار کی کوشش کی۔ اسے متذکرہ علاقے میں مدفون اسلحہ کی نشاندہی کے لیے لایا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے ساتھیوں نے حملہ کر کے اسے چھڑانے کی کوشش کی' چنانچہ وہ مارا گیا۔

بہرحال قصہ خواہ کوئی ہو' چینیوں کو اغوا کرنے' متعدد پولیس اہلکاروں سمیت ایک سو سے زیادہ افراد کو قتل کرنے والے افسانوی کردار کے حامل ڈاکو کی زندگی کے دن پورے ہوگئے تھے اور اس کی ہلاکت کی یہ خبر جھوٹی نہیں' مگر لائق چانڈیو بہت سے "نالائقوں" کو ساتھ لے کر مرا ہے یا انہیں پھر زندگی دے گیا ہے' یہ اہم سوال ہے؟

(۱۹۹۴ء)

("تحریر و تصویر" ص ۳۹)

(۳)

سندھ کے پیر' میر اور سجادہ نشین

ڈاکوؤں کی سرپرستی کیوں کرتے ہیں؟

اعصاب شکن خبروں کی قطار سے ایک حوصلہ افزا خبر ڈاکو علی گوہر چانڈیو کی ہلاکت کی آئی ہے' جو ڈاکو پرو چانڈیو کا بھائی تھا۔

سندھ میں گزشتہ سات آٹھ سال سے ڈاکہ زنی' اغوا' رہزنی اور چوری کی وارداتیں پے درپے ہو رہی ہیں۔ عام شہری ہی نہیں' حکومت بھی حد درجہ پریشان ہے۔ جرائم کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیان صرف ضلع دادو میں ۴۹۰ افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

گزشتہ سال مارشل لا حکام نے کئی قیمتی جانیں گنوانے کے بعد نامی گرامی ڈاکوؤں کو گرفتار کیا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ اگر ان ڈاکوؤں کو دی گئی موت کی سزاؤں پر عمل درآمد ہوگیا تو شاید سندھ میں قدرے سکون ہو جائے۔ شاہراہیں جو غیر محفوظ

ہو چکی ہیں' بستیاں جو سرشام ویران ہو جاتی ہیں' ان کی رونق پھر لوٹ آئے۔
لیکن ۲۲ اور ۲۳ مارچ کی شب سکھر جیل ٹوٹنے کی خبر آئی اور نہایت وحشت ناک کارروائی کے بعد ڈاکوؤں کے فرار کی کہانی سب نے سنی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈکیتیوں کی شدت میں پھر اضافہ ہوگیا اور ہر طرف سے قتل و غارت' لوٹ مار کی خبریں آنے لگیں' خود حکومت کی عزت پر حرف آیا' وزیر اعلیٰ کی شہرت داغدار ہوئی' سیاسی حریفوں نے صوبے میں بدامنی کے سبب حکومت کی معزولی کا مطالبہ کیا اور گورنر راج نافذ ہونے کی افواہیں اڑیں۔ درجنوں شہریوں اور پولیس اہلکاروں کی جانوں کا ضیاع اس کے سوا ہے۔

آخرکار حکومت سندھ نے وفاقی حکومت کے ذریعے فوج سے درخواست کی کہ وہ ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن میں پولیس کی مدد اور رہنمائی کرے۔ ستمبر میں مجوزہ آپریشن کو آخری شکل دی گئی اور اکتوبر سے اب فوج اور پولیس کی مشترکہ کوششوں کا آغاز ہوچکا ہے' جس کے کچھ بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ متاثرہ افراد کا اعتماد کسی حد تک بحال ہوا ہے اور انہیں اپنی جان کے تحفظ اور سلامتی کے سلسلے میں جو خدشات لاحق تھے' ان کے بادل چھٹ رہے ہیں۔

علی گوہر چانڈیو کی ہلاکت اس آپریشن کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سندھ میں سرگرم ڈاکوؤں کے گروہوں میں علی گوہر پہلی صف کا خطرناک ڈاکو تھا۔

منگل ۱۴ اکتوبر کی صبح' جبکہ ابھی سویرا طلوع نہ ہوا تھا' علی گوہر اور اس کے چار ساتھیوں کو فوج اور پولیس نے ضلع دادو کے علاقے میہڑ میں قومی اسمبلی کے رکن کی زرعی اراضی پر گھیر لیا' نہیں معلوم کہ وہ یہاں کچھ دیر کے لیے ٹھہرا تھا یا اس نے رکن قومی اسمبلی سے پناہ لے رکھی تھی۔ بہرحال وہ اور اس کا ساتھی شاہ عالم چانڈیو یہاں مارے گئے' جبکہ خان محمد چانڈیو' امداد چانڈیو اور جمن چانڈیو بمع اسلحہ کے زخمی حالت میں گرفتار ہوئے۔ اس آپریشن کی کمان کرنل زاہد حسین کر رہے تھے' خیال ہے کہ علی گوہر سونا بندی اور میانی کے جنگل سے ہوتا ہوا یہاں آیا تھا۔

علی گوہر چانڈیو اپنے بھائی پرو چانڈیو کی اپریل ۸۴ء میں ہلاکت کے بعد گروہ کا سردار بن گیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی موت کا تقریباً پونے تین سال تک بھیانک

انتقام لیا۔ درجنوں پولیس اہلکاروں اور شہریوں کا خون اس کے سر پر تھا۔ ایک بار اس نے سابق آئی جی بشیر صدیقی کے قافلے پر بھی حملہ کیا تھا' لیکن آئی جی کی گارڈ کے تین جوانوں نے جان دے کر انہیں بچا لیا تھا۔

علی گوہر کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر بھاری انعام کے سبب اس کی ہلاکت کی غلط خبر دو بار چھپی' مگر جلد ہی یہ بھید کھل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار علی گوہر کی شناخت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔

بدامنی کی موجودہ فضا کے پس منظر میں علی گوہر کی ہلاکت کا واقعہ سندھ کی سماجی زندگی میں کس قدر اہمیت رکھتا ہے' اس کا اندازہ سندھی اخبارات کی شہ سرخیوں اور نمایاں خبروں سے ہو سکتا ہے جو علی گوہر کی ہلاکت پر لگائی گئی ہیں۔

آپریشن میں حصہ لینے والی فورسز کی توجہ اب علی گوہر ڈیپرانی' وزیر خشک' ایوب کھوسو' طاہر واسیو' قابل چاچڑ' نورو ماچھی' حسن چانڈیو اور بقادار شاہ کے گروہوں پر مرکوز ہے۔

سکھر جیل سے ۳۵ ڈاکو اور ایک مشقتی سمیت کل ۳۶ افراد فرار ہوئے تھے۔ مشقتی لقمان اور ایک ڈاکو نواب لولائی موقع پر مارے گئے' بقیہ ۳۴ میں سے ایک ڈاکو محمد خان گوپانگ شکارپور کے نزدیک مارا گیا تھا' جبکہ تین ڈاکو غلام اللہ کھوسو' عبدالستار بھٹو اور علی گوہر سکھر کے نواح سے پکڑے گئے تھے اور ایک ڈاکو عبدالغفور راجپوت ٹنڈو آدم سے ہاتھ آیا تھا۔

اس طرح مارچ سے اب تک پولیس کو ۲۹ مفرورین کی تلاش تھی۔ ان میں سے چار ڈاکو گرفتار کیے گئے جو یہ ہیں: منظور علی شاہ' عزیز اللہ کھوکھر' غلام شبیر کھوکھر اور جانو آرائیں۔ باقی بچ رہنے والے ۲۵ میں سے چار ڈاکو مارے جا چکے ہیں جو یہ ہیں: جانو کورائی' اسماعیل خشک' اکبر چانڈیو اور پریل چانڈیو۔

اب ۲۱ مفرور ڈاکوؤں کی تلاش ہے' جن میں علی گوہر ڈیپرانی' وزیر خشک' طاہر واسیو' نیاز محمد شاہانی' شہزادو' ارباب لولائی' علی حسن کاکیپوٹہ' علی احمد بلیدی' بشیر سومرو' سومار گوپانگ' بگو شہباز' خادم' رمضان' دادن چانڈیو' غلام سرور' قادو سرگانی' گل شیر' غلام محمد چانڈیو' راہموں عاربانی اور در محمد سیال شامل ہیں۔

علی گوہر ڈیہرانی، وزیر خشک اور طاہر واسیو، سب سے زیادہ خطرناک ڈاکو ہیں اور ان کے منظم گروہ ہیں۔

موجودہ آپریشن میں چند روز قبل جوہی میں دو ڈاکو عطا محمد جمالی اور عباس جمالی ہلاک کیے گئے۔ اس سے پہلے اسماعیل چانڈیو مارا گیا۔ لاڑکانہ اور سکھر کی جانب بھی فورسز کو کچھ کامیابی ہوئی ہے مگر صورت حال ابھی قابل اطمینان نہیں۔ منگل کی صبح، جس روز علی گوہر اور شاہ عالم مارا گیا، اسی شام کو سکرنڈ کے نزدیک قومی شاہراہ پر ایک مسافر بس پر اندھا دھند فائرنگ کر کے ڈاکوؤں نے ۵ افراد کو ہلاک اور ۱۲ کو زخمی کر دیا۔ دوسرے دن پرانا ہالہ کے نزدیک سے ۵ افراد کے اغوا کی خبر آئی، جن میں سے تین کو ڈاکوؤں نے یرغمال بنا لیا ہے۔

ڈاکوؤں نے سب سے زیادہ ضلع دادو، ضلع نواب شاہ اور ضلع خیرپور کو نشانہ بنایا ہے۔ لاڑکانہ، شکارپور، سکھر اور جیکب آباد دوسری ترتیب میں آتے ہیں۔ گویا سندھ کے دو ڈویژن کے ۱۲ اضلاع میں سے سات اضلاع متاثر ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ پورا سکھر ڈویژن متاثر ہے، جبکہ حیدر آباد ڈویژن کا ۲۵ فیصد حصہ۔

ڈاکوؤں کی کمین گاہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ دونوں کناروں کا جنگل بنتا ہے یا پھر مختلف وڈیروں کی فراہم کردہ رہائش اور ان کا نشانہ قومی شاہراہ کا نصف حصہ اور انڈس ہائی وے کا ۷۵ فیصد حصہ ہے۔

جب سے ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن شروع ہوا ہے، مختلف سراغ رساں اداروں نے پولیس کے اثر و نفوذ سے بالاتر ہو کر جو چھان بین شروع کی ہے، اس میں حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ بہت سے پہلے اور دوسرے درجے کے سیاست دان ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

یہ بات دہرانے سے ہمارا مقصد سیاست کو بحیثیت مجموعی یا بطور انسٹی ٹیوشن کے مطعون کرنا نہیں کیونکہ جو لوگ سیاست دان ہیں، وہ سیاست دان بعد میں اور وڈیرے پہلے ہیں۔ ہمارے ملک کی سیاست میں بدقسمتی سے طریقہ انتخابات کے سبب یہی وڈیرے سیاست کے کرتا دھرتا رہے ہیں اور ہر اسمبلی میں ان کی اکثریت ہوتی ہے۔ ممکن ہے سیاست دان کی حیثیت سے ان کا کردار بہت اچھا، بے ضرر، معصومانہ اور

جمہوریت پسند ہو، لیکن وڈیرے کی حیثیت سے انہیں جو کردار اپنے علاقے میں ادا کرنا ہوتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ ڈاکوؤں سے بگاڑ پیدا نہ کریں اور تھانیدار سے بنا کر رکھیں۔

سندھ اور بلوچستان کا قبائلی معاشرہ بھی بدامنی کے خاتمے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ بلوچستان میں چونکہ ڈکیتی اور لوٹ مار کے وہ مواقع نہیں، جو وادی ہونے کے سبب سندھ میں ہیں لہٰذا چانڈیو، کھوسو، جمالی، بلیدی، خشک اور لغاری قبائل کے لوگ یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ انہیں یہاں سالہا سال سے آباد اپنے قبیلے کے افراد سے پناہ یا فرار کی صورت میں مدد ملتی ہے۔ پولیس میں موجود ہم قبیلہ لوگ بھی مدد و معاونت کرتے ہیں۔

سندھ میں وڈیرا شاہی سیاست کی مجبوری رہی ہے کہ حکم نہ ماننے والوں کے بیل، مویشی اور مال و متاع چوری کرا دیا جائے اور پھر "پنچ" بن کر کچھ "بھونگ" لینے کے بعد اپنے ہی پالے ہوئے زور آوروں سے چوری کا مال واپس کرا دیا جائے۔ اس طرح دست نگر بغاوت نہیں کرتے اور پڑوس کا وڈیرا بھی مرعوب رہتا ہے۔ کبھی کبھی ایک وڈیرا معمولی درجے کے چوروں کی پتھاریداری سے بالاتر ہو کر بڑے ڈاکوؤں کا پشت پناہ اس لیے بھی بن جاتا ہے کہ پڑوس کے سرکش وڈیرے کی سیاسی بالادستی اسے قبول نہیں ہوتی اور وہ اس کا مزاج درست کرنے کے لیے ڈاکوؤں سے رابطہ قائم کرتا ہے اور یہ رابطہ اس کی مجبوری بن جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وڈیرا اپنے کسی ہاری یا اس کے بیٹے پر ظلم کرتا ہے، پولیس کے ذریعے بند کرا دیتا ہے تو غریب ذہن میں سلگنے والی معمولی سی بغاوت مجسم انتقام اور سرکشی بن جاتی ہے۔

کچھ لوگ غربت، عسرت اور تنگ دستی سے عاجز آ کر یہ راہ اختیار کرتے ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ وڈیرا جو کھاتا، پہنتا اور خرچ کرتا ہے، اس کا عشر عشیر بھی ہمیں نصیب نہیں تو ان کے دل میں اسلحہ کے زور پر اسے چھین لینے کی جوت جاگتی ہے، دل کی نفرت آنکھوں میں ابل پڑتی ہے۔

بڑے پیر، میر اور سجادہ نشین عموماً اپنے کمداروں، خلیفوں یا مینیجروں کے ذریعے اپنے علاقے کے ڈاکوؤں سے روابط رکھتے ہیں۔ یہ ڈاکو وقت پڑنے پر ان کی پگ اونچی

رکھنے کے لیے خفیہ فورس کا کام دیتے ہیں' خواہ وہ کام سیاسی نوعیت کا ہو یا سماجی نوعیت کا' ہمارے افسران کیا اس بات سے انکار کریں گے کہ جب کبھی کوئی اہم شخص ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغوا ہوا تو انہوں نے چند مخصوص شخصیتوں سے رابطہ قائم نہیں کیا؟ افسوس یہ ہے کہ قانون خود چل کر ڈاکوؤں کی دہلیز تک جاتا رہا۔

اگرچہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں بہت سے بے گناہ پولیس والے مارے گئے' مگر یہ بات بھی اب کھلی حقیقت کی مانند ہے کہ ہماری پولیس فورس بذات خود اس کھیل کا حصہ ہے۔ سندھ میں پولیس والے عام طور پر تاوان کی رقموں کے لین دین میں مڈل مین کا کردار ادا کرتے رہے۔ اگر صوبہ سرحد میں گزشتہ برسوں میں ہیروئن کا کاروبار چمکا ہے تو سندھ میں اغوا کے کاروبار نے فروغ پایا ہے۔ تاوان لینے اور دینے کے کام میں پولیس کے رابطے اتنے مستحکم' دوستانہ اور قابل اعتبار بن گئے کہ ایک کو دوسرے سے خوف کھانے کی ضرورت نہ رہی۔ کبھی کبھی البتہ عملے کے بعض ناداں لوگ ڈاکوؤں کے ساتھ گرفتار ہو کر مشکل میں ڈال دیتے تھے۔

("تحریر و تصویر" ص ۴۴ - ۴۵)

(۴)

بدنام ڈاکو بقادار شاہ کی ہلاکت

۲ اور ۳ جنوری کی شب' ایک سو سے زائد بے گناہ افراد کا قاتل بقادار شاہ فوج' پولیس اور رینجرز کے مشترکہ آپریشن میں مارا گیا۔ جی ایم سید کے آبائی گاؤں "سن" میں ایک گھر میں چھپے ہوئے اس خطرناک ڈاکو نے گزشتہ کئی برسوں سے ٹیاری' ہالہ' سہون' سن اور خیرپور ناتھن شاہ وغیرہ میں لوگوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ دادو سے نواب شاہ تک دریا کے دونوں اطراف کا علاقہ اس کی زد میں تھا۔ ڈاکو بقادار شاہ کے ہمراہ اس کا بھائی علی نواز شاہ اور بھانجا امیر شاہ بھی موت کے گھاٹ اتر گئے' جبکہ بیوی اور بچے کو پولیس نے حراست میں لے لیا ہے۔ اس عفریت کے خاتمے کے لیے فوج کے ایک ہونہار کپتان عصمت اور ایک جوان طاہر کو جان کا نذرانہ دینا پڑا

جبکہ لیفٹیننٹ جدون زخمی ہوئے۔

بقادار شاہ کے مارے جانے کے بعد جی ایم سید کے بیٹے امیر حیدر شاہ نے کراچی کے ایک اخبار کے رپورٹر سے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ بقادار شاہ روزانہ سن جاتا ہے"۔ انہوں نے اس سے بھی لاعلمی ظاہر کی کہ ڈاکو کے بیوی بچے سن میں رہتے ہیں مگر دوسری ہی سانس میں اپنی پہلی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا "انہیں بعض افراد نے بتایا تھا کہ اس نے گھر میں ایک داشتہ بھی رکھی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے مالک مکان سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ مکان کسی اور شخص کے نام کرایہ پر ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ بقادار شاہ نے اپنی فیملی کو سن سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا ہے"۔ مگر باخبر ذرائع امیر حیدر شاہ کی اس "معصومیت" کو ماننے کے لیے تیار نہیں کیونکہ سن میں جس مکان میں بقادار شاہ مارا گیا' وہ امیر حیدر شاہ نے ہی اسے لے کر دیا تھا اور جی ایم سید کی حویلی اور امیر حیدر شاہ کے گھر کے بعد یہ تیسرا گھر تھا جو بہت عمدہ تعمیر کردہ تھا۔

پچھلے دنوں امیر حیدر شاہ کے بھائی امداد محمد شاہ کے برادر نسبتی اور ایک رشتے سے جی ایم سید کے پوتے شاہ محمد شاہ نے' جو پی این پی سندھ کے صدر ہیں' ہالہ کے علاقے میں مخدوم فیملی کے مقابلے میں الیکشن میں سر اٹھانے کی جرات کی تو بقادار شاہ کے ذریعے ان کے الیکشن ایجنٹ اغوا کرا دیے گئے۔ اس پر خود شاہ محمد شاہ نے کہا تھا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے' مجھے سن جا کر بیٹھنا ہوگا۔ گویا یہ بات راز نہ رہی تھی کہ بقادار شاہ کے نہ صرف امیر حیدر شاہ سے تعلقات ہیں' بلکہ ٹمیاری اور ہالہ کے دو اہم خاندانوں کے بھی اس سے روابط ہیں۔

زیادہ دن پرانی بات نہیں جب آئرلینڈ کی ایک خاتون صحافی سے رنی کوٹ میں امیر حیدر شاہ نے ڈاکو روزی کھوسو کی ملاقات کرائی تھی تو ایک میجر نے "سب کچھ" اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور امیر حیدر شاہ بھی یہ بات جانتے تھے کہ وہ "بد" سے زیادہ "بدنام" ہو چکے ہیں۔ جبکہ "بد" شاہ ہونے سے زیادہ حکومت میں اپنے مراسم کا فائدہ اٹھا کر اس "کاروبار" میں خاصا آگے جا چکا ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکو بقادار شاہ کی موت سے زیریں سندھ کے تین اہم سیاسی خاندانوں کی مخفی قوت کو دھچکا لگا ہے مگر

دریا کے دونوں اطراف میں اب بھی روزی کھوسو، حسن چانڈیو، ہوت چانڈیو، غلامو چانڈیو، علی گوہر ڈیپرانی اور اکبر کارو قرلی وغیرہ کے گینگ سرگرم ہیں۔

روزنامہ "عبرت" کے مطابق بقادار شاہ کا نام ۸۱ - ۱۹۸۰ء میں اس وقت سننے میں آیا جب ڈاکو نصیر فقیر کے ہمراہ اس نے حیدر آباد کے نزدیک سے کچھ افراد کو اغوا کیا۔ اس کیس میں اسے گرفتار کیا گیا۔ ضمانت پر رہائی کے بعد یہ ڈاکو نصیر فقیر کے ٹولے میں باقاعدہ شامل ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سفاک شخص نے نصیر فقیر کے ہمراہ، جو ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور جس کے ایک سیاسی خاندان سے تعلقات بھی تھے، بے پناہ وارداتیں کیں، مگر بھن کے معاملے پر یہ ڈاکو نصیر فقیر کا دشمن ہوگیا اور باخبر ذرائع کے مطابق نصیر فقیر پولیس مقابلے میں نہیں بلکہ بقادار شاہ کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ بقادار شاہ نے ۱۹۸۴ء کے بعد ملوک کھوسو اور نورو ماچھی کے گینگ کے ساتھ بھی متعدد وارداتیں کیں۔ پولیس رپورٹ میں بقادار شاہ ۴۰ افراد کا قاتل تھا لیکن درحقیقت اس نے سو سے زیادہ افراد کو جان سے مارا۔ "عبرت" کے مطابق ۱۹۸۶ء میں اس نے ایک عورت کو اغوا کر کے شادی کر لی تھی۔ اس کا باپ بہت عرصے جیل میں رہا مگر اب ضمانت پر آزاد ہے اور اکثر ٹمیاری، ہالہ میں دیکھا جاتا ہے۔ خود بقادار شاہ ٹمیاری میں بھینسیں چراتا اور دودھ بیچتا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں جب بقادار شاہ اور نورو ماچھی کو پولیس نے رنی کوٹ ضلع دادو کے علاقے میں گھیر لیا تھا تو اس کے بھائی ملوک شاہ نے پولیس سے مقابلہ جاری رکھتے ہوئے اسے فرار کا موقع دیا تھا۔ ملوک شاہ کے بعد دوسرا بھائی غفور شاہ ہالہ کے جنگلات میں اسی انداز سے مارا گیا تھا۔ یہاں بھی بقادار شاہ کو فرار کا موقع مل گیا تھا، لیکن ۱۲ جنوری کی شب سن میں نہ بقادار شاہ بچ سکا، نہ اس کا بھائی علی نواز شاہ۔ اب صرف ایک بھائی زمان شاہ زندہ ہے، جو سینٹرل جیل حیدر آباد میں ہے۔ بیوی اور بچے کو پولیس حراست میں لے چکی ہے۔ ممکن ہے ۸۰ سالہ باپ دوست علی شاہ بھی گرفتار کر لیا جائے۔

سن میں مارے جانے والے تینوں ڈاکوؤں کی لاشیں نواب شاہ گرلز میڈیکل کالج کو دے دی گئی ہیں تاکہ وہ عبرت کی موت مرنے والے ان لوگوں پر اپنے نشتر چلا کر تجربے کریں جو زندہ تھے تو دوسروں پر خنجر چلاتے رہے۔ تفصیلات کے مطابق آپریشن

کی رات اس گھر میں بقاوار شاہ' علی نواز شاہ' امیر علی شاہ' بقاوار کی ماں' بیوی' جیل میں قید زمان شاہ کی بیوی' تین بیٹے اور دو بیٹیاں وغیرہ موجود تھے۔ تقریباً ایک بجے فوج اور پولیس نے دھاوا بولا۔ گھر میں جی ایم سید اور بے نظیر کی تصاویر آویزاں تھیں۔ اس رات یونین کونسل کے چیئرمین ستابو شاہ سن میں تھے مگر امیر حیدر شاہ کراچی تھے۔

سیاسی خاندانوں سے ڈاکوؤں کے تعلقات اب روایات کے دائرے سے نکل کر ضرورت اور کاروبار کی حدود میں پہنچ چکے ہیں۔ ضلع تھرپارکر کے تعلقہ سامارو کے زمیندار شمس الدین جونیجو نے' جسے ڈاکوؤں نے اغوا کرنے کے ۲۳ دن بعد رہا کیا' بتایا ہے کہ وہ تھرپارکر ڈسٹرکٹ کونسل کا امیدوار تھا کہ ۲۶ دسمبر کو ایک بااثر سینیٹر نے اسے دستبردار ہونے کو کہا' انکار کے بعد ناراض ہو کر سینیٹر چلا گیا لیکن اسے ۵ مسلح افراد نے کوٹ غلام محمد کے نزدیک اغوا کر لیا۔ اغوا کرنے والا حضوری کھوسو کا گینگ تھا۔ حضوری کھوسو نے اسے بتایا کہ میں نے ایک بااثر شخص کا احسان اتارنے کے لیے اسے اغوا کیا ہے۔ شمس الدین کے بقول اسے ٹنڈو الہ یار اور ٹمیاری کے درمیان رکھا گیا۔ یہاں اس نے ڈاکو لعل ملوک کھوسو کو بھی دیکھا اور ایک دن اس پر یہ بھی منکشف ہوا کہ رفیع کاچھیلو کے بیٹے فیصل کاچھیلو کو بھی حضوری نے اغوا کیا ہے اور فیصل کے سلسلے میں ایک انتہائی اہم شخصیت حضوری سے ملنے جنگل میں آئی تھی۔ حضوری نے اسے بتایا کہ یہ بہت طاقتور شخص ہے اور اسی کے حکم پر میں نے فیصل کاچھیلو کو اٹھایا ہے۔

معصوم فیصل کاچھیلو کو تین ماہ قبل پبلک سکول لطیف آباد سے اغوا کیا گیا تھا۔ پولیس اس کے اغوا کے الزام میں ایک زمیندار کے بیٹے میر راجہ اور کونسلر میر فتح تالپور کو خاصے دن حراست میں رکھ چکی ہے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دسمبر میں جب پیر پگارا نے اپنی سالگرہ کا جشن منایا تھا تو یہ بات بھی گردش میں آئی تھی کہ فیصل کے والد رفیع کاچھیلو نے پیر صاحب کو ایک بہت قیمتی گھڑی تحفے میں دی ہے اور ان سے اپنے بیٹے کی بازیابی کے لیے مدد بھی چاہی ہے۔ غرض فیصل کاچھیلو کے اغوا سے متعلق متعدد کہانیاں اب اسی طرح افسانوی رنگ اختیار کر چکی ہیں جس طرح

سیٹھ سلیمان داؤد کے اغوا اور ڈاکٹر رضوی کی گرفتاری کے سلسلے میں ہوا تھا' مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ افسانے فرضی کرداروں پر مبنی نہیں۔ (جنوری ۱۹۸۸ء)
("تحریر و تصویر" ص ۳۴ - ۳۵)

——— (۵) ———

ڈاکو محب شیدی

اسے وزیر اعظم نواز شریف کی آمد کی "انتظامی ضرورت" قرار دیا جائے یا ان کے قدموں کی "برکت" کہ ٹیاری (ضلع حیدر آباد) کا بدنام ڈاکو محب شیدی مارا گیا۔ محب شیدی نے زیادہ شہرت اس لیے حاصل کرلی تھی کہ کئی بار وزیر اعلیٰ کی زبان پر اس کا نام آیا تھا اور حزب اختلاف کے کئی لیڈر بھی اس کا ذکر کر چکے تھے۔ وزیر اعلیٰ اسے حزب اختلاف کے کیمپ کا ڈاکو قرار دیتے تھے جبکہ حزب اختلاف نے محب شیدی کو متعدد بار "سرکاری ڈاکو" کہہ کر پکارا۔

بہرحال ۳۵ لاکھ روپے کی قیمت کے سر والا ڈاکو اب مارا جا چکا ہے اور سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ اسے رینجرز نے ایک مقابلے کے بعد ہلاک کیا ہے جبکہ بعض افراد کا کہنا ہے کہ محب شیدی ٹیاری کے جن "معززین" کا "لے پالک" تھا' خود انہوں نے اسے ہلاک کرکے رینجرز کے سپرد کر دیا۔

محب شیدی کی اس طرح اچانک ہلاکت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے پیر ۳۰ ستمبر کو ٹنڈو جام کے نزدیک جام صادق علی کے بیٹے جام معشوق علی کی گاڑی پر راکٹوں اور میزائلوں سے حملہ کیا تھا اور اس حملے میں جام معشوق تو معجزانہ طور پر بچ گئے لیکن ان کی حفاظت کرنے والے تین سپاہی عبدالعزیز میر بحر' نذر شیخ اور محمد اعظم خان ہلاک ہوگئے۔ راکٹ لانچر یا میزائل ان کی بکتر بند گاڑی پر لگا تھا' چنانچہ حکمرانوں نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کیا اور ایک دن بعد ہی ۲ اکتوبر کی شام کو قاسم رینجرز کے دفتر میں بریگیڈیئر سرفراز اخبار نویسوں کو بتا رہے تھے کہ ٹیاری کے جنگل میں کیپٹن جنید اور کیپٹن عارف کی کمپنیوں نے تین گھنٹے تک مقابلے

کے بعد محب شیدی کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کی لاش ایک ٹرک میں ڈال کر لائی گئی تھی جسے متعدد افراد سے شناخت کرا لیا گیا تھا۔ اس مقابلے میں لانس نائیک منظور زخمی ہوا اور رینجرز نے پولیس کے کسی شخص کو اپنے ساتھ شریک نہیں کیا۔ محب شیدی کے ساتھی کشتی کے ذریعے دریا پار کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور یہ بات حیران کن ہے کہ محب شیدی تو مارا گیا' لیکن اس کا ایک بھی ساتھی نہ زخمی ہوا' نہ گرفتار کیا جا سکا۔

محب شیدی نے اے ایس پی ملوک جاگیرانی سمیت پولیس اور رینجرز کے متعدد جوانوں کو ہلاک کیا تھا۔ وہ میرپور خاص روڈ پر کامارو شریف کا رہنے والا تھا اور اس کا باپ مزدوری کیا کرتا تھا' بعد ازاں وہ حیدر آباد کے نزدیک موری منگر کے علاقے میں چور کی حیثیت سے مشہور ہوا اور ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے بعد جب سندھ میں ڈکیتیوں کو فروغ ملا تو وہ ٹیاری کے بااثر سید خاندان کی پشت پناہی کے ساتھ اس علاقے کا دلیر اور خطرناک ڈاکو بن گیا۔ اس نے ڈاکو نصیر فقیر کی جگہ لے لی تھی۔ محب شیدی ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء تک قومی شاہراہ پر سرگرم ڈاکوؤں میں سب سے خطرناک ڈاکو گردانا گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محب شیدی اور اس کے ٹولے نے وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کے ہیلی کاپٹرز کو میزائل مار کر گرانے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس خبر پر سیکیورٹی پر مامور تمام لوگ چوکنا ہوگئے تھے۔

سندھی اخبار نے خبر دی ہے کہ محب شیدی کے پاس تاوان اور لوٹ مار کے ذریعے جمع کردہ رقم ۵ کروڑ کے لگ بھگ تھی اور اس رقم کو ہضم کرنے کے لیے اسے ایک دعوت میں نشہ دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ جب ڈاکو بقادار شاہ جی ایم سید کے گاؤں سن میں مارا گیا تھا' اس وقت بھی اسی انداز کی خبر آئی تھی کہ جو سیاست دان بقادار شاہ کی رقم کا حساب کتاب رکھتا تھا اور پشت پناہی کرتا تھا' اس نے رقم ہتھیانے اور دوسری طرف حکومت کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے اسے مروا دیا۔ بہرحال ان خبروں کی حقیقت تک پہنچنا اور ڈاکوؤں کی دولت کا سراغ لگانا ہم جیسے اخبار نویسوں کے بس کی بات نہیں' بلکہ یہ کام انتظامیہ کے اعلیٰ اہلکار بھی نہیں کر سکتے' تاہم

یہ بات طے شدہ ہے کہ اغوا برائے تاوان کے کاروبار اور ڈکیتیوں کے دھندے میں ہر ڈاکو کے پاس لاکھوں کروڑوں روپے جمع ہوتے ہیں' جسے وہ یقیناً جنگل میں نہیں رکھتے بلکہ اپنے پشت پناہ وڈیروں کے ذریعے بنکوں میں جمع کراتے ہیں۔

جب قاسم رینجرز کے ہیڈ کوارٹرز میں صحافیوں کو محب شیدی کی جھلک دکھائی گئی تو اس کے ہاتھ کپڑے سے ڈھانپ دیے گئے تھے۔ ایسا لگا کہ یا تو ہاتھ زخمی ہیں یا جل گئے ہیں۔ یہ کیونکر ہوا' اس کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ بہرحال محب شیدی کی لاش خود اپنی کہانی سنانے سے قاصر تھی۔

محب شیدی کی ہلاکت سے جہاں بہت سے افراد کو خوشی ہوئی' وہیں بے شمار افراد ایسے بھی ہیں جنہیں دکھ ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سیاسی وجوہ کی بنا پر حکومت سے ناراض ہیں اور حکومت کے لیے مشکل پیدا کرنے والے مزدور' طالب علم' کسان' کلرک' سیاست دان اور اخبار نویس تو کجا' چور اور ڈاکو کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو ڈاکوؤں کی کارروائیوں اور سرگرمیوں کو "قومی آزادی" کی جدوجہد کا حصہ سمجھتے ہیں اور ان کی نظروں میں دیہات کے سندھی عوام کی اذیت کے باوجود ڈاکوؤں کی حیثیت "قومی ہیروز" یا سندھ دھرتی کے سپاہیوں کی سی ہے' یہی وجہ ہے کہ جب کبھی فوج یا رینجرز کے ہاتھوں کوئی خطرناک ڈاکو مارا گیا ہے' اس پر اظہار تشکر کے بجائے اس قسم کے بیانات چھپوائے گئے ہیں "ڈاکوؤں کی آڑ میں سندھی عوام کا قتل عام بند کیا جائے"۔

ایک سندھی اخبار نے محب شیدی کی قبر کی تصویر بھی چھاپی ہے اور شکوہ کیا ہے کہ اسے ورثاء موجود ہونے کے باوجود ایدھی سینٹر والوں نے لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا۔

محب شیدی نے متعدد کارروائیوں میں راکٹ لانچر اور میزائل بھی استعمال کیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں کے پاس یہ جدید اسلحہ کس طرح آتا ہے اور خصوصاً میزائل یا راکٹ لانچر کے استعمال کی تربیت کون دیتا ہے؟

محب شیدی کی ہلاکت کے بعد جام صادق علی کا دامن تو کم از کم صاف ہوگیا ہے کہ وہ "سرکاری ڈاکو" تھا یا جام معشوق کی بھیرو میں ٹیاری سے شداد پور کے

درمیان کھلے عام گھومتا پھرتا تھا۔ یہ الزامات بڑے وثوق سے لگائے جاتے تھے' مگر جام حکومت میں محب شیدی کی ہلاکت نے ان الزامات کی صداقت کو دھو دیا ہے' تاہم ٹنڈو باگو ٹیاری کے مسلم لیگی سید خاندان کی پوزیشن شروع سے مشکوک رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس خاندان نے محب شیدی کو ایک غریب مزدور یا ہاری کی حیثیت سے اپنے پاس رکھا ہو اور بعد میں جرائم کی دنیا کا بادشاہ بننے کے بعد وہ ان کے زیر اثر نہ رہا ہو' لیکن سید خاندان نے انتظامیہ سے اخبار نویسوں تک پھیلی ہوئی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

ایک زمانہ تھا کہ سندھ میں زمینداری کا رعب داب رکھنے کے لیے چھوٹے پیمانے پر مویشی چور' رہزن اور غنڈے پالے جاتے تھے تاکہ کسی سرکش کو زمیندار کی قلمرو میں سر اٹھانے کی جرات نہ ہو' مگر بعد میں جب سیاسی رعب داب کے لیے ایسے افراد کی ضرورت پڑنے لگی تو مویشی چور اور معمولی نوعیت کے غنڈے بھی ڈاکو بن گئے اور طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جانے لگا کہ فلاں وڈیرے کے پاس کتنے ڈاکوؤں کا ٹولہ ہے۔

۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی تحریک کے بعد وڈیروں نے ڈاکوؤں کو بساط سیاست پر شطرنج کے مہروں کی طرح آگے بڑھایا اور پیچھے ہٹایا۔ افسوس یہ ہے کہ حکومت اپنی مصلحتوں کے سبب اس حقیقت کا ادراک کرنے کے باوجود کوئی دیرپا حل نہ ڈھونڈ سکی۔ آٹھ سال کے عرصے میں ہزاروں افراد تہ تیغ کر دیے گئے اور کروڑوں روپے کی رقم تاوان میں دی گئی۔ یہاں تک کہ لین دین میں انتظامیہ کے اہلکار ملوث ہونے لگے۔

آج کے سندھ میں ڈاکوؤں کا مسئلہ جس قدر تشویش ناک اور سنگین ہے' اس کا احساس شاید سب کو ہے لیکن کوئی قابل عمل حل کی راہ پر قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں لہٰذا محب شیدی کی ہلاکت خوش آئند ہونے کے باوجود خوش فہمی کا عنوان نہیں' کیونکہ بساط سیاست پر وہ ایک مہرے کی طرح آگے بڑھایا گیا تھا' جب اس کی ضرورت نہ رہی یا کردار ختم ہوگیا تو پیچھے ہٹا لیا گیا تاکہ کوئی نیا مہرہ اس کی جگہ لے سکے۔

(اکتوبر ۱۹۹۱ء)

("تحریر و تصویر" ص ۳۸)

—————— (٦) ——————

بدنام ڈاکو عباس خاص خیلی کی ہلاکت

حیدر آباد کا تعلقہ ٹنڈو الہ یار ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے۔ گزشتہ دو تین سال کے دوران یہاں سرگرم ڈاکوؤں کے مختلف ٹولوں نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ صرف ایک سال کے عرصے میں ایک ڈی ایس پی اور ایک ایس ایچ او سمیت ایک سو سے زیادہ افراد ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ بیسیوں باغ اجاڑ دیے گئے، سینکڑوں افراد کو اغوا کیا گیا اور ڈاکوؤں نے جب اور جس وقت چاہا، بے گناہ اور معصوم لوگوں کو نشانہ بنایا۔ محتاط اندازے کے مطابق یہ علاقہ ۵۰ فیصد سے زائد غیر آباد ہو چکا ہے۔ لوگوں نے اپنی زرعی زمینوں اور باغات پر جانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ مسلسل شہروں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ ٹنڈو الہ یار میں ڈاکوؤں کی سرگرمیوں نے میرپور خاص حیدر آباد روڈ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس مصروف شاہراہ پر رات کے وقت ٹریفک بالکل بند رہتی ہے اور دن میں بھی لوگ انتہائی ضرورت کے تحت سفر کرتے ہیں۔

۷ جون کو اس علاقے کا بدنام ڈاکو عباس خاص خیلی مارا گیا، جبکہ اس کے دو ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ اس ڈاکو کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر دس لاکھ روپے انعام مقرر تھا۔ یہ ڈاکو اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی کے رکن قومی اسمبلی عبدالستار بچانی کے بنگلے پر مقیم تھا اور اس کی ہلاکت اور اس کے ساتھیوں کی مذکورہ بنگلے سے گرفتاری کا نظارہ ٹنڈو الہ یار کے سینکڑوں لوگوں نے کیا۔ پولیس نے ڈاکو عباس خاص خیلی کے ساتھ عبدالستار بچانی کے کزن اسلم بچانی کو بھی پکڑا، لیکن "خفیہ ہاتھوں" نے سرکاری کاغذات میں نہ صرف اسلم بچانی کو بچا لیا ہے، بلکہ عبدالستار بچانی کی "عزت" بھی بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پولیس نے اسسٹنٹ کمشنر اور مختار کار کی ہدایت پر ایف آئی آر میں مقابلہ عبدالستار بچانی کے بنگلے کے بجائے سڑک پر

دکھایا ہے اور اسلم بیجانی کا نام بھی ملزمان میں درج نہیں کیا ہے۔

عباس خاص خیلی کو تقریباً ڈیڑھ' دو بجے دن ہلاک کیا گیا اور اسی شام کو چار بجے وائرلیس پر ایس ایچ او انسپکٹر حیدر بخش کھوسو کے ٹرانسفر کے احکامات آ گئے۔ اس کی جگہ ایک سب انسپکٹر کو' جو سکھر رینج سے آیا ہے ایس ایچ او بنا دیا گیا ہے۔

ٹنڈو الہ یار میں ڈکیتیوں اور اغوا کے کاروبار کا سب سے بڑا سرغنہ بچل پل ہے۔ عبدالستار بیجانی اور لطیف منگریو اس کے "شاگرد" ہیں کیونکہ بچل پل کا گاؤں دیہہ پاک سنگھاڑ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا اور محفوظ مرکز ہے اور یہاں کے قبرستان میں ڈاکو یکجا ہو کر زمینداروں کے نام خطوط لکھتے ہیں اور انہیں تقسیم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ "ڈاک خانے" کے طور پر استعمال ہونے والے اس قبرستان سے جب ایک زمیندار کو چٹھی پہنچائی جاتی ہے تو ساتھ ہی چار پانچ دیگر زمینداروں کے نام چٹھیاں بھی اسے پہنچانے کا پابند کر دیا جاتا ہے—— بچل پل کی "پتھارے داری" ایک عرصے سے جاری ہے' جبکہ عبدالستار بیجانی کو صوبائی وزارت کے زمانے میں عروج حاصل ہوا۔ بچل پل اور لطیف منگریو مخدوم خاندان کے آدمی کہلاتے ہیں اور انہوں نے اس علاقے سے مخدوم خلیق کو جتوانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

عبدالستار بیجانی کا بنگلہ ٹنڈو الہ یار شہر میں رینجرز کے ہیڈ کوارٹر کے نزدیک ہے' لیکن سرکاری وسائل کے استعمال اور عبدالستار بیجانی کی لیڈری کے سبب ڈاکوؤں کو کبھی یہاں آنے جانے میں پریشانی نہیں ہوئی۔

عباس خاص خیلی ۷ جون کو مارے جانے سے قبل اسلم بیجانی کے ساتھ پجارو میں کراچی گیا تھا۔ پجارو سندھ میں انتظامی قوت اور سیاسی طاقت کا نشان ہے' لہٰذا عام طور پر شاہراہوں پر اسے چیک کرنے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔ کراچی میں عباس خاص خیلی کی ملاقات سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے کرائی گئی اور یہ بدنام ڈاکو ملک کی ایک ممتاز سیاست دان اور سابق وزیر اعظم سے خصوصی ہدایتیں لے کر اسی صبح عبدالستار بیجانی کے بنگلے پہنچا۔ بدقسمتی سے رینجرز کا ایک مخبر کئی روز سے بنگلے کی نگرانی کر رہا تھا' اس نے رینجرز کو بتا دیا کہ بنگلے میں ہوٹل سے کھانا گیا ہے اور یہاں عباس

خاص خیلی اپنے دو ساتھیوں اور میزبان اسلم بچانی کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے' لہٰذا پولیس کے لیے کوئی "راہ فرار" کا موقع نہ تھا اور وہ عباس خاص خیلی کے مقابلے پر آ گئی۔ عباس خاص خیلی نے ہاتھ اٹھا کر اور مجبوراً فائر نہ کر کے' کہ اس کی کلاشنکوف فاصلے پر تھی' خود کو بچانے کی کوشش کی' لیکن پولیس نے فائرنگ کر کے اسے وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس اسلم بچانی کو بھی اسی طرح ہلاک کر رہی تھی کہ مختار کار نے اسے روک دیا۔ اگر رینجرز درمیان میں نہ ہوتی' تو شاید پولیس مقامی حکام کی بچانی سے دوستیوں کے سبب عباس خاص خیلی سے مقابلے پر نہ آتی' بلکہ اسے نکل بھاگنے کا موقع فراہم کر دیتی۔ اب مقامی حکام اور ان کے پشت پناہوں کی طرف سے اسلم بچانی اور عبدالستار بچانی کو محفوظ رکھنے کی کوششیں کاغذات میں ہو رہی ہیں' جس کا ثبوت ایف آئی آر ہے' حالانکہ عباس کی ہلاکت کا پورے ٹنڈو الہ یار کو علم ہوچکا ہے' کہ وہ کہاں ہوئی ہے' کیونکہ فائرنگ کے سبب لوگ جمع ہو گئے تھے۔

پیپلز پارٹی کا ایم پی اے غنی درس بھی عبدالستار بچانی کی طرح ڈاکوؤں سے روابط کے لیے مشہور ہے۔ گزشتہ دنوں شور مچا تھا کہ ڈاکوؤں نے غنی درس کا باغ اجاڑ دیا ہے۔ یہ صرف "مشہوری" کے لیے تھا' تاکہ اسمبلی میں شور مچایا جا سکے اور یہ باور کرایا جا سکے کہ ڈاکو ہم کو بھی نہیں بخشتے۔ حقیقت یہ ہے کہ باغ اجڑوایا گیا تھا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے آپ کو زدوکوب کرنے کا ڈرامہ کرتا ہے' اسی طرح باغ اجاڑنے کا کام ہلکے ہاتھ سے ہوا تھا' چنانچہ پبلسٹی بھی ہوگئی اور نقصان بھی نہیں ہوا۔

ٹنڈو الہ یار کے بارے میں ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ یہ اہم جغرافیائی اہمیت کا حامل ہے اور یہاں لاقانونیت کا مطلب کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ ٹنڈو الہ یار سے میر واہ روڈ کے ذریعے بھی یہ تعلقہ میرپور خاص سے مل جاتا ہے اور وہاں سے بھارتی سرحد تک اپروچ مشکل نہیں ہے' چنانچہ ڈاکوؤں کو اسلحہ اور ٹرانسپورٹ فراہم کرنے والے پتھاریداروں کے بھارتی تخریب کاروں سے تعلقات بھی خارج از امکان نہیں ہیں۔ عباس خاص خیلی سے اسلم بچانی کی معرفت بے نظیر بھٹو کی ملاقات اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ سندھ کی سیاست میں ڈاکوؤں کا رول پس پردہ مستحکم مقام بنا رہا ہے۔

ٹنڈو الہ یار ہی پر موقوف نہیں' سارے سندھ میں ایف آئی آر کا اندراج اثر و رسوخ اور دباؤ کے تحت ہوتا ہے' لٰہذا جرائم کی شرح کا صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ خود اعلٰی پولیس افسران کو اپنی سپاہ پر بھروسہ نہیں رہا۔ آئی جی' ڈی آئی جی' ایس ایس پی کے علاوہ ڈپٹی کمشنرز اور کمشنرز حضرات بطور گارڈ فرنٹیئر کانسٹیبلری یا رینجرز کو استعمال کر رہے ہیں۔ ابتداء میں ہم نے ہلاک ہونے والوں میں ایک ڈی ایس پی اور ایک ایس ایچ او کا ذکر کیا ہے۔ یہ ڈی ایس پی شبیر تنیو تھا' جو چند ماہ قبل مارا گیا' جبکہ ٹنڈو الہ یار کے نزدیک ایس ایچ او معین قادر بخش کھوسو کو ڈاکوؤں نے حال ہی میں نشانہ بنایا۔ قادر بخش کھوسو کی ہلاکت کے بعد مسن' پیارولنڈ' عمرسانہ اور ٹنڈو الہ یار تھانوں کی پولیس نے سڑک پر گشت بند کر دیا ہے۔

عباس خاص خیلی کی ہلاکت کے بعد اس کے بھائی حسین خاص خیلی نے اپنے ٹولے کی قیادت سنبھال لی ہے۔ چند روز قبل اس نے زمیندار سردار پنجابی کو چٹھی لکھی کہ دس لاکھ روپے پہنچانے کا بندوبست کرو' ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس نے رابطہ کرنے والے سے رقم دینے کی ہامی بھر لی اور بندوبست کر لیا کہ آنے والوں کو بخشا نہیں جائے گا' چنانچہ شام کے وقت دیدہ دلیری سے جب دو آدمی رقم لینے آئے تو سردار پنجابی نے گاؤں والوں کی مدد سے انہیں پکڑ لیا۔ نصف میل تک کھیتوں میں تعاقب کے بعد انہیں پکڑا گیا اور اس کارروائی میں درجنوں افراد نے حصہ لیا' لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب انہیں پولیس کے سپرد کیا گیا تو پولیس نے ایف آئی آر درج نہیں کی۔

۸ جون کو "عبرت" نے عباس خاص خیلی کی ہلاکت پر جو خبر شائع کی تھی' اس کو ملاحظہ کریں کیونکہ اس خبر میں سچائی کے بہت سے اشارے موجود ہیں۔ "عبرت" کے مطابق "یہاں کی مقامی پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان سخت مقابلے میں ڈاکوؤں کا سرغنہ حاجی عباس خاص خیلی مارا گیا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ ٹنڈو الہ یار کے ایک بااثر شخص اور دو ڈاکوؤں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ حاجی عباس ۴۰ ایکڑ زمین کا مالک کہا جاتا ہے۔ وہ ۴۰ سے زیادہ سنگین جرائم میں ٹنڈو الہ یار پولیس کو مطلوب تھا۔ حال ہی میں اس نے شاہ پور یونین کونسل کے چیئرمین حاجی خان ببر کو قتل کیا تھا۔ اس کا ایک بھائی

پولیس میں ملازم بتایا جاتا ہے۔ حاجی عباس کی موت کے بعد ٹنڈو الہ یار میں ظلم اور بربریت کا ایک باب ختم ہوگیا۔ حاجی عباس کی لاش دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد تھانے میں جمع ہوگئے تھے"۔

"عبرت" نے اس کے بعد حیدر آباد کے رپورٹر کے حوالے سے لکھا ہے "خطرناک ڈاکو عباس خاص خیلی' جس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر ۱۰ لاکھ روپے انعام مقرر تھا' پولیس کے ہاتھوں سخت مقابلے میں مارا گیا۔ اس کی لاش کے ساتھ ایک کلاشنکوف اور چھ سو راؤنڈ بھی ہاتھ آئے۔ اس کے دو ساتھی جیون کاتیار اور بزاری مینگھواڑ' ڈبل بیرل کی دو بندوقوں اور کارتوسوں سمیت گرفتار کر لیے گئے۔ یہ مقابلہ مہران شوگر ملز کے نزدیک سلیم بچانی کے فارم پر ہوا۔ پولیس کے مطابق ڈاکوؤں نے اس جگہ پناہ لے رکھی تھی۔ ٹنڈو الہ یار پولیس نے بچانی خاندان کی ایک اہم شخصیت کو پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لیا ہے"۔ (جولائی ۱۹۹۱ء)

ڈاکوؤں کے ۳۰ خطوط نے ۲۰۰ دیہات خالی کرا دیے

عباس خاص خیلی کے ساتھ پکڑے جانے والے اس کے میزبان اسلم بچانی کو جس طرح بچانے کی کوشش کی گئی ہے' وہ انتہائی شرمناک ہے۔

اب عباس خاص خیلی کا بھائی حسین خاص خیلی سرگرم ہوچکا ہے اور ہم نے گزشتہ رپورٹ میں تذکرہ کیا تھا کہ اس نے زمیندار سردار پنجابی کو تاوان کے لیے چٹھی لکھی تھی۔ اب اسی ڈاکو نے دوسرے دو ڈاکوؤں شریف کالرو اور محبوب مزاری کے ساتھ صوبیدار حاجی رمضان مغل کو ۵ لاکھ روپے تاوان کی چٹھی بھیجی ہے' بصورت دیگر گاؤں پر راکٹ لانچر کے ساتھ حملہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔

صوبیدار حاجی رمضان مغل کا گاؤں ٹنڈو الہ یار شہر سے صرف تین میل کے فاصلے پر ہے اور کوئی ادارہ' کوئی ایجنسی' کوئی فورس ان کی حفاظت سے قاصر ہے۔

قبل ازیں ڈاکو رمضان کالرو عرف برسات نے بھی رمضان مغل کو ۵ لاکھ روپے تاوان کی چٹھی بھیجی تھی اور ساتھ ہی مروجہ طریقے پر کئی دوسری چٹھیاں دیگر زمینداروں کو پہنچانے کی ہدایت کی تھی۔

۱۳ جولائی کو میرواہ روڈ کے نزدیک زمیندار بشیر میمن کے ہاری گیلا کولہی کے

گاؤں پر ڈاکوؤں کے ایک بڑے گروہ نے دھاوا بولا اور تین گھنٹے تک زبردست فائرنگ کی۔ جس وقت فائرنگ جاری تھی' ایس ایچ او ٹنڈو الہ یار کو اطلاع دی گئی' لیکن وہ گاڑی میں بیٹھ کر دوسری طرف نکل گیا۔ گیلا کولہی کے گاؤں کو لوٹنے اور ایک بندوق لے جانے کے علاوہ ڈاکو اسے دوسرے زمینداروں کو ۳۰ چٹھیاں پہنچانے کا پابند کر گئے۔ پہلے جسے لوٹا جاتا تھا اسے اردگرد کے ایک دو زمینداروں کو تاوان کے لیے خطوط پہنچانے کا پابند کیا جاتا تھا' مگر اب ان خطوط کی تعداد درجنوں میں ہوتی ہے۔

جب گیلا کولہی کو ڈاکوؤں نے ۳۰ چٹھیاں دیں تو اس کے بعد اردگرد کے علاقے میں سراسیمگی پھیل گئی اور میلوں تک کے علاقے میں کام کرنے والے مزدور اور ہاری جان کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق ۳۰ دھمکی آمیز خطوط نے ۲۰۰ دیہات خالی کرا دیے ہیں۔

گزشتہ دنوں ڈاکوؤں نے ٹنڈو الہ یار کے زمینداروں اور باشندوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے نصیر کینال کا پشتہ توڑ دیا تھا۔ اب پھر انہوں نے دھمکی دی ہے کہ ہم نہر کا پشتہ توڑ دیں گے۔

غرض صورت حال یہ ہے کہ ٹنڈو الہ یار تعلقہ پوری طرح ڈاکوؤں کی گرفت میں ہے اور وہاں ان کا پوری طرح راج ہے۔ اس منفعت بخش کاروبار میں ایسے ایسے افراد شریک ہوگئے ہیں اور ڈاکو کہلانے لگے ہیں کہ جن کی وضع قطع اور جسمانی حالت کو دیکھ کر بندوق بھی شرماتی ہے' لیکن پولیس' انتظامیہ اور وڈیروں نے مل کر انھیں "خطرناک ڈاکو" بنا دیا ہے اور ان "خطرناک ڈاکوؤں" کا دل اتنا کھل چکا ہے کہ اب وہ حجامت بنوانے' چمپی کرانے' چائے پینے' ریکارڈنگ سننے' تاوان کے لیے لکھی گئی چٹھیوں کی کارگزاری معلوم کرنے اور اپنے اہل و عیال سے ملنے کے لیے ٹنڈو الہ یار شہر میں کھلے عام آتے اور جاتے ہیں' ہتھیار لیے گھومتے پھرتے ہیں۔ (اگست ۱۹۹۱ء)

("تحریر و تصویر" ص ۳۶-۳۷)

(۷)

نہ شہر میں امان' نہ دیہات میں پناہ

یکم مارچ کو لطیف آباد کے یونٹ نمبر ۴ اور ۵ میں پولیس اور مشتعل افراد کے درمیان مسلح تصادم نے بھی کرفیو کے نفاذ کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اس علاقے میں پے درپے چوری کی وارداتوں پر علاقے کے لوگ احتجاج کر رہے تھے۔ وہ اس علاقے میں لاقانونیت اور چوریوں کا ذمہ دار پولیس کو سمجھتے ہیں۔ لطیف آباد کو دو تھانوں کی حدود میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یونٹ نمبر ۴ اور ۵ کے علاقے تھانہ سیکشن بی کے زیر انتظام ہیں۔ مظاہرین سے جب اس تھانے کے ایس ایچ او خورشید احمد اور پولیس فورس نے روایتی انداز سے نمٹنے کی کوشش کی تو صورت حال بگڑ گئی۔ لاٹھی پتھر کا زمانہ اب گزر چکا ہے' گولی کے جواب میں گولی آتی ہے' چنانچہ ایک اطلاع کے مطابق دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی۔ پولیس نے اپنے ایس ایچ او کو بچانے کے لیے' جنہیں مظاہرین نے گھیر کر خنجروں سے مارا تھا اور اس حملے میں اس کی آنکھ ضائع ہونے کا اندیشہ ہے' بری طرح فائرنگ کی اور آنسو گیس استعمال کی۔ مظاہرین میں سے تقریباً ۱۵ افراد زخمی ہوئے' جن میں سے ایک شدید زخمی محمد اقبال کراچی کے ہسپتال پہنچ کر دم توڑ بیٹھا۔ اس نوجوان کی دوسرے دن جمعہ کو اس وقت تدفین ہوئی' جب حکام کی مداخلت پر پولیس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔

چوریوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پولیس سے عوام کا متصادم ہو جانا اور جان دینے اور لینے پر اتر آنا اس بات کا غماز ہے کہ مفلسی میں آٹا کتنا گیلا ہے۔ ایک تو کرفیو زدگی' کساد بازاری' بے رونقی اور معاشرتی زبوں حالی' دوسرے چوریاں' ڈکیتیاں اور لوٹ مار' گویا مرے کو مارے شاہ مدار۔

۲۴ فروری کو اخبار میں دوسرے دن شائع شدہ خبروں کے مطابق گاڑی کھاتہ میں ایک صراف کے گھر ڈکیتی ہوئی اور چار لاکھ روپے مالیت کا سونا چاندی لٹ گیا۔

۲۸ فروری کو تلک چاڑی پر باغبان جیولرز میں ڈکیتی کی خبر آئی جبکہ بیراج کالونی میں چار مسلح افراد نے ایک شخص محمد علی قریشی کے گھر کا صفایا کر دیا۔ یہ مہران

یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔

یکم مارچ کو شناختی کارڈ دفتر کی تنخواہ کے ایک لاکھ ۶۵ ہزار روپے تین موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے لوٹ لیے۔ یہ واقعہ لطیف آباد کے آٹو بھان روڈ پر پیش آیا۔ لیاقت کالونی میں بنک سے تین مسلح افراد نے تین لاکھ ۳۵ ہزار روپے کی نقدی لوٹ لی اور چوکیدار کی بندوق بھی لے گئے۔ لطیف آباد نمبر ۷ میں پوسٹ ماسٹر جنرل آفس کی تنخواہ لے جانے والوں سے اسلحہ کے زور پر ایک لاکھ ۱۸ ہزار روپے کی رقم کا تھیلا چھین لیا گیا۔

۳ مارچ کو محکمہ آبپاشی کے عملے کی تنخواہوں کے سات لاکھ ۴۲ ہزار روپے لٹ گئے۔ یہ واردات بیراج کالونی میں ہوئی' جہاں دونوں ڈاکو اطمینان سے پیدل چل کر واپس گئے۔ اسی روز ملک لعل خان کے پٹرول پمپ پر ڈکیتی ہوئی' لیکن عملے کی چابک دستی اور پولیس کی بروقت ناکہ بندی کے سبب ملزمان چوری کی کار اور لوٹی ہوئی رقم (ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپے) سمیت پکڑے گئے۔ ۴ مارچ کو سپرہائی وے پر حیدر آباد سے کراچی جانے والی کوچ کے مسافروں کو تین مسلح افراد نے لوٹ لیا اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی نقدی اور زیورات لے اڑے۔ ۵ مارچ کو رسالہ روڈ پر ایک ڈرگ سٹور سے ۳۵ ہزار روپے لوٹ لیے گئے۔

۶ مارچ کو ۵ مسلح افراد نے شاہی بازار میں یو بی ایل کو لوٹ لیا۔ ڈاکوؤں نے بنک کے چوکیدار کی بندوق چھین کر توڑ دی اور اطمینان سے چار لاکھ پندرہ ہزار روپے سمیٹ کر پیدل روانہ ہوگئے۔ اس مصروف بازار میں' جہاں پیدل چلنا محال ہوتا ہے' نہ انہیں کوئی پکڑنے والا پہنچا اور نہ وہ کسی مزاحمت سے خوفزدہ ہوئے۔

یہ تو شہر حیدر آباد کا حال ہے' آیئے اس عرصہ میں بقیہ سندھ کا حال بھی دیکھتے ہیں۔ کشمور سے خبر ہے کہ ایک مسافر ویگن کے ۵ پنجابی مسافروں کو لوٹنے کے بعد ان سے جئے سندھ اور "سندھو دیش" کی حمایت میں نعرے لگوائے گئے۔ تعلقہ حیدر آباد میں موری منگر کے مقام پر ڈاکوؤں نے مسافر گاڑیوں کو لوٹا۔

۲۵ فروری کو تین ڈاکوؤں نے نیو سعید آباد میں ایک پٹرول پمپ کو لوٹ لیا۔ مورو میں ڈاکوؤں نے مشتاق ارائیں اور بشیر ارائیں کو اغوا کر لیا۔

۲۶ فروری کو جوہی کے ایک گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر کے چار افراد کو ہلاک کر دیا۔ رتو ڈیرو میں ڈاکٹر بھگوان داس اور نارائن داس کے اغوا کے خلاف ہڑتال رہی۔

۲۷ فروری کو سہون کے نزدیک گاؤں سے ڈاکوؤں نے حبیب اللہ اور محمد صالح کو اغوا کر لیا۔ ڈھرکی میں زمیندار چودھری محمد اسحاق کو اغوا کر لیا گیا۔ سکرنڈ کے نزدیک ڈاکوؤں کے ایک ٹولے نے ڈاٹسن پک اپ میں سوار مسافروں کو لوٹ لیا۔

میہڑ کے نزدیک رادھن میں مسلح افراد نے سید ثمن شاہ کے گھر میں داخل ہو کر تین عورتوں اور ایک مرد کو ہلاک کر دیا۔ سکھر میں شاہی بازار کے علاقے میں چار مسلح افراد نے سپاہی سے سرکاری کلاشنکوف چھین لی۔ ٹنڈو الہ یار کے علاقے میں تاوان کی وصولی کے لیے ڈاکوؤں نے تین باغات کاٹ دیے اور دو ٹرانسفارمر تباہ کر دیے۔ سہون میں ایک گاؤں سے کالج کے لیکچرار عبدالقدوس چنا اور ان کے بھائی کو اغوا کر لیا گیا۔ اغوا سے قبل ڈاکوؤں نے گھر میں لوٹ مار بھی کی۔ چھ مسلح افراد نے سجاول ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین سید شفیق احمد سمیت متعدد مسافروں کو بھورو روڈ پر لوٹ لیا۔ ہیلجی کے نزدیک گاؤں سے ڈاکوؤں نے دو افراد عبدالستار پنہور اور عبدالحمید پنہور کو اغوا کر لیا۔

یکم مارچ کو ٹنڈو الہ یار میں تاوان ادا نہ کرنے والے زمیندار علیم قائم خانی کا باغ ڈاکوؤں نے اجاڑ دیا۔ جھڈو کے نزدیک ہمزاؤ پر ڈاکوؤں نے ایک شخص کو درخت سے باندھ دیا اور اس کی جیپ لے گئے۔ کنڈیارو سے محمد حسین میمن کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا۔ لاڑکانہ میں چار مسلح افراد نے چوری پر مزاحمت کرنے کے سبب ۲۲ سالہ نوجوان عبدالوہاب کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ خیرپور میں دن دہاڑے ڈکیتی ہوئی' تاجر اقبال شیخ کے گھر میں گھس کر تین مسلح افراد نے خاتون خانہ کو زخمی کرنے کے بعد پچاس ہزار روپے کے زیورات اور ۲۶ ہزار روپے کی نقدی لوٹ لی۔ ڈاکوؤں میں سے جب ایک نوجوان عرض محمد محلے والوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا' تو وہ شاہ لطیف یونیورسٹی کا طالب علم نکلا۔ ممتاز سندھی ادیب الطاف شیخ کے بھائی اشفاق شیخ ۱۸ روز بعد ڈاکوؤں کی قید سے رہا ہو کر جب گھر واپس پہنچے' تو انہوں نے اظہار تشکر کے لیے ہالہ میں مخدوم طالب المولیٰ سے ملاقات کی۔ انہوں نے بتایا کہ اغوا کرنے والے یونیورسٹی

کے طالب علم تھے۔ مورو میں ڈاکوؤں نے اغوا میں ناکامی پر طالب حسین آرائیں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ سٹھ میل کے علاقے سے تین نوجوانوں اعجاز علی' ممتاز علی اور صادق علی کو اغوا کر لیا گیا۔ ۳ مارچ کو تھبر سے ڈاکوؤں نے واپڈا کے تین ملازمین کو پک اپ سمیت اغوا کر لیا۔ میرپور خاص روڈ پر سات ڈاکوؤں کے ایک ٹولے نے حبیب بنک کے مینجر محمد صدیق اور ہائی ویز کے افسر مسعود احمد کو اغوا کر لیا' جبکہ ٹنڈو فضل سے زمیندار محمد موسیٰ کو اغوا کر لیا گیا۔ لاڑکانہ کے نزدیک باڈہ شہر سے زبردست یلغار کر کے چھ افراد کو اغوا کر لیا گیا۔ نصیر آباد روڈ پر بلیو لائن کوچ کو لوٹ لیا گیا۔ دوسری واردات لاڑکانہ ریلوے سٹیشن پر ہوئی' جہاں ڈاکوؤں نے ایک نوجوان غلام علی ویسر کو ہلاک کر دیا' جبکہ تیسری واردات میں محمد اسمٰعیل شیخ کو اغوا کر لیا گیا۔ جب شہریوں نے بطور احتجاج موہنجوڈرو روڈ بند کی' تو پولیس نے اسے کھلوانے کے لیے ہوائی فائرنگ کی اور آنسو گیس پھینکی۔ میہڑ کے نزدیک چار مسلح افراد نے انڈس ہائی وے بلاک کر کے مسافر گاڑیوں کو لوٹا۔

۶ مارچ کو مہران ہوٹل خیرپور کے مالک حفیظ اللہ میمن کو اغوا کر لیا گیا۔ قاضی احمد کے نزدیک ڈاکوؤں نے ایک زمیندار محمد یوسف کو اغوا کر کے گولی مار دی۔ اس واقعہ پر قاضی احمد میں ہڑتال رہی۔

اغوا' ڈکیتی' ہلاکت کا یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور اخبارات روزانہ ایسی وحشت ناک خبروں سے بھرے رہتے ہیں۔ ۷ مارچ کو عوامی ایکسپریس کو نواب شاہ اور روہڑی کے درمیان لوٹنے کی کوشش اور ۸ مارچ کو دادو کے علاقے میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں بہیمانہ انداز سے دو درجن افراد کی ہلاکت جیسی خبریں اکثر و بیشتر آتش وحشت کو بھڑکا دیتی ہیں۔

سندھ ان دنوں جس انداز کی کیفیت سے دوچار ہے اور تشدد کی لہر (Wave of Violence) نے سندھ کی زندگی کے ہر شعبے کو جس طرح متاثر کیا ہے' اس کے نتیجے میں کیا ہم کسی انقلاب سے دوچار ہونے والے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؟ (مارچ ۱۹۹۰ء)

("تحریر و تصویر" ص ۵۴ - ۵۵)

شہری ڈاکو

ایک زمانہ تک صرف جنگل ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گھنے جنگلوں میں ان کے لیے محفوظ جگہ تلاش کرنا اور پولیس یا فوج سے دور رہنا آسان تھا۔ جنگل میں رہتے رہتے وہ اس کے چپہ چپہ سے واقف ہو جاتے تھے اور اس طرح خود کو ہر قسم کے حملوں اور خطروں سے محفوظ رکھتے تھے۔ ابھی بھی ڈاکوؤں کے کچھ گروہ اس لیے جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ہوتی ہے کہ چونکہ وہ مہذب معاشرہ سے باغی ہوگئے ہیں اس لیے وہ ان لوگوں میں نہیں رہ سکتے۔ شہر ان کے لیے دشمنوں کا علاقہ ہو جاتا ہے کہ یہاں وہ لوٹ مار کرنے اور انتقام لینے آتے تھے اور پھر واپس جنگلوں اور پہاڑوں میں مہذب دنیا سے دور چلے جاتے تھے۔ یہ ایک روایتی ڈاکو کا طریقہ کار تھا مگر اب روایتی ڈاکوؤں کے ساتھ ساتھ شہری اور مہذب ڈاکو بھی وجود میں آ گئے ہیں اور شہروں میں رہنے کی وجہ سے ان کا طریقہ کار اور سوچنے کا انداز جدا ہے۔

ایک لحاظ سے اب بڑے بڑے شہر بھی جنگلوں کی طرح ہوگئے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور نئی نئی بستیوں نے شہر کے اس روایتی ڈھانچہ کو بدل کر رکھ دیا ہے کہ یہاں محلے والے ایک دوسرے سے واقف ہوتے تھے۔ اب خصوصیت سے پلازہ اور فلیٹوں کی تعمیر نے شہر کو اس طرح سے گنجان بنا دیا ہے کہ جیسے جنگل' اس لیے شہری ڈاکوؤں کے لیے شہر میں چھپنے اور پناہ حاصل کرنے کے ایسے ہی محفوظ علاقے ہیں کہ جیسے جنگل میں۔ یہ صورت حال کراچی میں ہے کہ یہاں فلیٹوں کے جنگل آباد ہیں اور اگر

یہاں کوئی پناہ لے لے تو پولیس کی پہنچ سے ایسے ہی دور ہو جاتا ہے جیسے جنگل میں۔

ان پناگاہوں کے ساتھ ساتھ پولیس اور ڈاکوؤں کے روایتی تعلقات یہاں بھی ہوتے ہیں جو ان کو قانون کی گرفت سے دور رکھتے ہیں۔ شہری ڈاکوؤں اور جنگلوں کے ڈاکوؤں میں فرق یہ ہے کہ شہری ڈاکو سماجی' سیاسی یا معاشی دباؤ سے اس طرح مجبور ہو کر ڈاکو نہیں بنتے کہ جیسے جنگل والے ڈاکو۔ ان میں سے اکثر یقیناً وہ ہوتے ہیں کہ جو بیروز گار ہوتے ہیں مگر ساتھ میں خوش حال گھرانوں اور تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس پیشہ کو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس طرح سے بہت دولت آسانی سے مل جاتی ہے کہ جس سے وہ اپنی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ اس لیے شہری ڈاکو کے لیے پیسہ کی قدر ہوتی ہے' وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے اور غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ اکثر صورتوں میں پیسہ کو بینک میں رکھ کر محفوظ بھی کرلیتا ہے۔

دونوں قسم کے ڈاکوؤں نے پیسہ حاصل کرنے کے لیے اغواء برائے تاوان کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں ان کے لیے زیادہ خطرے ہوتے ہیں مگر انہیں یہ بھی امید ہوتی ہے کہ وہ اس طرح سے زیادہ پیسہ جلدی حاصل کر سکیں گے۔

شہری ڈاکو چونکہ زیادہ تربیت یافتہ نہیں ہوتے اس لیے یہ ڈاکہ کے وقت اعصابی تناؤ کا شکار ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ خطرے' خوف اور اضطراری حالت میں فوراً قتل بھی کر دیتے ہیں۔ اکثر حالات میں شہری ڈاکوؤں کے وہ گروہ جو زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں' جن کا جنگل کے ڈاکوؤں سے بھی رابطہ ہو جاتا ہے اور وہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ پولیس کے تعاون کے ساتھ ساتھ شہری ڈاکوؤں کو بھی سیاستدانوں اور بااثر افراد کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور یہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی کرتے ہیں۔

ان ڈاکوؤں کے علاوہ شہروں میں ڈاکوؤں کی ایک اور قسم بھی ہے کہ جو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کی شخصیت میں ڈاکو' ٹھگ اور چور تینوں کی شخصیتیں مل جاتی ہیں اور یہ مختلف حیلے و بہانوں سے اپنے منصوبے بناتے ہیں کہ لوگ رضاکارانہ طور پر ان کے پاس پیسہ لے کر آتے ہیں۔ مثلاً کراچی میں ایک زمانہ میں انویسٹ مینٹ (Investment) کمپنیاں کھلنا

شروع ہوئیں جنہوں نے لوگوں سے بہت زیادہ انٹریسٹ پر روپیہ لینا شروع کیا اور پھر ایک خاص مرحلہ پر پہنچ کر یہ ساری کمپنیاں غائب ہوگئیں۔ یہی کچھ صورت حال پنجاب میں.کوآپریٹو کمپنیوں کی صورت میں ظاہر ہوئی اور لوگوں کا پیسہ لے کر یہ سب غائب ہوگئے۔

ڈاکہ زنی کی یہ وارداتیں اکثر ہاؤسنگ سوسائٹیز اور فلیٹوں کے سلسلہ میں ہوتی ہیں جہاں پیسہ لینے کے بعد یہ پارٹیاں روپوش ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام کارروائی قانونی طور پر اشتہارات کے ذریعہ ہوتی ہے اور پھر ان پر بعد میں کوئی قانونی گرفت بھی نہیں ہوتی۔

ڈاکوؤں کی ایک اور قسم جو سامنے آئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو بنکوں سے قرض لے کر واپس نہیں کرتے یا جو ٹیلیفون' بجلی اور گیس کے واجبات ادا نہیں کرتے یا انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کی چوری کرتے ہیں۔ یہ سب ہمارے معاشرے کے بااثر لوگ ہیں' جن میں بڑے بڑے زمیندار' صنعت کار اور سیاستدان آتے ہیں۔

اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو ان میں اور دوسرے ڈاکوؤں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا سوائے ایک بات کے کہ ڈاکو خود کو ڈاکو سمجھتا ہے اور جرم کے بعد وہ لوگوں کی نظروں سے روپوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں جرم کا احساس ہوتا ہے اور اکثر اس جرم کی سزا میں وہ مارا بھی جاتا ہے یا سزایاب ہوتا ہے اور معاشرہ کی نگاہوں میں حقیر ہوتا ہے مگر یہ قانونی اور مہذب ڈاکو نہ تو اپنے جرم کو جرم سمجھتے ہیں' نہ ہی روپوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے اعمال پر پشیمان ہوتے ہیں بلکہ پوری عزت کے ساتھ معاشرے کے پرامن اور باوقار شہری کی زندگی گزارتے ہیں اور اکثر سیاست کی باگ دوڑ انہیں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور یہی ملک کے راہنما ہوتے ہیں۔

کتابیات

Bruce, George : The Stranglers, Longmans, London 1968.
Corbet Jim : My India. Madras 1962.
Lutfullah : Autobiography of Lutfullah.
Ed. by F.B. Eastwick, London, 1858.
Parks, Fanny : Wanderings of a Pilgrim in search of the Picturesque. Vol. 1-2.Oxford, Karachi 1975.
Sen, Mala : India's Bandit Queen. Indus, Delhi 1991.
Sleeman, W.H. : Rambles and Recollections of an Indian Official. Oxford, Karachi 1973.
Sita Ram : From Sepoy to Subedar.
London 1873. Reprint 1988.
Tylor, Meadows : Confessions of a Thug.
London 1839, Reprint New Delhi 1985.

احمد الدین مارہروی: اعتراف جرم' امیر علی ٹھگ' مکتبہ شاہکار' لاہور (؟)
جان ما لکم: تاریخ وسط ہند' جلد اول و دوم' ترجمہ: ابن حسن' قاضی تلمذ حسن' حیدر آباد دکن ۲۷-۱۹۲۵ء
جم کوربیٹ: جم کوربیٹ کا ہندوستان' ترجمہ: سمیع محمد خان' کراچی ۱۹۸۳ء